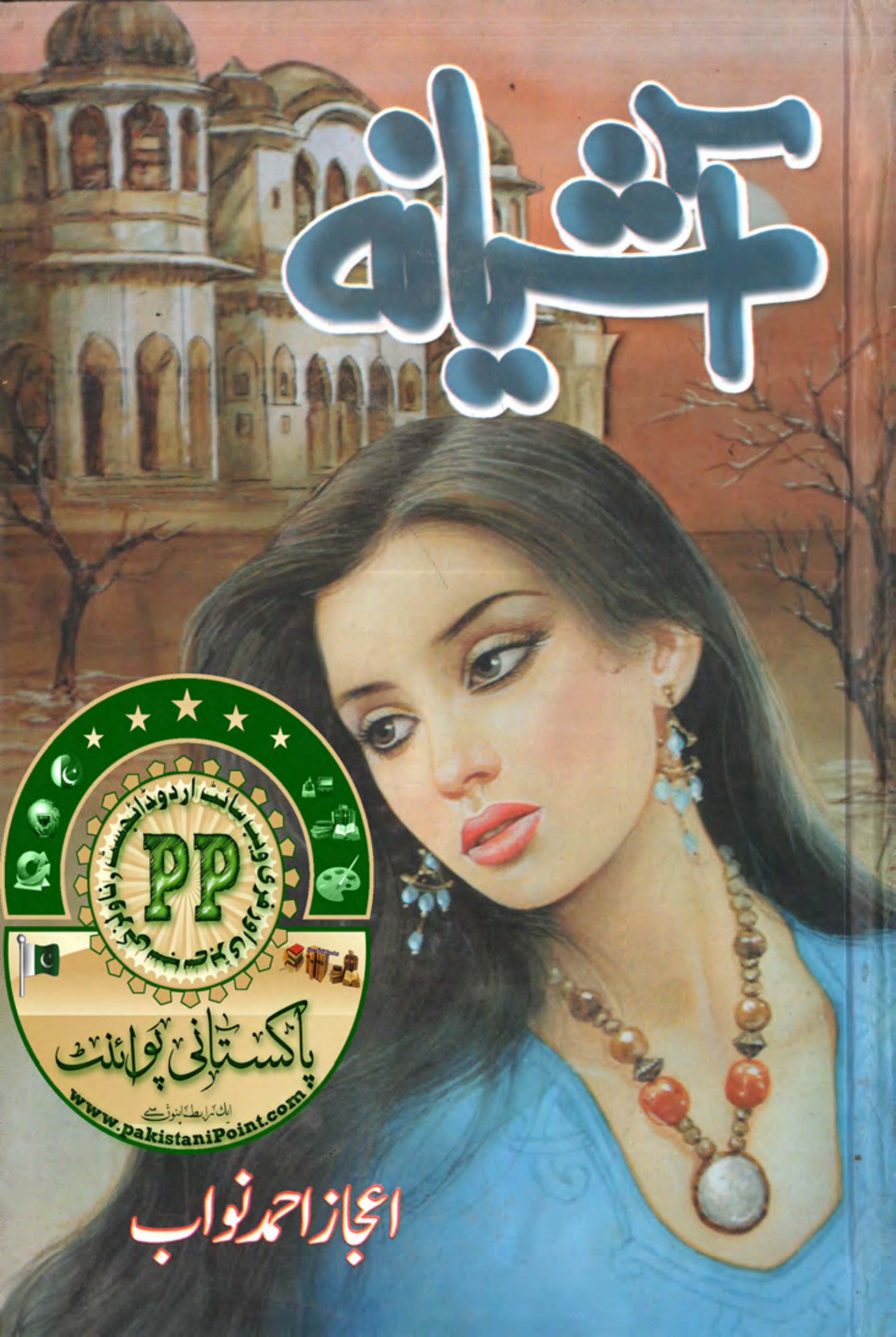

پاکستانی پوائنٹ
www.pakistaniPoint.com

آشیانہ

از

اعجاز احمد نواب

نواب سنز پبلی کیشنز

اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی

با وقار اور نفاست پسند قارئین کے لئے پر وقار اور نفیس ترین کتابیں

—— ضابطہ ——

حقوقِ اشاعت محفوظ ہیں

ناشر	اعجاز احمد نواب	حروف آرائی	میٹرکس کمپوزرز
طابع	نواب سنز پبلی کیشنز	سرورق	ڈیزائن ماسٹر
مطبع	زیرو پوائنٹ	اشاعت	۲۰۱۲ء

Retail Price
Rs.

—— رابطہ ——

نواب سنز پبلی کیشنز

اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی Ph: 051-5555275

ڈسٹری بیوٹرز اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک اقبال روڈ راولپنڈی فون 051-5772306

حسینہ نہایت خوب صورت تھی۔ اسمِ بامسمیٰ کہیے! سیمیں بدن، لمبے اور چمک دار بال۔ سرخ و سپید رنگت۔ گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹ۔ گال پر مسور کے دانے جتنا تِل۔ نزاکت اور لطافت کا حسین پیکر، چہرے پر ملاحت اور حُسن کی کمالیت تھی۔ جدھر سے گزرتی لوگوں کی نگاہیں دور تک اُس کے تعاقب میں رہتیں۔ لڑکی کیا تھی، سنگِ مرمر سے تراشا ہوا مجسمہ تھا۔

وہ نواب سراج الدین کی لاڈلی بیٹی تھی۔ صبح سویرے جب ڈرائیور اسے اور اس کی بیسٹ فرینڈ مونا کو کالج کے مین گیٹ پر اتارتا تو گیٹ سے باہر موجود لڑکوں کے دل اتھل پتھل ہونے لگتے۔ وہ اپنے اردگرد سے بے نیاز سہیلی کے ساتھ پلکیں تیز تیز جھپکاتی ہوئی چلتی جاتی۔ دونوں گیٹ سے اندر داخل ہوتیں تو عقب میں لڑکوں کی آہیں اور آوازے سنائی دیتے۔ جبکہ اندر موجود لڑکیاں اسے رشک و حسد سے دیکھنے لگتیں۔

نواب سراج الدین ایک بڑی جاگیر اور کئی مارکیٹوں کے مالک ایک خوش حال اور قابلِ احترام شخصیت تھے۔ بستی بوہڑاں والی میں ان کی قدیم حویلی کے صدر دروازے پر جلی حروف میں ''آشیانہ'' لکھا تھا۔ حویلی آشیانہ...... آج سے لگ بھگ سو برس قبل تعمیر ہوئی تھی مگر عمدہ دیکھ بھال کے سبب اب بھی نئی نظر آتی تھی۔ اسے ان کے پردادا نے تعمیر کروایا تھا۔

ان کی بیوی جہاں آرا بیگم بھی اچھے رئیس خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ نماز روزے کی پابند تو خیر وہ تھیں لیکن ٹی وی بھی بہت شوق سے دیکھتیں۔ Star Plus کے سارے پروگرام انہیں پسند تھے بلکہ وہ تو سٹار پلس انسائیکلو پیڈیا تھیں۔

حسینہ اور شہریار دونوں بہن بھائی نواب سراج الدین اور جہاں آرا بیگم کی کل کائنات تھے۔ آشیانہ کی پانچویں شخصیت حسینہ کی دادی تھیں۔ عمر لگ بھگ پچاسی برس۔ اس حویلی کی آئینی

Pakistanipoint Waqar Ezeen

سربراہ...... ہر وقت مُصلّے پر بیٹھی رہتیں۔ اور کچھ پڑھ پڑھ کر پوتے پوتی پر پھونکتی رہتیں تا کہ وہ نظرِ بد سے بچے رہیں۔

بستی بوہڑاں والی کی دوسری پہچان تھی یہ حویلی تھی تو پہلی پہچان سائیں جیون کا مزار تھا جو ''آشیانہ'' سے ذرا ہٹ کر تھا مگر اس کی چھت سے صاف دکھائی دیتا تھا۔ سائیں جیون کا مزار بہت بڑا تھا۔ ان کے مزار کے گرد مزید تیرہ قبریں تھیں۔ یہ سائیں جیون کے ساتھی تھے۔ ہر قبر سات آٹھ فٹ لمبی تھی۔ پرانے لوگ بتاتے تھے کہ سائیں جیون اور ان کے ساتھی جنگِ آزادی کے دوران انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ مزار کے گرد بوہڑ کے بے شمار درخت تھے لیکن مرکزی راستے پر ایک بہت پرانا چھتنار درخت تھا جس کے تنے کے گرد مٹی کا چبوترہ تھا۔ یہاں اکثر ملنگ ڈیرہ جمائے رہتے۔

سائیں جیون کا مزار بڑی برکت والی جگہ تھی۔ قریبی شہر سے ہی نہیں بلکہ دور دور سے لوگ منتیں مرادیں مانگنے اور زیارت کے لیے آتے تھے۔ دینے والی ذات تو صرف مالکِ کائنات کی ہے لیکن وسیلہ پر بھی لوگ اعتقاد رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا کے پیاروں کا واسطہ دے کر مانگا جائے تو وہ ان کے صدقے عطا کرتا ہے۔ یہاں آنے والے بہت سوں کو فائدہ بھی ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے سائیں جیون کے مزار کو بڑی شہرت حاصل تھی۔

پروفیسر ناہید کا گھر حویلی سے ذرا فاصلے پر تھا۔ دونوں کے درمیان بڑا سا خالی پلاٹ تھا جو نواب سراج الدین کی ملکیت تھا۔ پروفیسر ناہید شہر کے ایک کالج کی پرنسپل تھیں۔ ان کی بیٹی مونا حسینہ کی سہیلی تھی۔ دونوں ہم عمر اور ہم جماعت تھیں۔ پروفیسر ناہید نے دونوں کو اپنے کالج کی بجائے دوسرے کالج میں داخل کروایا تھا تا کہ اچھے نمبروں سے پاس ہونے کی صورت میں لوگ جانبداری کا الزام نہ لگا دیں۔ پروفیسر ناہید کے شوہر بیرونِ ملک ملازمت کرتے تھے۔ ان کا بیٹا عمران اور حسینہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ پروفیسر ناہید اور جہاں آرا بیگم بھی اپنے وقتوں میں کلاس فیلو تھیں اس ناتے دونوں گھرانوں میں قریبی تعلق داری تھی۔

حسینہ اور عمران کی انڈرسٹینڈنگ کا دونوں گھرانوں کو بخوبی علم تھا لیکن نہ تو باز پرس کی جاتی اور نہ حوصلہ افزائی۔ کچھ یوں لگتا تھا کہ دونوں گھرانے اس رشتے پر رضامند ہیں۔

لیکن کبھی کھل کر بات نہیں ہوئی تھی۔ ٹھیک اسی طرح شہر یار اور مونا بھی باہم خوش گپیوں میں مشغول رہتے۔

حسینہ خوبصورت تو تھی ہی لیکن اس کے سراپے میں سب سے خوبصورت تھے اس کے بال تھے۔ کوئی سوا گز لمبے اور اتنے گھنے کہ لگتا تھا کالی گھٹائیں اُمڈے چلی آتی ہیں۔ جو بھی ان بالوں کو دیکھتا عش عش کر اُٹھتا اور اُس کی آنکھوں میں تعریف اُبھر آتی مگر عجیب بات یہ تھی کہ خود حسینہ کو اپنے بال پسند نہیں تھے۔ وہ اکثر جھلا کر مونا سے کہتی۔

''یار کمال ہے، سب لوگ میرے بالوں کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ میں ان بالوں کی شانوں تک خوبصورت کٹنگ کرانا چاہتی ہوں لیکن ہر کوئی اس کی مخالفت کرتا ہے۔ خاص طور سے دادی اماں۔ خود کی تو ان کی چوہے کی دُم جیسی چٹیا رہ گئی ہے جس میں آدھ پاؤ تیل روزانہ ڈال کر تر بتر کر لیتی ہیں۔ اور میرے سر پر یہ جنگل آباد رکھنے پر مصر ہیں۔''

مونا کہتی ہے۔ ''تُو بالکل نادان ہے۔ انسان کی یہی تو خامی ہے۔ اگر اللہ اسے کچھ دیتا ہے تو وہ کفرانِ نعمت کرنے لگتا ہے اور جو نہیں دیتا اس کے بارے میں حسرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کالج کی ساری لڑکیاں رشک بھری نظروں سے تجھے دیکھتی ہیں۔ لوگ تیرا نام نہیں جانتے ہاں کوئی ان سے کہہ دے کہ ''وہ'' ساون بھادوں کی کالی گھٹاؤں جیسے بالوں والی لڑکی تو فوراً پہچان جاتے ہیں۔''

☆......☆......☆

حسینہ خاصی فیشن ایبل لڑکی تھی۔ ویسے تو وہ اپنی دادی سے بہت پیار کرتی تھی مگر ان کی روک ٹوک سے وہ جھنجھلا اُٹھتی تھی۔ اس کے جدید تراش خراش کے لباس پر وہ ہر وقت تنقید کرتی رہتیں۔

حسینہ ابھی ابھی کالج سے آئی تھی۔ سامنے ہی برآمدے میں دادی اماں نظر آ گئیں۔ ''سلام دادی اماں......''

وعلیکم السلام......! اری میں نے تمہیں ہزار دفعہ منع کیا ہے کہ یہ گھونسلہ کھلا مت رکھا کر، ایسی نظر لگے گی کہ گنجی گنجور ہو جائے گی۔'' انہوں نے اس کے کھلے بالوں پر اعتراض کیا۔

''ہائے دادی اماں۔ دل میں حسرت نہ جگایا کریں۔ ہائے گنجوں کے سر کو جو تازہ

ہوا لگتی ہوگی وہ ان کے اندر ٹھنڈک اُتار دیتی ہوگی۔ کاش اس جنگل کو کسی کی نظر لگ ہی جائے۔ دادی اماں! آپ کی نظر زیادہ کمزور ہے کیا؟"

"کیوں...... اللہ نہ کرے۔"

"پھر مجھے آپ کی نظر کیوں نہیں لگتی؟"

"پڑھ پڑھ کر پھونکتی ہوں دن میں دس بار۔ چوٹی بنا کر رکھا کر بالوں کی۔ تیل ڈالا کران میں۔" دادی اماں نے آنکھیں نکالیں۔

"توبہ توبہ دادی اماں! آپ کی نصیحتوں سے میرے کان پک گئے ہیں۔ آپ یقین کریں میرے کالج میں مجھے ان بالوں کی وجہ سے جھاڑ جھنکار کہا جاتا ہے۔ اس لیے میں انہیں کٹوانا چاہتی ہوں، شانوں تک۔"

"اری پاگل لمبے بالوں کو تو ہر نگاہ پیار سے دیکھتی ہے۔ لڑکیوں کی تو چھوٹی چھوٹی دُمیں لٹکی ہوتی ہیں، جلتی ہوں گی تیرے لمبے اور گھنے بال دیکھ کر۔"

"چھوڑیں دادی اماں! چھوڑیں اتنی خوبصورت خوبصورت کٹنگ کراتی ہیں وہ کہ بس دیکھتے ہی رہ جاؤ۔ آج کل کسی کے دُم نہیں ہوتی۔"

"تُو بھی کرا لے کٹنگ، کٹوا دے ان بالوں کو۔" وہ بڑبڑائیں۔

"ہائے دادی اماں منہ چوم لوں آپ کا، ایک بار پھر سے کہیں......؟" حسینہ کی تو دلی خواہش تھی کہ اپنے بالوں کی کٹنگ کرا دے، ایک دو بار کوشش بھی کر چکی تھی ایک دفعہ گھر میں کام کرنے والی ملازمہ سے آٹھ دس جوئیں لے کر انہیں اپنے سر میں ڈال لیا اور پھر پاگلوں کی طرح کھجاتی پھری۔

"دیکھیں ناں دادی اماں! جوئیں پڑ گئی ہیں سر میں۔"

"ارے لا میں نکال دیتی ہوں تُو تو بال اتنے صاف رکھتی ہے۔ یہ جوئیں کہاں سے آ گئیں؟"

"اب کہاں تک صاف رکھوں گی دادی اماں! پلیز مجھے ان بالوں کی کٹنگ کرانے دیں۔"

"دیکھ میں تجھے ایک بات بتاؤں جب تک میں زندہ ہوں تُو یہ بال نہیں کٹوائے گی، کیا سمجھی؟"

بہر حال ہر کوشش ناکام رہی تھی البتہ بالوں کا اسے ایک فائدہ بھی تھا۔ اس نے غسل کا وقت مقرر کر رکھا تھا۔ روزانہ عصر کے وقت وہ نہانے کے بعد بالوں کے انبار کو سُکھانے کے لیے چھت پر چڑھ جاتی، بال تو کہیں بھی سوکھ سکتے تھے، مگر اس بہانے عمران سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ دونوں کی ایک عادت سی بنی ہوئی تھی، عمران بھی بڑی پابندی سے اس وقت چھت پر پہنچ جایا کرتا۔ باتیں تو محض اشاروں میں ہوتیں مگر اس سے دو دلوں کو بڑی راحت ملتی۔

☆......☆......☆

سائیں جیون کے عرس کے دن آ گئے، سائیں جیون کا عرس بڑے زور و شور سے ہوا کرتا تھا۔ دُور دُور سے زائرین آتے، قوالیاں ہوتیں، چادریں چڑھائی جاتیں، دھمال پڑتی۔ یہ تمام مناظر حویلی کی چھت سے بھی دیکھے جا سکتے تھے، لیکن درمیان میں بوہڑ کا چھتنار درخت حائل تھا جو بستی بوہڑاں والی کے آباد ہونے سے بھی پہلے کا تھا۔ بوڑھے بوہڑ نے اس مقام کی آباد کاری کا پہلا منظر بھی دیکھا ہوگا کیونکہ یہاں رہنے والے بزرگوں کی قدیم داستانیں اس بوہڑ کے درخت سے وابستہ تھیں۔ اس کے سامنے عشق و محبت کے ڈرامے بھی کھیلے گئے، آپس کے جھگڑے بھی ہوئے، یہاں جنوں اور پریوں کے سائے بھی دیکھے گئے غرضیکہ قسم قسم کی داستانیں اس بوہڑ کے درخت سے وابستہ تھیں۔

عرس کے دنوں میں یہاں آنے والے زائرین جگہ جگہ ڈیرے لگا لیتے تو بستی کے لوگ اپنی اپنی بساط اور حیثیت کے مطابق ان کی ہر طرح سے خدمت کیا کرتے۔

ایک خاتون نوراں مائی، سائیں جیون کے مزار کی مجاورہ تھیں، تعویذ گنڈے دیا کرتیں۔ اب ان کے اندر کیا تھا یہ اللہ ہی جانتا ہے بہر حال بوہڑ نگر کا ایک اپنا ہی ماحول تھا اور یہاں بکھری ہوئی نشانیاں اپنے اندر بے شمار داستانیں رکھتی تھیں۔ عرس کے دن جیسے جیسے قریب آ رہے تھے مزار کے اردگرد کام ہونے لگا تھا۔ پانی کی سبیلیں لگائی جا رہی تھیں، زیارت کے لیے آنے والوں کے آرام و آسائش کا بندوبست کیا جا رہا تھا چیزیں بیچنے والے اپنی اپنی دکانیں سجا رہے تھے۔ قوالوں کی آمد کا سلسلہ بھی تھا اور مزار پر برپا ہونے والی قوالی کی محفلوں کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ بالآخر عرس کے دن آ گئے اور زائرین کے ٹھٹ کے

ٹھٹ لگ گئے۔ پسند کی جگہوں پر ڈیرے جمائے جانے لگے۔ پہلے آؤ پہلے پاؤ کے اصول پر عمل ہونے لگا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ہر سال باقاعدگی سے آیا کرتے تھے اور بستی والوں سے ان کے گہرے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ وہ اپنی اپنی بساط کے مطابق بستی والوں کے لیے تحفے تحائف بھی لاتے۔ عرس کا پہلا دن ہنگاموں سے بھرپور ہوتا۔ مزار کو غسل دیا جاتا اور گلاب اور کیوڑے کی خوشبوئیں ہر سُو پھیل جاتیں۔ روشنیوں کا جیسے طوفان آ گیا تھا۔ زائرین نے اپنے اپنے ڈیروں پر بھی روشنیاں کر لی تھیں۔ مزار کی پہلی رات کی تقریبات معمول کے مطابق ساری رات جاری رہیں بے شک باہر سے آنے والے اپنے اپنے طور پر یہاں بہت کچھ کیا کرتے تھے لیکن بستی کے باسی بھی اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرنے میں پیچھے نہ رہتے۔ ویسے تو یہاں کے رہنے والے جب دل چاہتا مزار پر جا کر دعائیں مانگ لیا کرتے تھے لیکن عرس کے دنوں میں ہر شخص اپنی ذمہ داری سمجھتا کہ وہ تینوں دن جا کر مزار پر حاضری دے، پھول چڑھائے اور دعا مانگے۔ اس سلسلے میں کوئی پابندی نہیں تھی۔ آج تک سائیں جیون کے مزار پر کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو مجرمانہ حیثیت رکھتی ہو۔ لڑکے لڑکیاں آزادی سے گھومتے پھرتے تھے۔ یہ بھی سائیں جیون کی کرامت تھی کہ انہوں نے اپنے مزار کو کبھی داغ دار نہیں ہونے دیا تھا۔ حسینہ کا بھائی شہریار دوستوں کے ساتھ گھومنے نکل گیا تھا اور حسینہ اور مونا تیار ہو کر مزار کی زیارت کے لیے چل پڑی تھیں۔ جو خواتین زیارت کے لیے مزار تک نہ پہنچ پاتیں وہ مزار کے احاطے کے باہر بیٹھ کر فاتحہ درود کر لیا کرتیں۔ حالانکہ ان کے لیے الگ جگہ بنی ہوئی تھی لیکن پھر بھی باہر سے آنے والے مہمانوں کا خیال رکھا جاتا تھا اور انہیں مزار کے قریب جانے کا موقع دیا جاتا تھا۔ مونا اور حسینہ بھی ایسی ہی جگہ جا کر بیٹھ گئیں اور فاتحہ پڑھنے لگیں۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ انہوں نے اپنے قریب کسی کو کھڑے پایا۔ نظریں اُٹھا کر دیکھا تو بُری طرح ڈر گئیں۔ یہ ایک کالی بھجنگ عورت تھی جس کی آنکھیں اس کے کالے چہرے پر سفید شیشوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس کے سفید دانت یوں لگ رہے تھے جیسے کوئی بھیڑیا غرا رہا ہو۔ مونا کے حلق سے تو ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی۔ آس پاس دوسرے لوگ موجود تھے لیکن کوئی اس طرف متوجہ نہیں تھا۔ عورت نے اپنی جھولی میں ہاتھ ڈال کر گلاب کے کچھ پھول نکالے اور ان

دونوں کی طرف بڑھا دیئے اور بولی۔

''لو...... یہ لے لو۔'' کچھ دیر تک تو ان دونوں کی ہمت نہ پڑی۔ لیکن پھر انہوں نے لرزتے ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ عورت نے پھول ان کے ہاتھوں میں رکھ دیئے۔ لیکن اگلے ہی لمحے مونا کے حلق سے ایک خوف بھری آواز نکل گئی۔ اس نے جلدی سے سارے پھول نیچے پھینک دئیے۔ گلاب کے پھولوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ دونوں کے ہاتھ خون سے بھر گئے تھے انہوں نے دزدیدہ نگاہوں سے عورت کو دیکھا لیکن ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہاں کسی عورت کا وجود نہیں تھا۔ مونا نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

''چلو حسینہ چلیں یہاں سے۔'' دونوں نے آگے قدم بڑھائے لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی ان کے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ وہ پاؤں اٹھا ہی نہیں پا رہی تھیں۔ پھر اچانک یوں محسوس ہوا جیسے آس پاس کی بجلی چلی گئی ہو۔ گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ تبھی اس گھور اندھیرے میں دو آنکھیں نظر آئیں۔ مرغی کے بڑے انڈے کے برابر یہ آنکھیں بے حد چمکدار تھیں اور انہیں عجیب انداز میں گھور رہی تھیں۔ آنکھوں کی پتلیاں ہل رہی تھیں۔ آنکھوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں کے سر چکرانے لگے۔ وہ ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے تھیں انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے آس پاس کا سارا شور ختم ہو گیا ہو اور وہ کسی ویرانے میں کھڑی ہوں۔ مونا نے حسینہ سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے منہ سے آواز نہیں نکلی۔ ادھر حسینہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہ دونوں آنکھیں ان سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ قرب و جوار میں اُجالا پھیلتا چلا گیا اور چند ہی لمحوں میں ہر چیز نظر آنے لگی۔ یہ ایک ویران ناہموار میدان تھا۔ دور دور تک بھورے رنگ کے پہاڑی ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ جگہ بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ حسینہ کو اپنے پیروں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی نگاہیں اس طرف اُٹھ گئیں جدھر اس نے وہ دونوں آنکھیں دیکھی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ وہاں ایک شخص بیٹھا ہوا ہے۔ سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں، لیکن پیٹ بہت بڑا...... چہرہ جیسے گردن پر رکھا ہوا۔ عجیب سا مکروہ لیکن آنکھیں بے حد خوفناک۔ اس شخص نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ اُوپر اٹھائے تو قرب و جوار سے چھوٹے چھوٹے قد کی عورتیں نکل آئیں۔ ان کے جسموں کو دیکھ کر اندازہ

ہوتا تھا کہ وہ عورتیں ہیں لیکن ان کے سر انڈے کے چھلکے کی طرح صاف شفاف تھے ان کی تعداد آٹھ یا نو تھی۔ وہ عجیب سے انداز میں اس شخص کے اردگرد چکر لگانے لگیں اور ہونٹوں سے کچھ بڑبڑانے لگیں پھر اس شخص نے چیخ کر کچھ کہا اور وہ سب رُک گئیں وہ حسینہ کی طرف متوجہ ہوا اور بولا:

''دیکھ ان سب کے سروں پر بال نہیں ہیں تُو انہیں اپنے تھوڑے بال دے دے۔ تیرے بال بہت خوبصورت ہیں ان کا چہرہ بھی خوبصورت ہو جائے گا۔''

وہ عورتیں اُچھلنے کودنے لگیں اور خوشی سے چلانے لگیں۔ دفعتاً حسینہ کے حلق سے ایک ہولناک چیخ نکلی۔ ''نہیں...... ہرگز نہیں۔''

اس کے ساتھ ہی ماحول بدل گیا وہ ادھر ہی کھڑی تھیں، جہاں سے یہاں تک کا سفر خواب کے سے عالم میں ہوا تھا۔ حسینہ کی متحیر اور خوفزدہ نگاہیں چاروں طرف گھومنے لگیں اس نے مونا کو دیکھا تو مونا بولی۔

''کیا بات ہے حسینہ تم ٹھیک تو ہو؟''

''مونا کیا تھا یہ سب کچھ......؟''

''کہاں؟''

''مونا یہ سب کچھ جس سے ہم گزرے ہیں۔'' جواب میں مونا ہنس پڑی پھر بولی۔

''کھڑے کھڑے خواب دیکھ رہی تھیں کیا؟''

''وہ عورت مونا! وہ عورت......''

''ارے بابا کون سی عورت......؟''

''اوہ میرے خدا کیا تھا یہ سب کچھ مونا! خدا کے لیے مجھے گھر واپس لے چلو، میرے ہاتھ لرز رہے ہیں۔''

''ہاں میں دیکھ رہی ہوں تمہاری حالت عجیب سی ہو رہی ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔'' اور مونا اسے سنبھال کر گھر لے چلی۔ حسینہ کو شدید حیرت تھی کیونکہ ساری صورت حال میں مونا برابر کی شریک تھی، راستے میں اس نے پھر پوچھا:

''مونا تم نے اس عورت کو نہیں دیکھا؟''

’’پتہ نہیں تم کس عورت کی بات کر رہی ہو؟‘‘

’’وہی کالی بدصورت عورت جس کی آنکھیں اتنی بڑی تھیں اور دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے جس نے پھول دیئے تھے۔‘‘

’’بابا! تم کون سی کہانی سنا رہی ہو مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔‘‘ مونا نے کہا۔ حسینہ خاموش ہو گئی وہ دونوں گھر آ گئیں۔ گھر کے باقی لوگ بھی زیارت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ حسینہ اپنے کمرے میں آ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ اس نے مونا سے کہا۔

’’مونا......! مجھے پانی پلاؤ۔‘‘

’’ابھی لاتی ہوں۔‘‘ مونا بھاگ کر پانی لے آئی۔ اس نے سہارا دے کر حسینہ کو پانی پلایا اور چونک کر بولی۔

’’حسینہ!......تمہاری حالت تو کافی خراب ہو رہی ہے۔‘‘

’’میرا سارا بدن کپکپا رہا ہے......اور......اور......‘‘

’’ہاں اور کیا؟‘‘

حسینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مونا نے پوچھا۔

’’تم کسی عورت کے بارے میں کہہ رہی تھیں۔‘‘

’’تم نے اس کالی عورت کو دیکھا تھا جو ہمارے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی؟‘‘

’’نہیں تو......‘‘

’’اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہوا میرے ہی ساتھ ہی ہوا۔‘‘

’’آخر ہوا کیا......؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔‘‘

’’مونا......!‘‘ حسینہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ وہ بری طرح چیخ پڑی اور مونا ڈر گئی۔

’’حسینہ......! تمہیں کیا ہو رہا ہے......؟ مجھے تو ڈر لگنے لگا ہے۔‘‘

اس سے پہلے کہ حسینہ کوئی جواب دیتی کال بیل بول اُٹھی۔ دونوں کی توجہ بٹ گئی۔ گھر کے افراد واپس آ گئے تھے۔ سب سائیں جیون کے عرس کی رونقوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے مگر حسینہ کی حالت دیکھ کر سبھی فکرمند ہو گئے۔ حسینہ کے بدن کی کپکپی کم نہیں ہو

رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے تیز بخار آ گیا۔ بخار کی کوئی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بخار تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے بعد اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ ہذیان میں جانے کیا کیا بولتی رہی۔ سب گھر والے پریشان ہو گئے۔ جہاں آرا بیگم تو زیادہ پریشان تھیں۔ نواب سراج الدین کسی دوسرے شہر گئے ہوئے تھے، ان کو فون کیا گیا۔ پروفیسر ناہید، عمران اور مونا سب حیران پریشان تھے۔ کئی ڈاکٹروں کو دکھایا گیا۔ اس دوران سائیں جیون کے مزار پر دعا ہو چکی تھی اور خصوصی طور پر نوراں ملنگنی نے حسینہ کا نام لے کر دعا کرائی تھی۔ ڈاکٹر پریشان تھے کہ یہ کیسا بخار ہے! ہر طرح کی کوششیں کر لی گئی تھیں لیکن یوں لگتا تھا جیسے اس کے وجود میں کوئی تندور دہک رہا ہو۔ ساتویں دن بخار از خود اُتر گیا اور حسینہ نے آنکھیں کھول دیں۔ گھر کے تمام لوگوں کو اپنے گرد جمع دیکھ کر وہ حیران رہ گئی اور بولی۔

''ارے یہ آپ لوگ میرے اردگرد کیوں جمع ہیں؟''

''کیسی طبیعت ہے حسینہ......؟''

''لیجئے میری طبیعت کو کیا ہو گیا میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔'' سب ایک دوسرے کی شکل کی طرف دیکھنے لگے۔ بھلا کسی کی سمجھ میں کوئی بات کیسے آتی۔ حسینہ بستر سے اُٹھ گئی سب لوگوں کا خیال تھا کہ سات دن کے اس جان لیوا بخار سے اس کا سارا بدن ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا ہوگا۔ لیکن وہ بالکل چاک و چوبند تھی۔ اس کے بدن میں کمزوری کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ جہاں آرا بیگم بیٹی کی اس پراسرار بیماری سے بہت پریشان ہوگئی تھیں۔

☆......☆......☆

اسے گزری ہوئی کوئی بات یاد نہیں تھی لیکن اس دن مونا نے اس کے ذہن کو کریدا۔ اس نے کہا:

''تم اچانک کیسے بیمار پڑ گئی تھیں؟''

''انسان بیمار ہونے سے پہلے کیا کوئی منصوبہ بندی کرتا ہے؟'' حسینہ ہنستے ہوئے بولی۔

''نہیں پھر بھی، تم نے عجیب عجیب باتیں شروع کر دی تھیں۔''

''کیسی باتیں؟''

''کوئی کالی عورت جس کا تم بار بار تذکرہ کر رہی تھیں اور اس کے بعد بھی کچھ کہنے

والی تھیں۔"

"یار مجھے کچھ یاد نہیں سچ بتا رہی ہوں پتہ نہیں تم کس کالی عورت کی بات کر رہی ہو؟"

"چلو چھوڑو ان باتوں کو۔"

اور بات آئی گئی ہو گئی۔ دونوں نے کالج جانا شروع کر دیا۔ مونا اس کی اتنی گہری دوست تھی کہ بیماری کے دوران ہر وقت اس کے ساتھ رہی۔ اس نے بھی کالج جانا چھوڑ دیا تھا۔ حسینہ صحت یاب ہوئی تو مونا بھی اس کے ساتھ کالج جانے لگی۔ اس دوران اس کی عمران سے کوئی تفصیلی ملاقات نہیں ہوئی تھی اگرچہ عمران اس کا باقاعدہ منگیتر نہیں تھا اور نہ ہی ان کے درمیان کوئی خاص عہد و پیمان ہوئے تھے، لیکن دونوں نے دلوں میں اس بات کو یقینی طور پر پکا کر لیا تھا کہ وہ زندگی کے ساتھی بنیں گے۔ یہ بات شاید پروفیسر ناہید کے ذہن میں بھی تھی کیونکہ ان دونوں کو کڑی نگاہوں سے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا اور ان کے معمولات میں کبھی کوئی مداخلت نہیں کی گئی تھی۔ حسینہ جن دنوں بیمار تھی مونا، عمران یہاں تک کہ پروفیسر ناہید نے بھی اپنے گھر جانا چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے اس دوران کالج سے چھٹی لے لی تھی۔ محبت کی یہ اعلیٰ ترین مثال تھی۔ جوان دونوں گھرانوں کے درمیان تھی۔ حسینہ اور عمران کی ملاقات میں کوئی دقت نہیں تھی لیکن چھت پر اشاروں کنایوں میں ہونے والی گفتگو اپنے اندر الگ ہی لذت رکھتی تھی۔ اس کا سرور ہی کچھ اور تھا۔ بیماری کے دنوں میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ آج صحت یابی کے بعد حسینہ مونا کے ہمراہ کالج گئی تھی لہٰذا عمران کو یقین تھا کہ شام ڈھلے وہ چھت پر ضرور آئے گی۔

حسینہ کالج سے لوٹنے کے بعد کھانا کھا کر سو گئی۔ عصر کے وقت اُٹھ کر حسبِ سابق غسل کیا اور بال سکھانے کے پرانے بہانے چھت پر آ گئی لیکن موبائل ساتھ لانا نہیں بھولی تھی۔ حسینہ کو دیکھتے ہی عمران کھل اُٹھا۔ جانے کب سے وہ اپنی چھت پر محوِ انتظار تھا۔ حسینہ بوہڑ کی لٹکتی شاخوں کے پاس آ کر عین اس جگہ کھڑی ہو گئی، جہاں سے عمران اور اس کا گھر صاف نظر آتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ حسینہ اپنی لانبی زُلفوں کو جھٹکے دینے لگی۔ عمران نے اشارے سے طبیعت پوچھی۔ حسینہ نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی۔

عمران اپنے موبائل کو دائیں کان سے لگائے ہوئے تھا۔ حسینہ نے موبائل بائیں

کان سے لگاتے ہی جھک کر دایاں ہاتھ ماتھے کی طرف لے جاتے ہوئے عمران کی طرف دیکھا اور کہا: ''کنیز آداب بجالاتی ہے......شہزادہ حضور......''

''کنیز کی بچی......! اتنی دیر کر دی...... کب سے کھڑا سوکھ رہا ہوں......'' عمران جھلاتے ہوئے بولا۔

''سوری......'' حسینہ ملائمت سے بولی۔

''ہمیشہ تمہارے پاس یہی ایک لفظ ہوتا ہے کم از کم لفظ ہی بدل لو۔'' عمران دھیما پڑتے ہوئے بولا۔

''سوری......'' حسینہ اسی انداز میں دوبارہ بولی تو دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''کب تک ہم چھپ چھپ کر فون پر باتوں سے دل بہلاتے رہیں گے حسینہ......؟'' عمران یاسیت سے بولا۔

''جب تک میں ایل ایل بی نہیں کر لیتی۔''

''لیکن ابھی تو تم سیکنڈ ایئر میں ہو......''

''ہوں...... چند سال تو لگیں گے۔''

''چاہے اتنے سالوں میں کوئی جاں سے گزر جائے۔''

''میں کیا کر سکتی ہوں...... مجبوری ہے۔''

''بھاڑ میں گئی تمہاری مجبوری...... میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔''

''نہیں کر سکتے تو کسی سے شادی کر لو......''

''کیا......؟ یہ...... یہ تم کہہ رہی ہو؟''

''ہاں بابا......تم انتظار جو نہیں کر سکتے۔''

''کس سے کروں شادی......؟''

''مجھ سے اور کس سے......''

''مگر کیسے......؟''

''بھئی! اپنی ماما کو ہمارے گھر بھیج کر۔''

''کیا......؟ کیا......؟ حسینہ میں یہ کیا سن رہا ہوں۔'' عمران پُر جوش ہو گیا۔

''وہی جو میں کہہ رہی ہوں۔''

''میرا جی چاہتا ہے...... میرا جی چاہتا ہے......'' عمران جملہ مکمل نہ کر سکا۔
اس جملے کے ساتھ ہی حسینہ کی چیخ نکل گئی اور موبائل اس کے ہاتھ سے گر گیا۔
عمران چونک پڑا۔ اسے سامنے ہی حسینہ کا خوف سے بگڑا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ نہ جانے اسے کیا نظر آیا تھا کہ پلک جھپکتے میں اس کی حالت غیر ہوگئی۔ اس کے ہونٹ عجیب انداز میں کھل گئے۔ آنکھیں کسی نقطے پر مرکوز ہوگئیں اور...... اور...... پھر وہ دھڑام سے گر گئی۔

''حسینہ......'' عمران چیخا اور پھر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ وہ جلد از جلد حسینہ کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی عمران کو یوں محسوس ہوا جیسے عقب سے کسی نے اسے دھکا دے دیا ہو اور وہ سیڑھیوں پر لڑھکنے لگا۔

☆......☆......☆

حسینہ کو اچانک ہی عمران کی آنکھیں انتہائی بڑی بڑی اور باہر کو اُبلتی محسوس ہونے لگیں۔ اُس کا چہرہ کسی مکروہ بوڑھے جیسا نظر آنے لگا۔ یہی منظر دیکھ کر حسینہ حواس باختہ ہو کر چلائی اور گر پڑی تھی لیکن جیسے ہی عمران سیڑھیوں کی طرف لپکا...... حسینہ ٹھیک ہوگئی اور تیزی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے دیکھا تو عمران اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ عمران کی شکل کیوں خوفناک ہوگئی وہ بھی اتنی زیادہ کہ میری چیخ نکل گئی۔ عمران کیا سوچ رہا ہوگا؟ یقیناً اب وہ حویلی کی طرف آ رہا ہوگا۔ مجھے جلد از جلد نیچے پہنچنا چاہیے۔ اس سے قبل کہ عمران کسی کو ملے...... میں جا کر اسے منع کروں کہ کسی کو کچھ نہ بتائے...... ورنہ پہلے ہی سب پریشان ہیں مزید پریشان ہوں گے...... یہ سوچ کر وہ سوچوں کے گرداب سے نکلی اور کپڑے جھاڑتی ہوئی آگے بڑھی۔ شام کا ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ابھی وہ دو ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ اسے اپنے پیچھے ہنسی سنائی دی......!

ساتھ ہی اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دوپٹے کا پلو پکڑ کر کھینچا ہو...... اضطراری طور پر حسینہ نے پلٹ کر دیکھا...... تو اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اس کے دوپٹے کا پلو حسینہ نے ہی تھام رکھا تھا۔ دوسری طرف بھی وہ خود ہی کھڑی تھی۔ وہی چوڑی دار سفید پائجامہ...... کڑھائی والا کرتہ...... شانے پر پڑا لمبا دوپٹہ ویسے ہی سیاہ

گھنیرے چمک دار بال...... وہی بڑی بڑی آنکھیں...... ہونٹوں پر ویسی ہی آؤٹ لائن میں لگی لپ اسٹک...... حسینہ کو یوں لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہو یا پھر آئینہ۔ اسے پیروں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ اس سے قبل کہ وہ گر پڑتی حسینہ 2 نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ہاتھ تھامتے ہی حسینہ کا ڈر جیسے اُتر گیا...... وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ خوف اڑنچھو ہو گیا۔ وہ ہشاش بشاش ہو گئی۔

''یہ...... یہ سب کیا ہے......؟'' اب وہ خوف زدہ ہونے کی بجائے حیران تھی۔

''ملگجے اندھیرے میں...... ہلکی پھلکی شرارت'' حسینہ 2 شوخی سے مسکرائی۔

''کون ہو تم......؟'' حسینہ نے متجسس انداز میں پوچھا۔

''حسینہ چار سو بیس۔'' لہجے میں ذرہ برابر تبدیلی لائے بغیر حسینہ 2 نے جواب دیا۔

''کیا چاہتی ہو......؟'' حسینہ نے پُراعتماد لہجے میں سوال کیا۔

''چاہتی ہوں میں اُس کو جو تمہیں چاہتا ہے...... مجبوراً مجھے اپنا آپ چھوڑ کر تمہارا بھیس بدلنا پڑا۔'' حسینہ 2 نے شوخی سے جواب دیا۔

''پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو......؟ سیدھی اور دوٹوک بات کرو۔'' حسینہ جھلا اُٹھی۔

''وقت قریب آ رہا ہے حسینہ چلنے کی تیاری کرو۔'' یہ کہتے ہی حسینہ 2 ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

حسینہ چند لمحے لڑکی کے غائب ہونے والی جگہ کو گھورتی رہی پھر جیسے اس کی آنکھ کھل گئی...... یا ہوش میں آ گئی ہو...... وہ پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی...... اندھیرا چھا چکا تھا۔ وہ چھت پر بوہڑ کے درخت کے سامنے اکیلی کھڑی تھی۔ گزرے ہوئے واقعات اسے خواب کی طرح لگ رہے تھے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا...... جیسے کچھ ہوا ہے...... جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ حسینہ نے عمران کے گھر کی طرف دیکھا عمران وہاں نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ وہ بغیر بتائے کیوں چلا گیا پہلے تو ہمیشہ دونوں ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا کرتے تھے۔

حسینہ کچھ حیران کچھ پریشان نیچے اُتر آئی۔ نیچے پہنچتے ہی اسے یاد نہیں رہا کہ چند لمحوں پہلے اس پر کیا بیتی تھی۔

عمران سیڑھیوں سے لڑھکا تو چند منٹ خراشیں اور چوٹیں سہلاتا رہا پھر اُٹھ کر بھاگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ حسینہ کے دروازے پر کال بیل بجا رہا تھا۔ ملازم نے دروازہ کھولا۔

برآمدے میں جہاں آرا بیگم کھڑی تھیں وہ عمران کو دیکھ کر خوش ہو گئیں اور کہنے لگیں:

''آؤ بیٹے آؤ......سب ٹھیک ہے ناں......؟''

''جی آنٹی، دادی اماں سے ملنے آ گیا تھا......!''

''آؤ......آؤ......تمہارا اپنا گھر ہے جب چاہو بغیر کسی وجہ کے بھی آ سکتے ہو، جہاں آرا بیگم معنی خیز لیکن محبت بھرے انداز میں بولیں تو عمران جھینپ کر دادی اماں کے کمرے کی جانب چل دیا۔ سبھی اس سے محبت کرتے تھے دادی اماں بھی اسے دیکھ کر خوش ہو گئیں اور بولیں:

''آؤ......آؤ عمران بیٹا! خیریت سے ہو ناں......؟''

''جی دادی اماں! بس دل میں خواہش پیدا ہوئی تو آپ کے پاس آ گیا۔''

''اللہ تعالیٰ تمہیں دنیا کی ہر خوشی نصیب کرے، خوب ترقی کرو، زندگی میں سب کچھ پاؤ، بیٹھو بیٹا! بتاؤ کیا کھاؤ پیو گے؟''

''نہیں دادی اماں کچھ نہیں کھانا پینا۔ حسینہ کہاں ہے؟''

''اپنے کمرے میں ہے......بلواؤں؟''

''نہیں، دادی اماں میں خود اس کے پاس چلا جاتا ہوں۔''

''ہاں جاؤ جاؤ، ابھی ابھی نیچے اتری ہے۔''

عمران حسینہ کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ حسینہ الماری سے کپڑے نکال کر استری اسٹینڈ کی جانب جا رہی تھی۔ عمران کو دیکھ کر اس نے کپڑے واپس رکھ دیئے اور بولی۔

''عمران! کیا ہو گیا تھا تمہیں......ناراض ہو گئے تھے کیا کسی بات پر؟''

''کیا مطلب......؟''

''اچانک واپس کیوں چلے گئے تھے......؟ خدا حافظ بھی نہیں کہا۔''

''تمہیں کیا ہو گیا تھا......؟''

''مجھے......؟''

''ہاں......ہاں تمہیں......!''

''لو مجھے کیا ہو گیا تھا، میں تو تمہیں دیکھ رہی تھی اور تم اچانک نیچے چلے گئے......''

''نہیں حسینہ تم......تم عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئی تھیں۔ گم صم۔ پھر تمہاری چیخ نکل گئی۔'' حسینہ اسے تعجب سے دیکھنے لگی پھر بولی۔

''مجھے کچھ نہیں ہوا تھا، چلو چھوڑو تم اسی لیے آئے ہو؟''

''تو اور کیا، میں دادی اماں کے کمرے میں جا رہا ہوں۔''

''ہاں، تم چلو میں بھی آتی ہوں۔'' حسینہ نے کہا اور عمران واپس دادی اماں کے کمرے میں آ گیا۔

''دادی اماں میں حسینہ کی وجہ سے فکر مند رہتا ہوں کتنی بیمار ہو گئی تھی۔ سبھی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے تھے۔''

''اللہ خیر کرے واقعی پہلے کبھی اس طرح بیمار نہیں ہوئی۔''

''بس ہونی ہو کر رہتی ہے۔'' دادی اماں نے کہا۔ اتنی دیر میں حسینہ چائے لے آئی۔ چائے پینے کے بعد عمران وہاں سے اٹھ گیا لیکن دونوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکی تھی کہ اصل چکر کیا تھا۔

☆......☆......☆

پروفیسر عرفات کالج میں نئے آئے تھے۔ اچھی شخصیت کے مالک اور اندازِ گفتگو بھی بہت اچھا۔ ان کے لیکچرز میں پوری کلاس کو لطف آنے لگا تھا۔ لیکن ایک دن حسینہ پر عجیب سی بیت گئی۔ پروفیسر عرفات لیکچر دے رہے تھے کہ اچانک ان کی آواز مدھم ہوتی چلی گئی۔ حسینہ لیکچر بڑے غور سے سن کر نوٹس لے رہی تھی۔ اس مدھم ہوتی آواز پر چونک پڑی۔ اس نے نگاہیں اُٹھا کر پروفیسر کو دیکھا تو اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ پروفیسر کی آنکھیں تبدیل ہو رہی تھیں اور یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ آنکھیں حسینہ پر جمی ہوئی ہوں۔ حسینہ اپنے حواس کھونے لگی۔ تب پروفیسر کے مدھم الفاظ اُبھرے۔

''تم وہاں کیوں نہیں آتیں، میں وہاں رہتا ہوں میرے پاس آؤ۔''

حسینہ نے کچھ بولنا چاہا مگر آواز نہیں نکلی۔ یہ حالت چند لمحوں تک رہی اور اس کے بعد وہ ایک دم سے ہوش میں آ گئی۔ پروفیسر بدستور لیکچر جاری رکھے ہوئے تھا اور پوری کلاس توجہ اور غور سے سن رہی تھی۔ حسینہ سوچنے لگی کہ یہ چند لمحے کہاں کھو گئے تھے کچھ سمجھ میں

نہیں آ رہا تھا۔ باقی لیکچر اس نے دلچسپی سے نہیں سنا۔ کلاس ختم ہوگئی تو وہ مونا کے ساتھ باہر نکل آئی۔ گھر واپس آتے ہوئے اس نے مونا سے کہا:

''مونا ایک بات بتاؤ۔''

''ہاں پوچھو......''

''پروفیسر عرفات جب لیکچر دے رہے تھے تو کیا کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے تھے؟''

''نہیں یار! پروفیسر تو بڑا باکمال آدمی ہے جب بولتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے پانی کا دھارا رواں دواں ہو۔ وہ مسلسل بول رہا تھا۔''

''اچھا!''

''ہاں بھئی۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو یہ بات کیا تم سوگئی تھیں......؟''

''ہاں ایسا ہی لگتا ہے۔'' حسینہ نے متفکر لہجے میں کہا۔

☆......☆......☆

اوپر تلے رونما ہونے والے ان پراسرار واقعات سے حسینہ سہم گئی تھی لیکن جب کافی دنوں تک کچھ نہ ہوا تو حالات رفتہ رفتہ معمول پر آتے چلے گئے۔ وقت بڑے بڑے حادثات کا مرہم ثابت ہوتا ہے۔ زندگی دوبارہ اپنی پرانی ڈگر پر رواں ہوگئی۔ وہی کالج جانا، ہلا گلا کرنا، واپسی پر دن کا کھانا کھا کر سو جانا اور پھر شام کو نہا دھو کر بلکہ بن سنور کر حویلی کی چھت سے اپنی چھت پر کھڑے عمران سے کبھی اشارے کنایوں میں اور کبھی موبائل پر گفتگو کرنا۔

اس دن بھی حسینہ معمول کے مطابق شام کی سرمئی روشنی میں سیاہ لباس زیب تن کئے چھت پر جانے لگی۔ صحن میں دادی اماں مصلّے پر بیٹھی ورد و وظائف میں مشغول تھیں۔ حسینہ کو ہیئر برش بالوں میں پھیرتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف جاتے دیکھ کر ہاتھ سے رکنے کا اشارہ دیا۔ حسینہ آہستگی سے دادی اماں کے نزدیک آ گئی۔ جیسے ہی حسینہ قریب آئی دادی اماں نے چند پھونکیں ماریں اور پاس بٹھا کر بولیں:

''بیٹا......! پہلے بھی تمہیں کئی بار سمجھایا ہے کہ اس وقت چھت پر نہ جایا کرو۔ ملگجے اندھیرے میں شیاطین اترتے ہیں۔ پہلے بھی تُو ڈر چکی ہے۔''

''دادی اماں......! مم میں اکیلی تو نن......'' اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ

خاموش ہوگئی۔

''تو اور کون ہوتا ہے تمہارے ساتھ؟'' دادی اماں چونک پڑیں لیکن حسینہ خاموش اپنے ہاتھ کا ناخن دانتوں سے کترنے لگی۔

''اوہ......سمجھ گئی۔'' دادی اماں نے استفہامیہ انداز میں سر ہلایا۔

''کک کیا سمجھ گئی ہیں دادی اماں......؟'' حسینہ گڑبڑا گئی۔

''بٹیا......'' دادی اماں معنی خیز انداز میں اس سے مخاطب ہوئیں۔''آدمی بوڑھا ہو کر تجربہ کار ہو جاتا ہے...... بے وقوف نہیں۔ اگر تمہیں سرزنش نہیں کی جاتی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمیں کچھ پتہ نہیں...... چلی جاؤ لیکن مغرب کی اذان سے پہلے اُتر آیا کرو۔''

حسینہ دادی اماں کی بات سن کر سُن ہوگئی۔ اس کے تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ دادی اماں سب کچھ جانتی ہیں۔ اس کے خیال کے مطابق تو عمران سے دوستی کا سوائے مونا کے اور کسی کو پتہ نہیں تھا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش کھڑی رہی لیکن دادی اماں کی آنکھیں بند اور ہونٹ ہل رہے تھے۔ لہٰذا حسینہ دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گئی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ اس مخصوص کارنر پر پہنچ گئی جہاں سے عمران کا گھر صاف نظر آتا تھا۔ اسی کارنر پر بوہڑ کا درخت بھی تھا اور جا بجا اس کی شاخیں اور جڑیں لٹک رہی تھیں۔ حسینہ کو بڑی مایوسی ہوئی جب عمران اسے کہیں نظر نہ آیا۔ حالانکہ وہ خود لیٹ تھی۔ اس نے موبائل نکالا اور نمبر ڈائل کیا۔ بیل جاتی رہی لیکن جواب ندارد۔ پھر کچھ سوچ کر حسینہ بالوں میں برش کرنے لگی۔ کچھ وقت تو گزارنا ہی تھا۔ چند لمحے نہ گزرے ہوں گے کہ حسینہ چونک پڑی۔ اسے یوں لگا جیسے اسے کسی نے پکارا ہو۔ اس نے عمران کے گھر کی طرف دیکھا۔ عمران موجود نہیں تھا لیکن آواز تو قریب سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ آواز کو اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ زُلفیں سنوارنے لگی۔

''حسینہ......'' آواز پھر آئی......صاف......واضح...... کسی مرد نے اُسے پکارا تھا۔

اس نے تیزی سے اِدھر اُدھر دیکھا، کسی کو نہ پا کر انجانے وسوسوں سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔

حسینہ ڈر گئی اس نے سوچا بھاگ کر نیچے چلی جائے کہ اچانک بوہڑ کا درخت بُری طرح لرزنے لگا۔ حسینہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے درخت کو تکنے لگی۔ تیز ہوا تو نہیں چل رہی تھی۔

پھر یہ پورے کا پورا درخت کیسے لرز اُٹھا۔

حسینہ کے دل میں خوف پیدا ہو گیا۔ اس نے جلدی سے اپنی جگہ چھوڑی اور جانے کو پلٹی لیکن اس کی چیخ نکل گئی۔ عقب سے کسی نے اس کی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر اسے پکڑ لیا تھا۔ پلٹ کر دیکھا تو ہکا بکا رہ گئی۔ اس نے خود کو ایک خوبرو نوجوان کی بانہوں میں پایا۔ ایک انتہائی خوب صورت نوجوان...... پتلا بانکا...... سجیلا...... شہزادوں کا سا لبادہ، کمر میں پٹکا، پٹکے میں تلوار، سنہرے جوتے...... سنہری پگڑی...... بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ چوڑا ماتھا...... مغل شہزادہ......

''کہاں چل دیں......؟'' شہزادے کے ہونٹ ہلے۔ حسینہ لرز کر رہ گئی۔ شام کے ملگجے میں اپنی ہی حویلی کی چھت پر بوہڑ کے درخت کی لٹکتی شاخوں کے پاس مغلیہ دور کا شہزادہ اس کو کمر سے پکڑے کھڑا تھا۔

''کون ہو تم......؟'' حسینہ تھوک نگل کر حواس مجتمع کر کے بولی۔

''تمہارا...... عاشق......'' بے باک لہجے میں ہونٹ ہلے۔

''کہاں سے آئے ہو؟''

''آنا کہاں سے ہے اسی حویلی میں بسیرا ہے ہمارا...... صدیوں سے تمہارے انتظار میں ہیں۔''

''چھوڑو مجھے۔'' حسینہ نے ہمت کر کے اپنی کمر سے اس کے ہاتھ جھٹکے......

''ایک بات یاد رکھو۔'' شہزادہ یکا یک سنجیدہ ہو گیا۔ ''تم صرف اور صرف میری ہو......'' شہزادے نے حسینہ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ آنکھیں چار ہوتے ہی حسینہ کو سُدھ بُدھ نہ رہی جیسے وہ ہپناٹائز ہو گئی ہو۔ پیروں نے اس کا وزن سہارنے سے انکار کر دیا۔ وہ ہولے ہولے جھومنے لگی...... اس سے قبل کہ گر جاتی...... شہزادے نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کی لچکیلی کمر میں ڈال دیا۔ حسینہ پر جیسے بے ہوشی طاری ہو چکی تھی۔ اس کا سر شہزادے کے شانے سے آ لگا۔

☆......☆......☆

''السلام علیکم......خالہ جان......'' پروفیسر ناہید کی کھنکتی ہوئی آواز اُبھری۔

''السلام علیکم۔'' مونا کی چہکتی آواز بھی سنائی دی۔

''وعلیکم......السلام......ناہید تم......ارے مونا بیٹی بھی آئی ہے۔'' دادی اماں مصلے سے اُتر کر سلیپر اڑستے ہوئے بولیں۔

''آؤ بھئی ناہید......!'' جہاں آرا بیگم کچن سے نکلتے ہوئے زور سے بولیں۔

''اچھے وقت پر آئی ہو دونوں ماں بیٹی......گرما گرم چائے اور سموسے تیار ہیں۔''

''سموسوں کے ساتھ مٹھائی ہماری طرف سے......'' مونا نے ملازمہ لڑکی کے سر سے مٹھائی کا ٹوکرا اُتارتے ہوئے کہا۔

''ہیں......!'' جہاں آرا بیگم اور دادی اماں دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

''یہ کس خوشی میں؟''

''بتاتی ہوں۔ ذرا سانس تو لینے دیں۔'' ناہید بید کی کرسی پر دھم سے گرتے ہوئے بولیں۔ ''تھک جاتی ہوں اب تو چند قدم چلنے سے بھی۔''

''اور ایک وقت تھا......سو گز دوڑ میں حصہ لیا کرتی تھی۔'' جہاں آرا نے چوٹ کی۔

''وقت وقت کی بات ہے سہیلی......! کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں......اب وہ جوانی کہاں؟''

''ہاں تمہاری ساری کی ساری جوانی تو مونا میں منتقل ہو گئی ہے۔'' جہاں آرا نے دوسرا وار کیا اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''یہ سب کیوں اتنے خوش ہیں بھئی......؟'' یہ بارعب آواز نواب سراج الدین کی تھی۔ نواب صاحب کو دیکھ کر سب احتراماً خاموش ہو گئے۔ نواب صاحب سیدھے اپنی

ماں تک پہنچے اوران کے گھٹنے چھو کر کھڑے ہو گئے۔

''بیٹھو ناں بیٹا!'' دادی اماں پوپلے منہ سے بولیں اور نواب صاحب سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''خود بوڑھا ہو گیا ہے مگر ابھی تک میری اجازت کے بغیر بیٹھتا تک نہیں۔''

''خالہ جان یہی تو روایات ہیں جو ابھی ہمارے معاشرے میں زندہ ہیں۔'' یہ ناہید تھیں۔

تھوڑی ہی دیر میں سب کے سب گرم گرم سموسوں اور چائے کا لُطف اُٹھانے لگے۔

''ناہید بہن یہ مٹھائی لائی ہیں۔'' جہاں آرا نے اپنے میاں نواب سراج الدین کو معنی خیز انداز میں بتایا تو لمحے بھر کو نواب صاحب کے چوڑے ماتھے پر ایک شکن پیدا ہوئی۔ آنکھیں قدرے سکڑیں مگر پھر سب معدوم ہو گیا۔ جیسے وہ سب کچھ سمجھ گئے ہوں۔

''حسینہ کہاں ہے......؟'' نواب صاحب نے پوچھا تو سب اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

''چھت پر گئی تھی۔'' دادی اماں نے وضاحت کی۔

''ٹھہریں میں دیکھتی ہوں......'' مونا نے کرسی پیچھے کرتے ہوئے کہا اور چھت کی طرف چل دی......زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مونا کی چیخ سنائی دی۔

چیخ سن کر سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے نواب صاحب لمبے لمبے ڈگ بھرتے سیڑھیوں کی طرف لپکے۔

''یا اللہ خیر!! جہاں آرا بیگم نے سینے پر ہاتھ دھر لیا۔

☆......☆......☆

حسینہ کو دونوں ہاتھوں پر اُٹھائے نواب صاحب سیڑھیاں اُترتے نظر آئے تو عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔

''کیا ہوا اسے......؟ کیا ہوا میری بچی کو؟'' جہاں آرا تیزی سے اُٹھیں تو لڑکھڑا گئیں...... پروفیسر ناہید نے آگے بڑھ کر مشکل سے انہیں سنبھالا۔

''ہائے میرے مولا......کس بدبخت کی نظر لگ گئی میری پوتی کو......'' دادی اماں ڈگمگاتے ہوئے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

نواب سراج الدین سیدھے حسینہ کے کمرے کی طرف بڑھے اور اسے پلنگ پر لٹا دیا۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ مونا نے جلدی سے اس کا منہ صاف کیا۔ سب پلنگ کے گرد کھڑے ہو گئے۔ نواب صاحب بیٹی کے گال تھپتھپانے لگے۔ مونا دونوں ہاتھ گالوں پر رکھے پھٹی پھٹی نظروں سے حسینہ کو دیکھنے لگی۔

دادی اماں آیت الکرسی پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگیں۔ جہاں آرا بیٹی کے تلوے سہلانے لگیں۔ پروفیسر ناہید خانم موبائل پر عمران کو مطلع کرنے میں مصروف ہو گئیں اسے تاکید کی کہ شہر یار کو بھی بُلا کر لے آئے۔

جلد ہی حسینہ کے بدن میں جنبش ہوئی اور وہ جیسے گہری نیند سے بیدار ہونے لگی۔ چند لمحے کسمسانے کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور نیند میں ڈوبی آواز کے ساتھ بولی۔

''اوں ہوں کیوں تنگ کر رہے ہیں مجھے۔ سونے دیں ناں۔''

''حسینہ...... بیٹی! اُٹھو...... میں ابو ہوں تمہارا......'' نواب صاحب بھرائی ہوئی آواز میں مخاطب ہوئے تو حسینہ نے پٹاک سے آنکھیں کھول دیں اور پھر تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا ابو......! آپ لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں؟''

''پانی لاؤ......'' نواب صاحب نے آواز لگائی۔

''میں پڑھ کر دیتی ہوں۔'' دادی اماں نے کہا۔ ملازمہ دوڑ کر پانی لے آئی۔ دادی اماں نے گلاس ہاتھ میں پکڑا اور کچھ پڑھنے لگیں۔ ایک دو منٹ کے بعد گلاس پوتی کے ہونٹوں سے لگا دیا جو حیرانی سے سب کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا تھا حسینہ بیٹی......؟'' نواب صاحب نے بیٹی کے بالوں میں پیار سے اُنگلیاں پھیریں۔

''کچھ نہیں...... کچھ بھی تو نہیں...... مجھے کیا ہونا ہے......؟'' حسینہ خود حیران تھی۔ اسے واقعی کچھ یاد نہ تھا۔

''تجھے منع بھی کیا تھا کہ شام کو چھت پر نہ جایا کرو۔'' دادی نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

''تو دادی کب گئی تھی میں......؟'' حسینہ کے لہجے سے سچ عیاں تھا۔

حسینہ کی بات سن کر سب حیرانی سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

''تم چھت پر بے ہوش پڑی تھیں......نواب صاحب تمہیں ابھی وہاں سے اُٹھا کر لائے ہیں۔'' پروفیسر ناہید نے حسینہ کو یاد دلانے کی کوشش کی۔

ان کی بات سن کر حسینہ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی......جیسے اسے ان کی دماغی کیفیت پر شبہ ہو رہا ہو۔

''آنٹی میں تو کالج سے آ کر سو گئی تھی۔ ابھی اُٹھی ہوں۔ چھت پر تو گئی ہی نہیں......'' حسینہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

''چلو ہم باہر چائے پئیں۔ اسے آرام کرنے دیتے ہیں۔'' نواب صاحب نے سب کو اشارہ کیا تو سوائے مونا کے سب باہر چلے گئے۔ چائے جوں کی توں رکھی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ تازہ چائے تیار کرائی گئی اور سب چائے پینے لگے۔ آہستہ آہستہ ماحول دوبارہ خوش گوار ہونے لگا۔

''آپ نے مجھ سے مٹھائی کے بارے میں تو پوچھا ہی نہیں کہ کیوں لائی ہوں؟''

پروفیسر ناہید خانم نے اچانک ہی گفتگو کا رُخ پھیر دیا......تو جہاں آرا اور نواب سراج الدین کی نظریں ٹکرائیں۔

''اری ناہید! جب لائی ہو تو مقصد بھی خود ہی بتا دو......'' دادی اماں بولیں اور سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔

''چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے۔ سوچتی ہوں کیسے زبان کھولوں اور مدعا بیان کروں۔ کہیں برسوں کی دوستی کو ٹھیس نہ لگ جائے۔'' پروفیسر ناہید نپے تلے الفاظ سے آمد کا مقصد بیان کرنے لگیں۔

''کھل کر بات کرو ناہید بہن۔'' نواب سراج الدین گہری سنجیدگی سے بولے۔

ابھی پروفیسر ناہید نے بات شروع ہی کی تھی کہ موٹر سائیکل کی آواز آئی۔ شہریار اور عمران حویلی کے بڑے دروازے سے داخل ہوئے۔ شہریار موٹر سائیکل چلا رہا تھا اور عمران پیچھے بیٹھا تھا۔ موٹر سائیکل دور ہی رک گیا۔ دونوں تقریباً بھاگتے ہوئے نزدیک آ گئے۔ دونوں ہی پریشان تھے۔ ''کیا ہوا حسینہ کو؟'' شہریار نے پوچھا۔ ''کہاں ہے وہ......؟''

ابھی کسی نے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ کسی کے زور زور سے رونے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی مونا بھاگتی ہوئی کمرے سے نکلی۔

''وہ......وہ......حسینہ......'' اس کے منہ سے بات نہ نکل سکی۔ اس کے تو اوسان ہی خطا تھے۔ پہلے شہریار اور اس کے پیچھے پیچھے سب حسینہ کے کمرے کی طرف دوڑے۔

☆......☆......☆

کمرے میں پہنچ کر کیا دیکھتے ہیں کہ حسینہ کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہے اور وہ زار وقطار رو رہی ہے۔

''کیا ہوا اسے؟'' عمران نے بہن کی طرف دیکھا۔

''پتہ نہیں......'' مونا سہمی ہوئی تھی۔ ''پہلے ہنسنے لگی اور پھر اچانک زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ میں تو ڈر کر بھاگ گئی۔''

''حسینہ اے حسینہ!'' شہریار بہن کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا۔ اس کے ایسا کرنے سے حسینہ فوراً چپ ہوگئی اور غور سے بھائی کو یوں دیکھنے لگی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اتنے میں سب لوگ وہاں پہنچ گئے اور پھر حسینہ کے حلق سے ایک قہقہہ نکلا۔ قہقہہ اتنا طویل تھا کہ جیسے قہقہوں سے بھری کیسٹ چل رہی ہو۔ سب بُری طرح سہم گئے۔

''یوں لگتا ہے جیسے اس پر کسی چیز کا سایہ ہو گیا ہے۔'' نواب صاحب نے زبان کھولی۔

''کہیں کوئی جن تو نہیں......؟'' جہاں آرا بیگم کے ہونٹ تھرتھرائے۔

''میرا خیال ہے کسی ڈاکٹر کو بلانا چاہیے۔'' پروفیسر صاحبہ تیزی سے بولیں۔ ''ہسٹریا جیسی کیفیت لگتی ہے۔'' ادھر دادی اماں تیز تیز کچھ پڑھ کر پوتی کو پھونکیں مارتی جا رہی تھیں۔

حسینہ مسلسل قہقہے لگا رہی تھی۔ شہریار اس کو قابو کرنے میں مصروف تھا۔ مگر وہ مچل رہی تھی۔ پھر ایک قہقہہ تو اتنا طویل ثابت ہوا کہ سب ڈر گئے۔ ہنستے ہنستے حسینہ کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ لیکن قہقہہ بند نہ ہوا۔ حسینہ بستر پر ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی اور پھر...... وہ چپ ہوگئی اور سب کو خالی خالی نظروں سے گھورنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ سسکنے لگی۔ اور

اچانک باپ سے لپٹ گئی۔

''ابو......مم مجھے ڈر لگ رہا ہے......''

''ہم تمہارے پاس ہیں بیٹا......! کیسا ڈر......؟'' یہ کہتے کہتے نواب سراج الدین کی آواز بھرا گئی اور پلکوں کے گوشے بھیگ گئے۔ بیٹی کو انہوں نے سینے سے لگا لیا اور آہستہ آہستہ اس کی پشت کو سہلانے لگے۔ آخر کو ان کی لاڈلی بیٹی تھی۔ جانے کس کی نظر لگ گئی تھی اس کو۔ جہاں آرا بیگم نے بھی پلو سے منہ چھپالیا۔ وہ بھی رو رہی تھیں۔ پروفیسر ناہید کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔ دادی اماں مسلسل پوتی کو پھونکیں مار رہی تھیں۔

شہریار اور عمران کے ماتھے شکن آلود تھے۔ مونا پریشان تھی۔ ملازمین چپ چاپ کھڑے تھے۔

اور پھر سسکتے روتے حسینہ ڈھیلی پڑ گئی۔ نیند اس کے پپوٹوں میں اُتر آئی۔ آنکھیں بند ہوگئیں اور وہ سوگئی۔ نواب صاحب نے آہستگی سے بیٹی کا سر تکیے پر رکھ دیا اور سب کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگے کہ جیسے کہہ رہے ہوں کہ اب اسے آرام کرنے دو۔

سب چھوٹے چھوٹے قدموں سے باہر جانے لگے......دادی اماں البتہ پوتی کے سرہانے بیٹھی رہیں۔

حسینہ سو چکی تھی مگر اسے تیز بخار ہو گیا تھا۔ پروفیسر ناہید بچوں کے ساتھ صورت حال کے پیش نظر وہیں رک گئی تھیں۔ نواب صاحب کے کہنے پر شہریار نے ڈاکٹر شیرازی کو فون کر کے بلوالیا تھا۔

ڈاکٹر شیرازی کے نواب سراج الدین سے گہرے مراسم تھے۔ وہ حسینہ کے ننھیالی رشتہ دار بھی تھے اسی ناتے حسینہ اور شہریار انہیں ماموں کہتے تھے۔

ڈاکٹر شیرازی جس وقت حسینہ کو چیک کر رہے تھے وہ نیند کی حالت میں تھی مگر اس کے باوجود ہیجانی کیفیت کا شکار اور خاصی بے چین معلوم ہوتی تھی۔ ڈاکٹر شیرازی کو سارا واقعہ سنا دیا گیا تھا۔

''بخار 104 سے کچھ زیادہ ہے۔'' ڈاکٹر شیرازی فکر انگیز لہجے میں بولے اور ساتھ ہی اسے دو انجکشن لگائے۔ کچھ مسکن دوائیں لکھ دیں اور گیلی پٹیاں رکھنے کی ہدایت کی۔

رات بھر کوئی سو نہ سکا۔ سب ہی فکرمند تھے۔ انتہائے سحر بخار میں کچھ کمی واقع ہوئی تو سب نے سکھ کا سانس لیا۔ بخار سو پر آ گیا تھا۔ سب نے نماز پڑھی ہلکا پھلکا ناشتہ کیا اور بستروں پر گر گئے۔ سب ہی شدید تھکے ہوئے تھے۔ حسینہ بھی گہری اور پُرسکون نیند سوئی ہوئی تھی۔ اس کے کمرے کا دروازہ آہستگی سے بند کر دیا گیا تھا۔ ابھی گھنٹہ بھر بھی نہ گزرا ہوگا کہ حویلی کے در و دیوار حسینہ کی فلک شگاف چیخوں سے گونجنے لگے۔ سب سے پہلے شہریار نے بہن کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ حسینہ کمرے کے کونے میں سکڑی سمٹی بیٹھی چیخیں مار رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس کی نظر روشندان پر تھی۔ اس کا چہرہ خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ دوپٹے سے بے نیاز تھی اور اس کا لباس بے ترتیب تھا۔

شہریار نے بستر کی چادر بہن کے شانوں پر ڈالی جو ابھی تک روشندان کی طرف نظریں جمائے ہوئے گھگھیا رہی تھی۔ ''وہ...... وہ...... مجھے مارنا چاہتا ہے...... وہ مجھے مار ڈالے گا۔''

''کون مارے گا...... کون ہے کدھر ہے......؟'' شہریار نے روشندان کی طرف دیکھا جہاں کچھ بھی نہ تھا۔ روشندان البتہ کھلا تھا اور باہر سے ہلکی ہلکی صبح کی روشنی آ رہی تھی۔

اتنی دیر میں سبھی لوگ آ گئے۔ حسینہ کی حالت دیکھ کر سب گھبرا گئے جس پر بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ وہ بُری طرح ڈری ہوئی تھی اس کا سرخ و سپید چہرہ خوف کے زیر اثر دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑ چکا تھا۔ مگر شہریار کو نظر آنے والی خراشیں اب غائب تھیں۔ اسے بمشکل باہر برآمدے میں لایا گیا۔ کافی دیر بعد اس کی حالت سنبھلنے کی طرف مائل ہوئی۔ شام تک حیرت انگیز طور پر بخار اُتر گیا اور حسینہ نارمل ہونے لگی۔ اگلے تین دنوں میں کچھ نہ ہوا بلکہ حسینہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔ نواب سراج الدین نے شہر کے بڑے ہسپتال میں لے جا کر اس کا مکمل چیک اپ کروایا...... ہر رپورٹ OK تھی۔ حسینہ اب ٹھیک تو تھی لیکن کالج جانا چھوٹ چکا تھا۔ گھر والے ہر وقت چوکنے رہتے تھے کہ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ حسینہ پہلے جیسی شوخ و شنگ نہیں رہی تھی اب تو وہ ہر وقت گم صم...... جانے کہاں کھوئی رہتی۔ کبھی بیٹھے بیٹھے اچانک اسے جھرجھری سی آ جاتی۔ اس صورت حال سے سب پریشان تھے۔

☆......☆......☆

بادلوں کی فوج سرِ شام ہی پیش قدمی کرنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر بادلوں کے غول دندنانے لگے اور اندھیرا چھاتے ہی گھن گرج شروع ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی ٹپ ٹپا ٹپ ٹپ بارش شروع ہوگئی...... تیز جھکڑوں سے حویلی کے پرانے کواڑ قوالی کرنے لگے۔ آنگن میں کھڑے درختوں کے ڈھیروں پتے شائیں شائیں کرتی ہوا کے دوش پر سر پھٹول میں مصروف ہوگئے۔

حسینہ اپنے بیڈ روم میں...... ریشمی رضائی گھٹنوں تک کھینچے، گول تکیے سے ٹیک لگائے مونگ پھلی ٹونگ رہی تھی۔ اس کی نظریں ٹی۔وی سکرین پر تھیں جہاں کسی ڈرامے کا کلائمیکس چل رہا تھا۔ وہ باہر کے موسم سے بخوبی آگاہ تھی۔ اس کے خیال میں لائٹ اب تک چلی جانی چاہیے تھی مگر حیرت انگیز طور پر ابھی تک موجود تھی۔ اس کے بعد وہی ہوا جس کا اس کو خدشہ تھا۔ لائٹ چلی گئی تو حسینہ بدستور مونگ پھلیاں کھاتی رہی مگر جب کافی دیر تک لائٹ نہ آئی تو رضائی کھینچ کر تکیہ سیدھا کر کے اس نے آنکھیں موند لیں۔

جانے رات کا کون سا پہر تھا، جب اس کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ دیر خالی الذہن رہی پھر چونک پڑی۔ T.V چل رہا تھا لیکن لائٹ بند تھی؟ اس نے حیرانی سے سوچا کہ اگر بجلی آ گئی ہے تو لائٹیں بھی جلنی چاہیئے تھیں۔ باہر بادلوں کی گھن گرج ویسی ہی تھی۔ بجلی بار بار کڑک رہی تھی۔ اس نے ٹٹول کر پانی کا جگ اور گلاس پکڑا، پانی انڈیل کر پیا تو اسے زور سے اُبکائی آ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے پانی میں کوئی کیڑا مکوڑا ہو۔ وہ تھوتھو کرنے لگی۔ بستر سے اتر کر سوئچ بورڈ کی طرف بڑھی تا کہ لائٹیں آن کر سکے مگر...... وہ حیران ہوئی لائٹوں کے بٹن آن تھے لیکن لائٹیں بند جبکہ ٹی۔وی چل رہا تھا۔ اس کی نظریں غیر ارادی طور پر ٹی وی سکرین کی طرف مرکوز ہوئیں تو وہ چونک اٹھی۔ ٹی وی پر طوفانی بارش کا منظر تھا۔ بجلی چمک رہی تھی۔ چونکی اس بات سے تھی کہ سکرین پر ان ہی کی حویلی دکھائی دے رہی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ آنکھیں مل مل کر دوبارہ دیکھا۔ یہ سو فیصد انہی کی حویلی تھی۔ منظر بدلنے لگا اور اب سکرین پر حویلی کے اس کمرے کی تصویر آ رہی تھی جو ہمیشہ بند رہتا تھا۔ بیک گراؤنڈ میوزک بھی خاصا مہیب تھا۔ اور پھر حسینہ لرزنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ بند کمرے سے سفید رنگ کا ایک ہیولا اُڑتا ہوا دیوار سے باہر آ رہا ہے۔ اڑتے اُڑتے وہ ایک کمرے کی کھڑکی

سے اندر جاتا دکھائی دینے لگا۔ اسے اپنے کمرے کے اندر تیز خوشبو آنے لگی۔ یہ خوشبو اسے اپنے دائیں جانب سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس نے دائیں طرف دیکھا تو بند کھڑکی کے شیشے سے ٹی۔ وی سکرین پر دکھائی دینے والا سفید ہیولہ اندر گھستا دکھائی دیا۔ حسینہ کی چیخ نکل گئی اور وہ خارجی دروازے کی طرف بھاگی۔ اندھیرے میں اٹکل پچو طریقے سے چٹخنی کھولی اور دروازے کو کھینچنے لگی مگر دروازہ نہ کھلا۔ اسی اثناء میں سفید ہیولا اس کے قریب آ گیا۔ اس کے حلق سے دلخراش چیخ نکلی پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب آنکھ کھلی تو وہ اپنے بستر پر آرام دہ طریقے سے دراز تھی۔ رضائی سینے تک تھی۔ ایک چمکیلی صبح کی روپہلی دھوپ کی تازہ کرنیں کمرے تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سن کر وہ اُٹھ بیٹھی۔ کھڑکی تک آئی، باہر دیکھا تو رات بھر کی بارش کی باقیات قطرے پتوں کا منہ چوم رہے تھے۔

مسحور کن موسم سے حسینہ کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ بالوں کا کلپ کھول کر...... بیڈ کی دراز سے ہیئر برش نکالا اور بال ٹھیک کر کے دوبارہ کلپ لگا دیا۔ پلنگ کے نیچے سے سلیپر انگوٹھوں میں اڑسے اور باتھ روم میں جانے لگی تھی کہ اسے رات والا واقعہ یاد آ گیا تو اِک سراسیمگی اس کے روئیں روئیں میں سرایت کر گئی۔ وہ سرتا پا لرز کر رہ گئی۔ اسے اس خیال سے ہی ہول آنے لگا کہ وہ اس واقعہ کے بعد سے ابھی تک کمرے میں ہی ہے۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی، چٹخنی کھلی تھی۔ دھڑکتے دل سے دروازے کے پٹ کھینچے تو وہ بآسانی کھل گئے۔

وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

☆......☆......☆

''کیا بات ہے حسینہ آج کچھ چپ چپ ہو......؟'' کالج کے خالی پیریڈ میں حسینہ کو گم صم دیکھ کر مونا نے اسے ٹہوکا۔

''آں...... ہاں......'' حسینہ چونکی۔ ''کک...... کچھ نہیں...... ویسے ہی ذرا طبیعت میں کسلمندی ہے۔'' حسینہ نے اسے ٹالنا چاہا۔

''نہیں حسینہ......! کوئی بات تو ضرور ہے صبح کالج آتے ہوئے بھی تم خاموش

تھیں۔ کلاس میں بھی میں نے تمہیں کھوئے ہوئے محسوس کیا اور اب بھی تم کوئی بات نہیں کر رہی ہو۔ کچھ مجھے بھی بتاؤ کیا بات ہے......؟'' مونا نے اصرار کیا تو حسینہ نے رات والا واقعہ من وعن مونا کے گوش گزار کر دیا...... مونا کھلکھلا کر ہنس دی اور بولی......

''اری پاگل...... خواب میں ڈر گئی ہوگی...... کبھی ایسے بھی ہوتا ہے...... اگر تم دروازہ کھولنے کی کوشش میں بے ہوش ہوگئی تھیں۔ تو جب اٹھی ہو تو پلنگ پر کیسے پہنچ گئیں؟ کیا کسی عاشق جن نے تمہیں دوبارہ پلنگ پر سلایا تھا؟'' مونا ہنسنے لگی۔ مونا کی بات سن کر حسینہ کو اپنی بیوقوفی پر خود بھی ہنسی آ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ خواب ہی تھا جو دماغ پر سوار ہو گیا ہے اور پھر وہ جیسے سب کچھ بھول بھال گئی۔

☆......☆......☆

پاکستانی ویب سائٹ وقار عظیم ڈاٹ کام

اس دن حسینہ اپنا پسندیدہ ڈائجسٹ دیکھ رہی تھی جو کبھی کبھی آ تا تھا۔ سرورق پر ایک مرد اور ایک عورت کی ہاتھ سے بنائی گئی فرضی تصویر تھی۔ دونوں چہرے خوبصورت تھے مرد اعلیٰ درجے کے لباس میں ملبوس تھا۔ رسالے کا سرِ ورق دیکھتے دیکھتے حسینہ کو یوں محسوس ہوا جیسے زمین ہل رہی ہو، کمرہ گھوم رہا ہو۔ اسے اپنا سر چکراتا محسوس ہونے لگا اس لمحے اس کی نگاہ تصویر میں مرد کی آنکھوں پر پڑی۔ آنکھوں کا رنگ بدلتا جا رہا تھا اور حسینہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان آنکھوں کی پراسرار چمک نے اس کے دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ اس کی نظریں تصویر پر جم گئیں۔ پھر مرد کے برابر والی لڑکی کے چہرے کی رنگت بھی بدلنے لگی۔ پہلے وہ چہرہ سرخ و سفید اور خوبصورت تھا لیکن اب اس کا رنگ کالا ہوتا جا رہا تھا۔ دانت لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ اسے یاد آ گیا کہ یہ وہی عورت ہے جسے اس نے سائیں جیون کے مزار پر دیکھا تھا اور جو اسے عجیب و غریب وادیوں کی سیر کرانے لے گئی تھی۔ حسینہ اس تصویر کو دیکھتی رہی اور اس کے ہوش و حواس گم ہونے لگے۔ دفعتاً تصویر کے مرد کی آواز اُبھری۔

''تم اس کمرے میں آؤ، میں تمہیں وہیں ملوں گا۔ میں صرف تمہاری وجہ سے اس ویران کمرے میں رہتا ہوں۔ اس کمرے میں آ جاؤ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی ایک زوردار چھناکا ہوا جیسے شیشے کی کوئی چیز ٹوٹی ہو اور حسینہ جیسے نیند سے جاگ گئی! اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تصویر کو دیکھا مرد اور عورت اسی طرح مسکرا رہے تھے۔ حسینہ کا دل چاہا کہ رسالہ پھینک کر بھاگ نکلے۔ رسالہ تو اس کے ہاتھ سے گر گیا لیکن اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اپنا بدن بے جان پایا۔ وہ بُری طرح ڈر گئی اور دہشت زدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اتنی دیر میں دادی اماں کی آواز سنائی دی:

''حسینہ، حسینہ بیٹی......!''

''جی دادی اماں!'' اس کی آواز جیسے بمشکل حلق سے آزاد ہوگئی۔ دادی اماں کمرے میں گھس آئی تھیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے بھئی۔ میں کہتی ہوں تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے اب زیادہ تر تم اپنے کمرے میں گھسی رہتی ہو۔ ہنسنا نہ بولنا وہ تمہاری شوخیاں اور شرارتیں کہاں چلی گئیں؟ جب سے بیمار ہوئی ہو لگتا ہے کوئی مسئلہ بن گیا ہے۔''

''نہیں دادی اماں! میں ٹھیک ہوں۔'' حسینہ نے کمزور آواز میں کہا۔

''کہاں ٹھیک ہو، کوئی بات ہے تو بتاؤ بیٹا۔ کوئی پریشانی ہوگئی ہے کسی نے تجھے کچھ کہہ دیا ہے کیا......؟''

''نہیں آپ یقین کریں دادی اماں نہ کسی نے کچھ کہا ہے نہ کوئی بات ہوئی ہے بس یوں ہی کچھ عجیب سا لگنے لگا ہے مجھے۔''

''نہیں بیٹا بُری بات! تم باہر نکلا کرو جاؤ کہیں گھوم پھر آؤ۔''

''کہاں جاؤں دادی اماں!''

''لو...... مونا کے گھر چلی جاؤ وہی بیچاری آتی رہتی ہے، تمہارے پاس۔ ناہید بھی کہہ چکی ہے کئی بار کہ آپ لوگوں نے تو ہمارے ہاں آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔''

''آپ لوگ چلے جایئے دادی اماں! میری طبیعت کچھ بوجھل ہو رہی ہے۔''

''نہیں اب تمہیں چھوڑ کر جانے کو دل نہیں چاہتا بیٹا! اللہ جانے تمہیں کیا ہوگیا ہے؟'' دفعتاً حسینہ کے ذہن میں ایک خیال اُبھرا اور وہ چونک اُٹھی۔ تھوڑی دیر پہلے والے الفاظ اسے یاد ہی آ گئے تھے۔

''دادی اماں! آیئے بیٹھیے۔''

''چلو تم باہر چلو، صحن میں بیٹھیں گے۔ کھلی ہوا میں۔''

''جی۔'' حسینہ دادی اماں کے ساتھ باہر نکل آئی۔ جہاں آرا بیگم کچن میں تھیں۔ دادی اماں کتنی بار جہاں آرا بیگم سے کہہ چکی تھیں کہ تم حسینہ سے کھانا پکوایا کرو۔ دوسرے گھر جانا ہے کوئی کتنا ہی اچھا ہو، لیکن بہو بیٹیوں کو یہ کام کرنے پڑتے ہیں۔ بزرگ کہاں تک بیٹھے رہتے ہیں گھر داری آنی چاہیے بچیوں کو۔''

اور جہاں آرا بیگم کا جواب ہوتا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں اماں جان۔ میں سوچتی ہوں ساری زندگی اس نے یہی سب کچھ کرنا ہے ماں باپ کے گھر آرام کرلے تو کیا حرج ہے؟ میرے ہاتھ پاؤں فی الحال چل رہے ہیں تھک جائیں گے تو اس سے پکواؤں گی۔ خدا اسے عزت آبرو کے ساتھ اپنے گھر کا کرے۔''

''آمین۔ لیکن پھر بھی بیٹا؟ کبھی کبھی تو......'' دادی اماں ہر بار اصرار کرتیں اور جہاں آرا بیگم ہر بار وعدہ کرتیں، حسینہ خود جب کچن میں جاتی تو جہاں آرا بیگم اسے پیار سے باہر لے آیا کرتیں اور کہتیں:

''نہ بیٹا نہ آگ کی تپش لگے گی تو چہرے کا رنگ خراب ہوگا۔''

''لیجئے امی آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں......جیسے......جیسے......'' جیسے حسینہ آگے جملہ پورا نہیں کر پاتی تھی اور جہاں آرا بیگم اس کی بات سمجھ کر ہنس دیتیں۔

''ہاں ہاں سسرال والوں کے لیے ابھی سے کھانا پکانا شروع کر دے۔'' اور اس طرح بات مذاق میں ٹل جاتی۔ دادی اماں حسینہ کو لے کر صحن میں آ بیٹھیں۔ ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ حسینہ کو اپنے بدن میں توانائی سی محسوس ہو رہی تھی۔ صحن میں آ کر بیٹھتے ہی اس نے دادی اماں سے سوال کیا۔

''دادی اماں وہ آخری کمرہ جو بند پڑا رہتا ہے اس کا مجھے آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ آخر وہ کیوں بند رہتا ہے؟ کوئی اس طرف کیوں نہیں جاتا؟ ایک دفعہ میں کسی وجہ سے ادھر نکل گئی تھی لیکن امی نے اس طرح شور مچایا جیسے میں کوئی بہت ہی خوفناک کام کرنے جا رہی ہوں۔ آپ لوگ مجھے اس طرف جانے سے کیوں منع کرتے ہیں؟'' دادی اماں کے چہرے پر اچانک یہ سوال سن کر عجیب سے تاثرات پھیل گئے پھر انہوں نے کہا۔

''بیٹا! ہم لوگ تو اس کمرے کا ذکر بھی نہیں کرتے۔ آج تیرے ذہن میں اس کا خیال کیسے آ گیا؟'' حسینہ کو فوراً وہ دونوں لمحے یاد آ گئے۔

''آپ لوگ اس کمرے کی بات کیوں نہیں کرتے؟'' حسینہ نے پھر سوال کیا۔

''اس کی وجہ ہے۔'' دادی اماں نے مختصراً جواب دیا۔

''مجھے بھی تو بتایئے وہ وجہ۔'' حسینہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''بزرگوں نے منع کر رکھا ہے کہ اس کمرے کی طرف زیادہ توجہ نہ دی جائے۔''

''کون بزرگ؟'' حسینہ نے ضد کرنے والے انداز میں کہا اور دادی اماں زور سے ہنس دیں۔

''لے بیٹا! تو تیرا کیا خیال ہے ہمارے کبھی بزرگ ہی نہیں تھے؟''

''نہیں دادی اماں! میں سنجیدگی سے یہ بات پوچھ رہی ہوں۔''

''میں پوچھتی ہوں کہ آخر کیوں پوچھ رہی ہے؟''

''دادی اماں! اگر آپ مجھ سے کوئی سوال کرتی ہیں تو کیا میں آپ سے کبھی یہ بات کہتی ہوں کہ آپ مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہی ہیں؟'' اس بات پر دادی اماں لاجواب ہوگئیں۔ اور کچھ دیر تک سوچنے کے بعد پھر بولیں۔

''چل ٹھیک ہے۔ جس طرح بزرگ اس کمرے کا راز اپنی اولاد کو منتقل کرتے چلے آئے ہیں اسی طرح میں بھی تجھے یہ راز بتا دیتی ہوں۔ بیٹا! یہ بہت پرانی کہانی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ یہ بات پردادا جی کی ہے اور پردادا کا قصہ کتنا پرانا ہوگا اس کا اندازہ تمہیں خود ہونا چاہیے۔''

''جی دادی اماں۔'' حسینہ نے ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے کہا۔

''پردادا جی کا نام مہابت خان تھا۔ یہاں کسی زمانے میں کوئی اور آبادی تھی اب تو اس کے کھنڈرات کا بھی نام و نشان نہیں ہے کیونکہ زمانہ کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہے وہ آبادی بارہ برجی کہلاتی تھی۔ پردادا کے ابا جی نے غربت سے تنگ آ کر نوجوان بیٹے کو معقول رقم کے عوض ایک ہندو جوگی کے ہاتھوں بیچ دیا جو جادو ٹونے بھی کرتا تھا۔ یہ کہانی جو سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچی وہ اس طرح ہے کہ ہندو جوگی دینا پرشاد انہیں لے کر چل پڑا۔ پردادا جی بیچارے سیدھے سادھے آدمی تھے ان کے ابا نے ان سے جو کچھ کہا انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ چنانچہ ہندو جوگی کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ وہ انہیں لے کر ایک حویلی نما گھر میں داخل ہوگیا جس کے بارے میں پردادا جی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ انہیں کوئی نشہ آور چیز دی گئی جسے پی کر پردادا جی سو گئے۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو وہاں کا منظر ہی بدل چکا تھا ایسا تو انہوں نے خواب

میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کے بدن پر بہت ہی خوبصورت لباس تھا۔ تین خادمائیں حکم کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے گردن جھکا کر کہا۔

''آیئے مہاراج! صبح کا بھوجن تیار ہے۔''

کچھ لمحے کے لیے تو پردادا جی گڑ بڑائے پھر انہوں نے سوچا چلو ٹھیک ہے اللہ نے جو کچھ دیا ہے اس سے منہ نہیں موڑنا چاہیے۔ لڑکی پردادا جی کو لے کر جس کمرے میں پہنچی وہ بہت وسیع اور خوبصورت تھا۔ کمرے کے وسط میں دسترخوان بچھا تھا اور اس پر کھانے پینے کی بہت سی چیزیں چنی ہوئی تھیں۔ کمرے میں پردادا جی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا سوائے اس لڑکی کے جو انہیں یہاں تک لے کر آئی تھی۔ اس لڑکی نے کہا۔

''بیٹھیے مہاراج۔''

''مم۔ مگر میں کہاں ہوں؟''

''آپ اپنی بر.جی میں ہیں۔''

''کون سی بر.جی......؟''

''آپ کو کیا ہو گیا ہے مہاراج کیا کوئی سپنا دیکھ لیا ہے؟ ہم آپ کے غلام ہیں آیئے بیٹھیے بھوجن کیجیے۔'' پردادا جی نے سوچا کہ چلو عیش کی زندگی مل رہی ہے گزار لو۔ جب ان لوگوں کو میری حقیقت معلوم ہو گی تو مار پیٹ کر باہر نکال دیں گے۔ لڑکی ان کی خدمت کرتی رہی۔ کھاتے کھاتے پردادا جی نے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''سیتا......؟''

''سیتا تم مجھے جانتی ہو؟''

''لیجیے اپنے آقا کو کون نہیں جانتا۔''

''مگر ہم تمہارے مالک نہیں ہیں ہم نے تو تمہیں زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے اور یہ عیش بھی پہلی بار ہی دیکھے ہیں۔''

''مہاراج! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ یہ آپ کی حویلی ہے۔ یہاں سب آپ کے غلام ہیں۔''

عظیم وقار پاکستانی پیج

پرداداجی حیران بھی تھے اور پریشان بھی۔ ''اچھا یہ بتاؤ جوگی دینا پرشاد جی کہاں ہیں؟''

''پتہ نہیں کس کی بات کر رہے ہیں آپ، ہم کسی دینا پرشاد کو نہیں جانتے۔'' پردادا جی گہری سانس لے کر خاموش ہو گئے۔ ناشتے کے بعد لڑکی نے کہا۔

''آیئے اب آپ تھوڑی سی چہل قدمی کریں گے اور اس کے بعد آپ کا جو من چاہے، کیجئے گا۔'' پردادا جی نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک اصلیت سامنے نہیں آجاتی ان لوگوں سے تعاون کرنا چاہیے۔ اسی میں نجات کا راستہ ہے۔ چنانچہ وہ لڑکی کے ساتھ چل پڑے۔ یہ بہت ہی خوبصورت حویلی تھی جس کی زبردست تزئین و آرائش کی گئی تھی ایک سے ایک حسین کمرہ، بڑے بڑے ہال، پھر لڑکی انہیں ایک راہ داری سے گزار کر ایک وسیع لان میں لے آئی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ چاروں طرف درخت جھول رہے تھے اور ان کے دامن میں پھولوں کے تختے جن میں رنگ برنگے پھول لہرا رہے تھے، جگہ جگہ سفید سنگ مرمر کی بینچیں پڑی تھیں ایک جگہ سنگِ مرمر کا ہی ایک حوض بنا ہوا تھا جس میں رنگین مچھلیاں تیر رہی تھیں حوض کے کنارے سنگی کرسیاں تھیں ان تمام جگہوں سے گزر کر وہ اندرونی حصے میں آ گئے۔ ایک ایک چیز سے امارت ٹپک رہی تھی۔ پھر پرداداجی نے پوچھا۔

''سیتا ایک بات بتاؤ کیا اتنی شاندار حویلی میں تم تینوں کے سوا کوئی اور نہیں؟''

''نہیں مہاراج! ایسی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر......؟''

''آپ کے بہت سے داس ہیں یہاں لیکن وہ آپ کے سامنے نہیں آ رہے۔''

''کیوں؟''

''بس مہاراج آپ کا رعب جو ہے۔''

''صرف نوکر ہیں اور کوئی نہیں؟''

''مہاراج! نوکروں کے علاوہ یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ آپ کی ساری ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی ہے۔''

''کس نے ڈالی ہے؟''

''مہاراج! اس کا پتہ آپ کو بعد میں ہی چلے گا ہمیں نام لینے سے منع کر دیا گیا ہے۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ اس حویلی کے آس پاس کیا ہے؟''

''جو کچھ بھی ہے مہاراج آپ کو سات دن کے بعد پتہ چل جائے گا۔''

''مگر سات دن کے بعد کیوں؟''

''یہی حکم ہے۔''

''پھر وہی خیال دل میں آتا ہے کہ تم سے پوچھوں کہ کس کا حکم ہے۔''

''اور وہی جواب ہم آپ کو دیں گے مہاراج کہ نام بتانے کی اجازت نہیں۔''

''تم ہمیں مہاراج، مہاراج کیوں کہے جا رہی ہو؟''

''اس لیے کہ آپ ہمارے مہاراج ہیں۔''

''میرا نام جانتی ہو؟''

''جی ہاں......''

''کیا نام ہے میرا؟''

''مہابت خان......''

''اچھا سیتا! تمہیں یہ پتہ ہے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟''

''مہاراج! آپ کی باتیں ہمیں سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ بس ہم تو یہ جانتے ہیں کہ آپ جہاں سے بھی آئے ہیں، ہمارے مہاراج ہیں۔'' پردادا جی خاموش ہو گئے۔

''لیکن دادی اماں......وہ ہندو جوگی کہاں چلا گیا تھا؟'' حسینہ نے لقمہ دیا۔

''سنو تو سہی......یہی تو کہانی ہے......'' دادی اماں نے حسینہ کی بات کا جواب دے کر پھر اپنی گفتگو جاری رکھی۔ سیتا بہت ہی اچھی اور خوبصورت لڑکی تھی۔ پردادا جی کو پسند آئی تھی لیکن ان کا دماغ یہ مشکل حل نہیں کر پا رہا تھا۔ کہ وہ کہاں سے کہاں آ گئے ہیں اور کیوں۔ پورا دن گزر گیا، رات کے کھانے کے بعد بھی سیتا ان سے باتیں کرتی رہی اور اس کے بعد اس نے پردادا جی کو سونے کے لیے کہا۔ عظیم الشان مسہری جو بہت لمبی چوڑی تھی اس کے علاوہ کمرے میں جو کچھ تھا وہ دیکھ کر بھی دماغ چکرا جاتا تھا۔ پردادا جی نے چونکہ بڑی غربت کی زندگی گزاری تھی اس لیے وہ ان تمام چیزوں سے آشنا نہیں تھے وہ سو گئے اور پھر صبح کی کرنوں نے انہیں جگا دیا، لیٹے ہی لیٹے انہوں نے آواز دی۔

''سیتا، سیتا! کہاں ہوتم؟'' لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ کئی بار آواز دینے کے بعد انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو منظر بدلا ہوا تھا اس حویلی کا تو نام ونشان نہیں تھا جس میں وہ مہاراج کے طور پر ایک روزہ زندگی گزار چکے تھے۔ ان کے چاروں طرف بھوری اور بدنما چٹانیں بکھری ہوئی تھیں جس جگہ وہ لیٹے ہوئے تھے وہاں کھردری زمین تھی، جہاں چھوٹے چھوٹے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ وہ اُٹھے تو ان کے بدن میں شدید درد تھا۔ بڑی مشکل سے ہمت کر کے وہ کھڑے ہو گئے اور چاروں طرف دیکھنے لگے یہ ایک ہولناک ویرانہ تھا جہاں تک نظر جاتی بھوری چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ زمین میں تھوہر کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ دُور دُور تک کسی ذی روح کا نام ونشان نہیں تھا۔ پردادا جی کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے دہشت بھری آواز میں کہا۔

''کوئی ہے یہاں؟'' لیکن ان کی آواز ہوا میں بکھرتی چلی گئی۔ کوئی نظر نہ آیا کوئی جواب نہ آیا۔ پردادا جی تھرتھر کانپنے لگے۔ کہاں گزرا ہوا دن اور کہاں اس ویران دن کا آغاز۔ انہیں سمجھ نہیں آیا کہ یہ سب کیسے ہوا، وہ پہلے کوئی خواب دیکھ رہے تھے یا اب خواب دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کو دانتوں سے کاٹا اور جب انہیں یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ ہوش وحواس میں ہیں تو ان کے منہ سے دردناک آہ نکل گئی۔

''یا اللہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' وہ خوفزدہ اور پریشان ہو گئے انہوں نے اپنے کپڑے جھاڑے تو معلوم ہوا کہ یہ وہ کپڑے نہیں ہیں جو کل پہنے ہوئے تھے یہ ان کا اپنا پرانا لباس تھا۔ انہیں یقین ہونے لگا کہ گزرا ہوا دن خواب تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر وہ خواب تھا تو یہ کیا ہے۔ چونکہ کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ پردادا جی مجبوراً وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ دور دور تک ٹیلوں کا سلسلہ پھیلا تھا۔ ٹیلوں پر چڑھ کر دیکھتے تھے کہ کہیں کسی بستی کے آثار نظر آ جائیں، لیکن چاروں طرف ٹیلے ہی ٹیلے تھے۔ وہ مسلسل چلتے رہے۔ پیاس اور بھوک نے ان کی حالت بُری کر دی تھی۔ دوپہر تک وہ مختلف سمتوں میں پھرتے رہے پھر انہیں ایک درخت نظر آیا اور وہ اس کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ سورج قہر برسا رہا تھا اور آگے بڑھنے کی اب ہمت نہیں رہی تھی۔ وہ سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ کیا اس ویرانے میں بھوک پیاس کے عالم میں ہی ان کی زندگی کی شام ہو جائے گی۔ درخت نے

بہرحال اتنا سہارا ضرور دیا کہ سورج سر پر سے گزر گیا۔ پیاس کی شدت کے باوجود جب موسم میں تھوڑی سی تبدیلی ہوئی تو وہ پھر چل پڑے۔ یہاں تک کہ سورج ڈوبنے لگا اور شام کے سائے پھیلنے لگے۔ پہاڑی چٹانوں کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ لگتا تھا ساری دنیا ویران ہوگئی ہو اور پوری دنیا میں ایک ہی انسان زندہ رہ گیا ہو۔ رات ہوئی وہ ایک جگہ بیٹھ گئے۔ بدن تھکن سے چور چور تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ دماغ ماؤف ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے انہیں ایک اور درخت نظر آیا جو گھنا تو نہیں تھا لیکن اس کے نیچے پناہ لی جا سکتی تھی۔ بے جان بھوری چٹانوں میں اس وقت درخت کا نظر آ جانا ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی زندہ انسان نظر آ گیا ہو۔

''یہ کیسی لایعنی باتیں سنا رہی ہیں دادی اماں......!'' حسینہ نے منہ بنایا۔

درمیان میں ٹوکتے نہیں ہیں بیٹی۔ اس قصے کو اگر چھیڑ ہی لیا ہے تو اب سکون سے سنو۔ وہ درخت کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور اپنا سر گھٹنوں میں دبا لیا۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دفعتاً انہیں آہٹ محسوس ہوئی اور انہوں نے چونک کر سر اٹھایا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ دوسرے ہی لمحے ان کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ عقبی سمت میں کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ایک پتھر پر کوئی آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا لیکن چونکہ رات ہوگئی تھی اس لئے آدمی کے نقوش واضح نظر نہیں آ رہے تھے۔ البتہ یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی انسان ہے۔ پردادا جی جلدی سے اٹھے اور اس کے پاس پہنچ گئے۔ نزدیک پہنچتے ہی ان کے چودہ طبق روشن ہو گئے اور بوکھلا کر بولے۔

جج......جی......ج یہ جوگی دینا پرشاد۔ وہ اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

''مم، مہاراج، جوگی مہاراج!''

''ہاں ہاں بیٹھ جا، بیٹھ جا۔'' دینا پرشاد کی آواز کچھ عجیب لگ رہی تھی۔

''مم میں......میں......میں سخت بھوکا پیاسا ہوں۔''

''ہاں ہاں، میں دیتا ہوں تجھے کھانے پینے کے لیے۔'' دینا پرشاد نے کہا اور ایک تھیلے میں سے بہت سی کھانے پینے کی چیزیں نکال کر پردادا جی کے سامنے رکھ دیں۔ کھا پی کر حواس ان کے حواس ٹھکانے آئے تو انہوں نے حیرت سے جوگی دینا پرشاد کو دیکھا اور بولے۔

''مہاراج! جوگی مہاراج! یہ سب کیا ہے؟ خدا کے لیے مجھے بتایئے تو سہی۔ یہ سب کیا ہے؟'' جواب میں دینا پرشاد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہاں میں نے تمہیں جیون کے دونوں رُخ دکھائے ہیں۔ چین اور آرام والا، اور دوسرا مصیبتوں اور تکلیفوں سے بھرا۔ بتاؤ ان میں سے کون سا رُخ پسند کرو گے تم؟''

''یہ تو آپ خود بھی سوچ سکتے ہیں دینا پرشاد جی۔ ویسے گزرے ہوئے دن کی بات ہی کیا تھی۔''

''اب فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔''

''کک کیسا فیصلہ؟'' پردادا جی کی سمجھ میں جیسے کچھ نہیں آیا تھا۔

''تم وہ شہزادوں جیسا جیون گزارنا چاہتے ہو جس میں خوبصورت کنیائیں تمہاری رات دن خدمت کریں یا آج کے دن جیسا؟''

''دینا پرشاد جی میں کل کے دن جیسی ساری زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔''

''وہی جیون مل جائے گا تمہیں۔ تم چنتا مت کرو۔ چونکہ تم نے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا ہے اس لیے آگے جو کچھ ہوگا وہ میری منشا سے ہوگا۔ چلو سو جاؤ۔ آرام کرو، پیٹ بھر گیا ہے۔ اب بدن آرام مانگ رہا ہوگا......'' پردادا جی نے تعمیل کی اور لیٹ گئے......اس نے بدن ڈھیلا کر دیا تھا۔ نیند آنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ جس وقت آنکھ کھلی تو لگتا تھا جیسے تھوڑی ہی دیر کے بعد جاگ گئے ہوں۔ جو جگہ نظر آ رہی تھی اُسے دیکھ کر پتہ چل رہا تھا کہ پھر کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے اچھی خاصی عمارت تھی جو تاروں کی مدھم روشنی میں بے حد بھیانک نظر آ رہی تھی۔ عمارت جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر جوگی دینا پرشاد بیٹھا تھا۔ پردادا جی کو جاگتے دیکھ کر بولا۔

''آ اب اُٹھ جا!'' پردادا جی اس طرح اُٹھ کھڑے ہوئے جیسے اس آواز سے ان کے بدن کے تار بندھے ہوں۔ دینا پرشاد انہیں ساتھ لیے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک چبوترا تھا جو بہت دور دور تک پھیلا تھا اس کے دونوں طرف دَر بنے ہوئے تھے۔ سامنے کا حصہ ایک بڑے در کی شکل میں تھا جس کے نیچے ایک وسیع دالان تھا اور دالان کے اندر تین چھوٹے چھوٹے دروازے نظر آ رہے تھے۔ دینا پرشاد ایک جگہ پہنچا اور پھر بولا۔

''آ ادھر بیٹھ جا۔'' پردادا جی سہمے ہوئے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے والدین نے انہیں کس دلدل میں پھینک دیا ہے۔ وقت کا بھی صحیح اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ کالی دیواروں والی یہ دیوہیکل عمارت دل پر ایک عجیب سا خوف طاری کر رہی تھی۔ بھیانک ماحول، ہُو کا عالم، چاند چھپا ہوا بس ستارے ٹمٹما رہے تھے اور ان کی مدھم روشنی میں یہ بھیانک عمارت کسی دیو کی مانند منہ پھاڑے کھڑی تھی، وہ جس در کے پاس تھے اس کے پیچھے چھوٹی سی راہ داری تھی جو گرد و غبار اور چھوٹے موٹے پتھروں سے اَٹی ہوئی تھی البتہ چبوترا بڑا شفاف تھا۔ جوگی دینا پرشاد کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نظر آ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''اگر تُو نے میری ہر بات مانی لی تو تُو سمجھ لے کہ سارا سنسار تیرے چرنوں میں ہو گا۔ مجھے تجھ سے بہت سے کام لینے ہیں۔ وقت تجھے بتاتا رہے گا کہ تجھے آگے کیا کرنا ہے۔'' پردادا جی جوگی دینا پرشاد کی باتیں خاموشی سے سنتے رہے۔ آخر وہ بولا۔

''کیا سوچ رہا ہے رے؟''

''میں سوچ رہا ہوں مہاراج کہ یہ وقت کون سا ہے؟'' پردادا جی نے کہا اور جوگی دینا پرشاد ہنسنے لگا پھر بولا۔

''ہم جہاں ہیں وہاں سمے کا کوئی ستھان نہیں ہوتا۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''سمجھ جائے گا، چل آ میرے ساتھ۔'' دینا پرشاد بولا اور پھر انہیں اپنے ساتھ لے کر بڑے در میں داخل ہو گیا۔ دونوں ایک بڑے ہال میں پہنچے جہاں منظر عجیب و غریب تھا۔ وہاں گہری تاریکی چھائی تھی لیکن چھت کے ایک سوراخ سے نیلی روشنی اندر آ رہی تھی۔ یہ روشنی ہاتھی دانت کے بنے ایک قدِ آدم مجسمہ پر پڑ رہی تھی۔ مجسمہ اس قدر ہیبت ناک تھا کہ دیکھ کر پردادا جی کے دل کی دھڑکنیں بند ہونے لگیں۔ دینا پرشاد نے اچانک ان کا بازو پکڑ لیا۔ پردادا جی کو اپنے قدموں کے قریب سرسراہٹ محسوس ہوئی اور ساتھ ہی ایک خوفناک پھنکار سنائی دی۔ پردادا جی سہم گئے۔ روشنی جو اندر آ رہی تھی اسی میں پردادا جی نے ایک خطرناک ناگ دیکھا۔ ناگ نے ایک بار پھر پھنکار ماری اور پردادا جی کے سامنے آ کھڑا

ہوا۔ دینا پرشاد نے دونوں ہاتھ جوڑے اور ناگ کے سامنے بیٹھتے ہوا بولا۔

"جے ناگ دیوتا مہاراج!" ناگ خاموشی سے جھومتا رہا اور اس کے بعد اس نے اپنا رُخ بدل لیا۔ وہ اس مجسمے کے پیروں کے پاس پہنچ گیا۔ پردادا جی کی نظریں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا، مجسمے کے قدموں میں انسانی کھوپڑیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ بدن کی دوسری ہڈیاں موجود نہیں تھیں۔ اس وقت دینا پرشاد کی آواز اُبھری۔

"جے مہادیوی، جے مہا دیوی کالی کال کو ڈھائے دشمن کا کلیجا کاٹ کے لائے تب کالی کہلائے۔ تیرے چرنوں میں ایک اور بلی دے رہا ہوں۔ ایک اور بلی دے رہا ہوں میں......" دینا پرشاد نے ایک ہاتھ فضا میں بلند کیا دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں ایک چوڑا کھانڈا آ گیا اس نے خونخوار نگاہوں سے پردادا جی کو دیکھا اور بولا۔

"تو کیا سمجھتا ہے پاگل میں نے تجھے ایسے ہی خریدا تھا، تجھے شہزادوں والی وہ زندگی پسند ہے نا جو میں نے تجھے دکھائی تھی۔"

"ہاں مہاراج! پر یہ سب کچھ......؟" پردادا جی نے کچھ کہنا چاہا لیکن جوگی دینا پرشاد نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

"اس وقت تو جس دیوی کے چرنوں میں ہے اس کے سامنے کچھ کہنا ٹھیک نہیں ہو گا۔" دینا پرشاد پھر پردادا جی کو وہاں چھوڑ کر مجسمے کے پیچھے پہنچ گیا وہاں نجانے کیا کیا کرتا رہا کیونکہ پیچھے کا منظر تاریکی کی وجہ سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ جب واپس آیا تو کچھ چیزیں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھا۔ مجسمے کے قدموں میں پہنچ کر اُس نے ان کھوپڑیوں کو پیچھے ہٹانا شروع کر دیا اور زمین کی صفائی کرنے لگا۔ کھوپڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ ماحول کو بے حد ہیبت ناک بنا رہی تھی۔ پھر شاید اس کا کام ختم ہو گیا۔ مجسمے کے قدموں میں لوہے کے دو بڑے بڑے حلقے نظر آ رہے تھے وہ حلقے اس نے صاف کر کے نکال لیے ان حلقوں میں زنجیریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بولا۔

"تُو جانتا ہے مہان دیوی کے چرنوں میں بلی کیسے دی جاتی ہے؟"

"نہیں۔" پردادا جی نے معصومیت سے کہا۔

"میں تجھے بتاتا ہوں ذرا اِدھر آ کے لیٹ......"

''مم میں...... میں ان کھوپڑیوں کے ساتھ لیٹ جاؤں۔''

''ارے پاگل کسی زمانے میں یہ بھی تیرے جیسے ہی تھے چل آ لیٹ جا۔'' اس بار دینا پرشاد کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ پردادا جی آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور اس خوفناک جگہ زمین پر لیٹ گئے۔ کھوپڑیوں کا ڈھیر ان سے صرف ایک گز کے فاصلے پر تھا۔ جب وہ لیٹ گئے تو دینا پرشاد نے لوہے کے ان کڑوں میں پڑی ہوئی زنجیریں اُٹھائیں اور ان کے حلقے پردادا جی کی کلائیوں میں باندھنے لگا۔

''یہ یہ کیا کر رہے ہیں؟ مہاراج!''

''پاگل بولتے نہیں ہیں۔'' دینا پرشاد سرد مہری سے بولا۔

''نہیں دینا پرشاد جی!''

''کیا نہیں......؟''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''ڈرتے نہیں ہیں۔'' دینا پرشاد نہایت اطمینان سے بولا۔ اور مجسمے کے عقب میں رکھا ہوا کھانڈا اُٹھا لایا۔ پردادا جی کو صورتحال کا حتمی طور پر اندازہ ہونے لگا تھا۔ انہیں محسوس ہونے لگا تھا کہ دینا پرشاد اب کوئی ایسا عمل کرنا چاہتا ہے جو ان سے ان کی زندگی چھین لے گا چنانچہ وہ ان کڑوں سے نکلنے کے لیے زور لگانے لگے۔ ان کے حلق سے دہشت ناک چیخیں نکل رہی تھیں۔ دینا پرشاد کھانڈا گھماتا اور ساتھ ساتھ اشلوک پڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے رقص کے انداز میں کودنا شروع کر دیا۔ اس کے آس پاس پڑی ہوئی کھوپڑیاں آہستہ آہستہ ہنسنے لگیں۔ ہر طرف مردانہ، زنانہ، بچگانہ قہقہے اُبھر رہے تھے پردادا جی کا پتہ پانی ہو رہا تھا۔ وہ دہشت زدہ تھے کہ شاید زندگی کی انتہا یہی تھی۔ ان کے ماں باپ نے انہیں دینا پرشاد کے ہاتھ بیچ دیا اور اب دینا پرشاد ان کی زندگی چھیننے والا ہے۔ وہ کالی دیوی کا پجاری ہے اور اپنے کسی گندے مقصد کے لیے انسانوں کی بلی دے رہا ہے۔ دفعتاً رقص رُک گیا دینا پرشاد کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کھانڈا بلند کیا پردادا جی کے منہ سے ایک فلک شگاف چیخ بلند ہوئی مگر جیسے ہی دینا پرشاد نے کھانڈا نیچے جھکانے کی کوشش کی کچھ لوگ اس ہال میں گھس آئے۔ سب سے آگے ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا جس کی داڑھی سینے

تک پھیلی ہوئی تھی۔ سر پر صافہ بندھا اور بدن پر لمبا چغہ تھا۔ اس کی کڑکدار آواز اُبھری۔

''رُک جا کتے!'' جوگی دینا پرشاد نے مڑ کر دیکھا۔ لمبے شخص کے پیچھے چار پانچ افراد اور بھی تھے جو چہروں سے عجیب لگ رہے تھے۔ آگے والے شخص نے پھر کڑکدار آواز میں کہا۔

''جوگی تُو ایک انسان کی جان لے رہا ہے۔''

''تُو کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟'' دینا پرشاد نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تجھے بتادوں کہ میں کون ہوں تو تیری جان ہی نکل جائے گی۔''

''ارے جا جا تُو کیا بگاڑ لے گا میرا۔ تُو ہے کیا چیز؟ جا بھاگ چل یہاں سے۔ میں اس مسلمان لڑکے کی بلّی دے رہا ہوں کالی دیوی کو کیا سمجھے!''

''اور میں تیری بلّی دیئے دیتا ہوں۔'' قوی ہیکل شخص نے کہا اور دینا پرشاد کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اس نے خونخوار نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا اور بولا۔

''اگر تیری موت بھی آ گئی ہے تو یونہی سہی۔'' یہ کہہ کر اس نے کھانڈا گھمایا اور لمبے شخص کے سینے پر بھرپور وار کیا لیکن لمبے شخص نے ہاتھ آگے بڑھا کر کھانڈے کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ تیز دھار سے اس کا ہاتھ کٹ جانا چاہیے تھا۔ لیکن نہیں اُس نے اُسے بڑی آسانی سے پکڑا اور جھٹکا دیا۔ دینا پرشاد منہ کے بل نیچے آ گرا۔ قوی ہیکل شخص نے کھانڈا ایک طرف اُچھال دیا۔ پھر اس نے دینا پرشاد کو پکڑ کر کھڑا کر لیا۔

''جو لوگ کالا جادو کرتے ہیں ان کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ میں انسانوں کی جان لینے سے گریز کرتا ہوں تم گواہ رہنا لڑکو! میں اس کی جان اس لیے نہیں لے رہا کہ میری اس سے کوئی دشمنی ہے بلکہ اس کو اس لیے موت کے گھاٹ اُتار رہا ہوں کہ یہ کالا جادو کرنے والا ہے اس کا ختم ہو جانا بہت ضروری ہے کیونکہ نہ جانے اس کے بعد یہ کتنے اور نسانوں کو نقصان پہنچائے گا۔ یہ کہہ کر اُس شخص نے دینا پرشاد کو اس طرح اُٹھایا جیسے وہ کوئی چھوٹا سا کھلونا ہو اور پھر اس کو کالی کے مجسمے پر دے مارا۔ دینا پرشاد کے حلق سے ایک دلدوز نیخ نکلی۔ اس کی کھوپڑی اور بدن کی بہت سی ہڈیاں پاش پاش ہوگئیں۔ مجسمے سے ٹکرا کر وہ نیچے گرا اور مرغِ بسمل کی مانند تڑپنے لگا۔ کھوپڑیاں اس کے بدن سے ٹکرا ٹکرا کر کھڑکھڑانے

لگیں جیسے مل کر ہنس رہی ہوں۔ دینا پرشاد دیر تک تڑپتا رہا اور پھر ساکت ہو گیا۔ وہ اپنی تمام خباثتوں سمیت جہنم واصل ہو چکا تھا۔ اب وہ شخص آگے بڑھا۔ اس نے بغور پردادا کو دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر وہ لوہے کے وہ کڑے جو آسانی سے نہیں کھولے جا سکتے تھے اس نے ان کے منہ کھول کر انہیں سیدھا کر دیا۔ پردادا جی جلدی سے اُٹھ گئے اور زار و قطار رونے لگے تب قوی ہیکل شخص نے کہا۔

''بیٹے روتے نہیں، کیا تم مسلمان ہو؟''

''جی۔''

''اس کے ہتھے کہاں سے چڑھ گئے؟''

''میرے ماں باپ نے غربت کے باعث مجھے اس کے ہاتھوں بیچ دیا تھا۔''

قوی ہیکل شخص کے منہ سے چچ چچ کی آواز نکلی اور وہ ساتھیوں سے کہنے لگا۔

''چلو اسے ساتھ لے چلو۔''

''جی نانا سرکار!'' ساتھیوں میں سے ایک شخص نے کہا۔ تب پردادا جی کو اس مہربان کا نام معلوم ہوا جس نے عین وقت پر ان کی زندگی بچالی تھی وہ لوگ اس منحوس عمارت سے باہر نکل آئے۔ نانا سرکار نے ان کا ہاتھ پکڑا تو اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی ان کے پاؤں زمین سے اُٹھ گئے اور وہ تیزی سے فضا میں تیرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی تیز رفتار گاڑی میں بیٹھے ہیں اور نیچے زمین دوڑ رہی ہو۔ یہ عجیب و غریب سفر اور یہ نظر نہ آنے والی سواری پردادا جی کے لیے بڑی عجیب تھی لیکن وہ جان چکے تھے کہ اب وہ کسی نئی دنیا کی طرف جا رہے ہیں۔

☆......☆......☆

جہاں یہ سفر ختم ہوا وہاں چاروں طرف پہاڑوں کی دیواریں کھڑی تھیں اور پہاڑی دیواروں کے درمیان ایک انوکھی بستی آباد تھی۔ بستی کے مکان عجیب طرز کے تھے۔ مینار کی مانند۔ چار چار پانچ پانچ فٹ اونچے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس جگہ کو خوبصورت بنانے کے لیے اس طرح کے مینار کھڑے کر دیئے گئے ہوں۔ ان میناروں میں طاق بنے تھے اور ان طاقوں سے روشنی آ رہی تھی کچھ اور قریب پہنچے تو ان میناروں میں دروازے بنے دکھائی دیئے۔ پردادا جی حیرت کی تصویر بنے ہوئے تھے تاہم انھوں نے کوئی سوال نہ کیا۔ زمین پر پاؤں رکھتے ہی نانا سرکار نے اپنے ساتھ آنے والوں میں سے ایک سے کہا۔

''اسے لے جاؤ اور اس کے آرام و آسائش کا بندوبست کرو۔ ہماری نگری میں یہ پہلا مہمان ہے جو......'' نانا سرکار نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پردادا جی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کچھ بات کرتے، انہیں تو ابھی تک یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ان کی زندگی بچ گئی ہے۔ ایک مینار کے سامنے پہنچ کر وہ شخص جو ان کی ڈیوٹی پر مامور کیا گیا تھا ان کی طرف رُخ کر کے بولا۔

''آؤ۔ جُھک کر آنا ہو گا آگے سیڑھیاں ہیں۔'' اور پردادا جی نے مینار نما مکان کے چھوٹے سے دروازے کے اندر قدم رکھ دیا۔ چھوٹی چھوٹی کئی سیڑھیاں نیچے چلی گئی تھیں سیڑھیوں کے اختتام پر کشادہ جگہ تھی جس کے چھت میں کئی فانوس لٹک رہے تھے جن میں سے روشنی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ اندر کا ماحول بہت ہی خوبصورت اور قابلِ دید تھا وہ اس میں کھو گئے۔ تب اُس شخص نے کہا۔

''حیران ہونے کی کوئی بات نہیں یہ جگہ تمہارے لیے ہے تمہیں یہیں رہنا ہو گا۔ تمہارے آرام و آسائش کی ساری چیزیں یہیں پہنچ جائیں گی ہاں ایک بات یاد رکھنا۔ جب تک نانا سرکار دوسرا حکم نہ دیں تم یہاں سے باہر نہیں نکلو گے۔'' یہ کہہ کر وہ شخص چلا گیا۔ پردادا

جی ابھی تک حیرت زدہ تو تھے لیکن جو کچھ ان پر بیتی تھی اور جس طرح جان جانے لگی تھی اس کے بعد دوبارہ زندگی مل جانا ان کے لیے خوشی کی بات تھی۔ لہٰذا اُنہوں نے یہاں خاموشی سے وقت گزارنے کا فیصلہ کرلیا اور خود کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ تیسرے دن انہیں یہاں سے باہر لے جایا گیا۔ تب دن کی روشنی میں انہوں نے یہاں کا ماحول دیکھا۔ لوگ چل پھر رہے تھے۔ سبھی نے سفید لبادے پہن رکھے تھے ہر عمر کے لوگ لمبی داڑھیوں والے تھے۔ نہ کوئی بازار تھا نہ کوئی اور سلسلہ لوگ شاید بے مقصد ہی اِدھراُدھر آ جا رہے تھے۔ پھر پردادا جی جس جگہ پہنچے وہاں ایک مجلس لگی ہوئی تھی۔ مجلس میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ سامنے ایک چوکی پر نانا سرکار براجمان تھے۔ پردادا جی کو نانا سرکار کے برابر میں جگہ دی گئی۔ نانا سرکار نے انہیں اپنے پاس بٹھا کر پوچھا۔

"کہو تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں جناب! میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔ آپ نے میری جان بچائی ہے لیکن یہ جگہ میرے لیے بڑی حیران کن ہے۔"

"بیٹے! تمہارا نام مہابت خان ہے نا؟"

"جی۔ نانا سرکار"

"مہابت خان! ہم سب آتش زادے ہیں اور یہ ہماری آبادی ہے جنات نگری۔" پردادا جی کو اب یہاں کا پراسرار ماحول سمجھ آنے لگا تھا جو کہ انسانی آبادیوں سے قطعی مختلف تھا۔ نانا سرکار نے کہا۔

"باہر کی دنیا تمہارے لیے سازگار نہیں تمہارے لیے وہاں بہت سی پریشانیاں ہیں تم یہاں کچھ عرصہ رہو گے اور یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

"جیسا آپ کا حکم نانا سرکار!"

اس کے بعد پردادا جی جنوں کی اس نگری میں مکمل آزادی سے رہنے لگے۔ ایک دن وہ اس آبادی کے مشرقی حصے میں جا نکلے جہاں ایک خوبصورت باغ تھا۔ وہاں ان کی ملاقات گلشار سے ہوئی۔ گلشار ایک جن زادی تھی بہت ہی خوبصورت اور معصوم فطرت۔ اسے دیکھ کر پردادا جی کے ہوش گم ہو گئے۔ اتنا خوبصورت چہرہ انہوں نے زندگی میں اس سے قبل

کبھی نہ دیکھا تھا۔ پردادا جی اس وقت اس معصوم صورت کا منی سی مورت کو دل دے بیٹھے۔

حسینہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ دادی اماں کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''تُو ہنسی کیوں لڑکی؟''

''کچھ نہیں دادی ویسے ہی میں سوچ رہی تھی کہ پردادا حضور بھی رنگین طبیعت کے مالک تھے۔''

''بندر کھ منہ...... بدتمیز کہیں کی......'' دادی اماں مصنوعی غصے سے بولیں۔ حسینہ دوپٹہ منہ میں ٹھونس کر ہنسنے لگی۔

دادی اماں نے اپنا بیان پھر شروع کر دیا۔

''وہ پردادا جی کو دیکھ کر بڑے تپاک سے ملی۔ اور کہنے لگی۔ 'میں نے سنا تھا کہ ایک آدم زاد ہماری بستی میں آیا ہے اس کے بارے میں طرح طرح کی داستانیں بھی مشہور ہیں۔ اگر تم وہی ہو تو تم تو بہت پیارے ہو۔' پردادا جی کو گلشار بہت پسند آئی۔ وہ بھی انہیں پسند کرنے لگی۔ دونوں ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے۔ ان کی ملاقاتیں ہونے لگیں اور وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے بے چین رہنے لگے۔ ایک دن دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لیا گیا اور جنوں کی نگری میں جیسے بھونچال آ گیا۔ گلشار کے والد نے دونوں کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا لیکن عین وقت پر نانا سرکار کو سب معلوم ہو گیا اور انہوں نے گلشار کے باپ کو سمجھایا اور معاملہ جنوں کی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ عدالت میں بزرگ وکیل صفائی جن نے کہا۔

''جب جن انسان زادیوں پر عاشق ہو جاتے ہیں اور نہ صرف ان کا، بلکہ ان کے اہلِ خانہ کا جینا حرام کر دیتے ہیں تو انسانوں کی نگری میں ان کے خلاف کیا کارروائی ہوتی ہے؟''

جواب میں وکیل استغاثہ جن نے کہا۔

''اگر ایسا کوئی واقعہ ہو جاتا ہے تو انسان عامل اس جن کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتے ہیں اور بعض اوقات جن ہلاک بھی ہو جاتے ہیں۔''

وکیل صفائی نے کہا۔ ''ایسا بہت کم ہوتا ہے جنوں کی طاقت انسانوں سے زیادہ ہوتی ہے ایسے واقعات نہ ہونے کے برابر ہیں۔''

بہرحال کافی بحث و تکرار کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ گلشار کو مہابت خان کے ساتھ

جنوں کی بستی سے نکال دیا جائے۔ اس فیصلے کی سب سے بڑی مخالفت جن ہزار جان نے کی۔ وہ گلشار کو چاہتا تھا اس نے آگے بڑھ کر کہا۔

''یہ آپ کیسا انصاف کر رہے ہیں نانا سرکار! آپ کو معلوم ہے کہ گلشار میری محبت ہے۔ مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ اس سے میری شادی ہو جائے گی۔ میں اسی اُمید پر زندگی گزار رہا ہوں کہ آنے والے وقت میں وہ میری شریک زندگی ہوگی۔ آپ کا یہ فیصلہ مجھے منظور نہیں۔ میں گلشار کو پسند کرتا ہوں اور اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔''

اس بات پر بہت سے جنوں نے اعتراض کیا اور ہزار جان سے پوچھا۔

''ہزار جان! کیا تم کسی ایسی لڑکی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہو جو کسی انسان سے محبت کرتی ہو؟''

ہزار جان بولا۔ ''کیا انسان خوشی سے اپنی بیٹیاں جنوں کے حوالے کر دیتے ہیں ہرگز نہیں۔ وہ کیسے کیسے عالموں سے رجوع کر کے جنوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے بے شمار واقعات ہیں کہ انسانوں نے عالموں کے ذریعے جنوں کو ہلاک کرا دیا۔ خود میرا ایک بھائی ایک انسان زادی کی محبت میں گرفتار ہو کر نہ جانے کیسی کیسی منزلوں سے گزرا۔ پھر ایک عالم نے اپنا عمل کر کے اس پر قابو پا لیا اور اسے ہلاک کر دیا آپ خود بتایئے نانا سرکار! کیا میں گلشار کو اس طرح چھوڑ سکتا ہوں۔''

نانا سرکار نے دوسرے جنوں کی جانب دیکھا اور بولے۔

''یہ غداری پر مائل ہو رہا ہے۔ میرے حکم پر اپنی ذات کو فوقیت دے رہا ہے، کیا یہ مناسب ہے؟''

سب نے اس بات پر انکار میں سر ہلایا۔

''تو پھر اس کو سمجھاؤ کہ جو فیصلہ میں نے کیا ہے اس پر عمل درآمد ہونے دیا جائے۔''

یہ کہنے کے بعد نانا سرکار اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے جس کا مطلب تھا کہ عدالت برخاست سمجھی جائے۔ ہزار جان اس وقت خاموش ہو گیا لیکن وہ ایک کینہ پرور جن تھا۔ پردادا جی کو گلشار کے ساتھ وہاں سے رخصت کر دیا گیا۔ حالانکہ جنوں کی نگری میں انہیں جس عزت واحترام سے نوازا گیا تھا اور جس طرح نانا سرکار نے دینا پرشاد سے ان کی زندگی بچائی تھی

اس کے بعد پردادا جی کا دل تو نہیں چاہتا تھا کہ ان محبت کرنے والے جنات سے دور جائیں لیکن گلشار کی محبت نے انہیں اس پر مجبور کر دیا تھا۔ گلشار بھی اپنی آبادی کو چھوڑنے پر زار و قطار روتی رہی اور پردادا جی اسے تسلیاں دیتے رہے۔ انہوں نے کہا۔

''انسانوں کی بستی اتنی بُری نہیں ہوتی وہاں محبت کرنے والے لوگ بھی ملتے ہیں۔ میں تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔''

وہ سفر کرتے رہے جنوں کی اس آبادی سے دور انہیں کسی ایسی آبادی کی تلاش تھی جہاں وہ گلشار کے ساتھ قیام کر سکیں۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ہزار جان پرواز کرتا ہوا ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ گلشار کے بچپن کا منگیتر تھا اور اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ پردادا جی کو ہزار جان کے تعاقب کا تو علم نہ تھا لیکن وہ اُس سے خطرہ ضرور محسوس کرتے تھے۔ آخرکار انہیں ایک رات یہیں بارہ برجی میں قیام کرنا پڑا۔ کیا تم اس بات پر یقین کرو گی کہ وہ کمرہ جہاں تالا لگا ہوا ہے اور جسے تم حیرت کی نگاہ سے دیکھتی ہو یہ پہلا کمرہ ہے جو مہابت خان نے اپنے اور گلشار کے لیے بنایا تھا۔ ہزار جان نے پردادا اور گلشار پر پہلا وار کرنے کے لیے یہ جگہ مناسب سمجھی اور اپنی تمام تر خباثتوں سمیت ان پر حملہ آور ہوا۔ دادی اماں بیان جاری رکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

''مہابت خان تو انسان تھے، جن کا مقابلہ کیا کرتے البتہ گلشار نے ایسی بہادری سے ہزار جان کا مقابلہ کیا کہ اسے کو بھاگتے ہی بنی۔

پردادا جی سمجھ گئے کہ ہزار جان سے بچنے کے لیے انسانوں کی آبادی میں رہنا بہت ضروری ہے۔ انہیں یہاں قریب ہی خانہ بدوشوں کا ایک قبیلہ مل گیا جو بارہ برجی میں ہی خیمے لگائے ہوئے تھا۔ ان لوگوں نے مہابت خان کو خوش آمدید کہا اور دونوں ان میں رچ بس گئے۔ وہ قبیلہ یہیں آباد ہو گیا تو پردادا جی نے گلشار کے لیے یہ خوبصورت حویلی بنائی جس کا نام آشیانہ رکھا۔ اور دونوں اس حویلی میں رہنے لگے۔ یہ کمرہ یادگار کے طور پر ایک احاطہ بنا کر چھوڑ دیا گیا۔ سنا ہے کہ بعد میں ہزار جان آ کر اس کمرے میں آباد ہو گیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ گلشار کو نہیں چھوڑے گا۔ خدا جانے کب تک پردادا جی اور گلشار اس حویلی میں رہے۔ حویلی سے متعلق بے شمار داستانیں مشہور ہیں۔ آخرکار ہزار خان گلشار کو حویلی سے غائب

کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ پردادا جی اس وقت بہت بڑے رئیس بن چکے تھے۔ بستی کی زیادہ تر جائیداد انہی کی تھی لوگ انہیں بہت بڑا مانتے تھے۔ حویلی میں رہ کر پردادا جی نے بے شمار علوم پر دسترس حاصل کرلی تھی۔

حویلی میں چونکہ گلشار، پردادا اور ہزار جان کا معاملہ چلتا رہا تھا اس لیے یہ حویلی آسیب زدہ مشہور ہوگئی تھی۔

پرانے لوگ بتاتے تھے کہ راتوں کو حویلی سے چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ سیاہ راتوں میں اکثر عجیب شکلوں کے بڑے بڑے پرندے یہاں اُڑتے ہوئے پائے گئے۔ یہاں کوئی قیام نہیں کرتا تھا۔ ایک بات یہ بھی سنی گئی کہ ایک دن شام سے ہی بادلوں نے آسمان کو آن گھیرا اور آدھی رات تک مسلسل طوفانی بارش ہوتی رہی۔ آخر شب بادل چھٹ گئے تو چودھویں کا چاند پورے شباب کے ساتھ نمودار ہوگیا۔ اس وقت پوری حویلی سے دودھیا روشنی پھوٹنے لگی۔ روشنی سے ایک ایک اینٹ ایک ایک پیڑ کا ایک ایک پتہ روشن ہو گیا اور پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حویلی فضا میں بلند ہونے لگی۔ اٹھتے اٹھتے جب حویلی لگ بھگ زمین سے سو فٹ بلند ہوگئی تو پتہ چلا کہ اصل حویلی تو اپنی جگہ پر ہی موجود ہے اور سفید دودھیا روشنی پر مشتمل حویلی کا عکس اوپر کو اُٹھا ہوا ہے پھر دودھیا چمکدار روشنی سے بنا حویلی کا عکس آسمان کی طرف مزید بلند ہونے لگا اور پھر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس وقت حویلی خالی تھی کوئی اس میں قیام پذیر نہ تھا۔ اس دن کے بعد سے نہ حویلی سے کسی کو چیخیں سنائی دیں اور نہ ہی عجیب شکل کے پرندے اُڑتے پائے گئے۔ آہستہ آہستہ لوگوں کا خوف معدوم ہوا تو ہمارے دادا نواب معراج الدین نے اپنے خاندان کے ہمراہ یہاں قیام کرلیا اب تو بیٹا گذشتہ ساٹھ ستر سالوں سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ مکمل امن وسکون ہے۔ بلکہ اب تو کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ یہ سب کچھ کوئی من گھڑت افسانہ ہے۔ البتہ آج تک کبھی بھی اس کمرے کو نہیں کھولا گیا جہاں ہزار جان کا بسیرا تھا۔

اب تمہیں اس کمرے کے بارے میں معلوم ہوگیا ہوگا، غالباً پردادا جی نے دادا جی کو یہ اطلاع دی ہوگی کہ اس حویلی میں آنے کے بعد بھی اس کمرے کو کبھی نہ کھولا جائے۔"

"ایک بات تو بتایئے دادی اماں! کیا دادا جی اس جن زادی گلشار کی اولاد تھے؟"

''ارے نہیں یہ تو میں تمہیں بتانا بھول گئی۔گلشار کے جانے کے بعد پردادا جی نے ایک دوسری خاتون سے شادی کرلی۔ پتہ نہیں پردادا جی ان خاتون سے کیسے متاثر ہوئے تھے ان کا نام مرینہ بیگم تھا۔ ہمارے دادا مرینہ بیگم کی اولاد تھے۔گلشار کا تو اس کے بعد پتہ ہی نہیں چل سکا۔'' حسینہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ دادی اماں نے اسے جو کہانی سنائی تھی اس نے اس کے ہوش وحواس چھین لیے تھے۔ وہ کمرہ اس کی نگاہ میں اور بھی زیادہ پراسرار ہو گیا تھا۔ دفعتاً اُس نے چونک کر کہا۔

''مگر ایک بات بتایئے دادی یہ اماں اتنی پرانی باتیں ہیں کہ آپ یقین بھی نہیں کر سکتیں پھر آپ کو یہ اتنی تفصیل سے کیسے معلوم ہوئیں؟'' دادی اماں مسکرائیں اور بولیں۔

''اچھا سوال کیا ہے تم نے ٹھہرو میں تمہیں کچھ دکھاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھیں انہوں نے اپنے کمرے میں ٹین کا ایک بہت پرانا صندوق رکھا ہوا تھا انہوں نے اس صندوق کا تالا کھولا اور اس میں کچھ تلاش کرنے لگیں۔ پھر انہوں نے بڑی احتیاط سے ایک بوسیدہ کتاب نکالی۔ یہ ہاتھ سے لکھی ہوئی کوئی بہت ہی قدیم کتاب تھی جس کے اوراق بوسیدہ تھے اور ان کا رنگ بھی بدل چکا تھا۔ اس کے اوپری حصے پر ''آشیانہ'' لکھا تھا۔ دادی اماں نے یہ کتاب کھول کر حسینہ کے سامنے کر دی اور بولیں۔

''گلشار کی گمشدگی کے بعد انہوں نے اس کی تلاش کے لیے جانے کیا کیا جتن کیئے پر وہ نہ ملنا تھی نہ ملی۔ پردادا جی نے تب اپنی زندگی کے واقعات پر مشتمل یہ آپ بیتی لکھی اور اسے ایک قلمی نسخے کی حیثیت سے محفوظ کر دیا اس کتاب میں ساری کہانی درج ہے۔''

''اوہ۔'' حسینہ نے ایک گہری سانس لی اور حیرت انگیز واقعات میں کھو گئی۔ گویا پراسرار زندگی کا یہ سلسلہ خاندانی وراثت تھا جو اس تک پہنچ گیا۔

☆......☆......☆

اسلاف کی داستان سننے کے بعد حسینہ کی کیفیت میں نمایاں تبدیلی رونما ہوگئی۔اب وہ گم صم اور کھوئی کھوئی رہتی تھی۔اس کی شوخ وشنگ طبیعت یکسر سنجیدہ اور پرسکون ہوگئی تھی۔مونا سے بھی وہ کوئی خاص بات نہیں کرتی تھی۔پچھلے دنوں ہونے والے عجیب واقعات کورونما ہوئے کئی دن گزر چکے تھے۔مونا خود بھی حسینہ کے گھر نہیں آجارہی تھی۔اس دن وہ آئی اور بولی۔

''حسینہ اب تو تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔کالج کی سب لڑکیاں تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔'' حسینہ نے بوجھل نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولی۔

''میں کالج نہیں جاسکتی۔''

''کیوں؟'' مونا نے حیرانی سے پوچھا۔

''وہ منع کرتا ہے۔'' حسینہ نے جیسے خود کو جواب دیا۔

''کون؟''

''وہی''

''جناب عالی! اس وہی کے بارے میں آپ ہمیں بھی بتا دیجئے کون ہے وہ؟''

''ایں؟'' حسینہ ہونقوں کی طرح مونا کو دیکھنے لگی اور بولی۔

''کون؟ کس کی بات کررہی ہو......؟''

''کالج جاؤ گی کہ نہیں......؟''

''نہیں میں نہیں جاؤں گی۔تم جاؤ۔'' حسینہ نے کہا۔

''آخر کیوں؟'' مونا نے ضد کی تو حسینہ کے چہرے پر رونے کے آثار اُبھر آئے اور پھر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔مونا گھبرا گئی۔بمشکل تمام اُسے چُپ کرایا۔گھر کے سارے لوگ غمزدہ تھے۔عمران تو بالکل مرجھا گیا تھا۔پریشانیوں نے گھر میں بسیرا کرلیا تھا اور کسی کی

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟ ایک دن دادی اماں کہنے لگیں۔

''بہو ایک بات کہوں بُرا مت ماننا میرے دل میں آئی ہے تو کہہ رہی ہوں۔ بچی کی وجہ سے پریشان ہوں۔''

''کیا بات ہے اماں؟ ایسی کون سی بات ہے جو آپ مجھ سے کہتے ہوئے جھجک رہی ہیں؟''

''بہو! شاہدہ بیگم کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''شاہدہ بھابھی۔''

''ہاں شاہدہ اور رفیق احمد۔''

''جی جی، کیا کہنا چاہ رہی ہیں آپ ان کے بارے میں اور آپ مجھ سے ایسے لہجے میں کیوں بات کر رہی ہیں۔ آپ سے بڑھ کر کوئی ہے میرے لیے؟''

''پھر بھی جہاں آرا! رفیق احمد تمہارے بھائی ہیں۔''

''ارے چھوڑیئے اماں جی اب رشتوں کی بھلا کیا حیثیت رہ گئی ہے۔ آپ خود دیکھیے ایک بہن اور ایک ہی بھائی۔ ایک ماں کے بطن سے جنم لیا ہم نے لیکن رفیق بھائی نے شادی کے بعد میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے کوئی بھائی اپنی بہن کے ساتھ نہیں کرسکتا۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں بیٹی۔ سوچتی ہوں کہ زبان کھولی تو تمہارا دل نہ دُکھے۔''

''نہیں اماں۔''

''بیٹی انہوں نے کمال کے لیے حسینہ کا رشتہ مانگا تھا، ایک بار۔''

''یہ بھی ان کے دل کا کھوٹ تھا اماں......! وہ جانتے ہیں کہ ان کا بیٹا کسی قابل نہیں کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ غبارے کی طرح پھول کر کپا ہو گیا ہے۔ ایک بجے تک سوتا رہتا ہے۔ رفیق بھائی کو تو شرم ہی نہ آئی کمال کے لیے میری پھول جیسی بچی کا رشتہ مانگ لیا۔ کہہ رہے تھے ''جب ذمہ داری پڑے گی تو خود ہی سدھر جائے گا۔ ارے وہ نکما کیا کرے گا جو زندگی بھر بیٹھ کر کھاتا رہا ہو۔''

''تمہارا غصہ اپنی جگہ درست ہے بیٹی! لیکن تم شاہدہ بیگم کو اچھی طرح جانتی ہو اس کی ٹونے ٹوٹکے، تعویذ گنڈوں میں عمر گزری ہے۔ میرے دل میں ایک بات آ رہی ہے، بُرا مت ماننا بیٹی! کہیں یہ شاہدہ بیگم کی کوئی کارستانی تو نہیں۔ ممکن ہے یہاں سے انکار ہو گیا تو

تعویذ گنڈوں پر اُتر آئی ہو۔ کہتے ہیں نا کہ بلی جو کھاتی نہیں لڑھکا دیتی ہے۔''

''اماں اگر ان کا ایمان خراب ہو ہی گیا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ٹھیک ہے وہ میرے بھائی، بھاوج ہیں مگر جس طرح کے وہ لوگ ہیں، آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی اپنی بچی کو جیتے جی جہنم میں تو نہیں دھکیل سکتی۔''

''بیٹا دشمن وار تو کرتا ہی ہے۔ یہ تو پتا چل گیا تھا کہ تمہارے انکار نے انہیں آگ بگولہ کر دیا ہے اب اس کے بعد وہ کچھ بھی کریں انہیں کون روک سکتا ہے۔ میری رائے ہے کہ حسینہ کو نوراں ملنگنی کے پاس لے جاؤ سائیں جیون کی ملنگنی ہے۔ لوگ ایسے کاموں کے لیے آتے جاتے بھی ہیں اس کے پاس۔''

''میرا خیال ہے ہم پروفیسر ناہید سے مشورہ کر لیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ بات کر لو ناہید سے۔''

پروفیسر ناہید، اس کی بیٹی مونا اور بیٹا عمران جہاں آرا کے گھر سے اس طرح منسلک تھے کہ دو گھروں کا تصور ہی ختم ہو گیا تھا۔ ہر تکلیف، ہر غم میں شریک اور نہ صرف شریک بلکہ ہاتھ پیروں سے بھی سب کچھ کرنے کو آمادہ، پروفیسر ناہید کو صورتحال بتائی گئی۔ حسینہ کے رشتے کی بات سن کر پروفیسر ناہید چپ ہو گئیں ان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر ٹھہر گیا۔ پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔''ہاں یہ بات تو مجھے معلوم ہے رفیق احمد صاحب نے حسینہ کے لیے رشتہ مانگا تھا اور آپ لوگوں نے انکار کر دیا۔ رشتوں کے معاملے میں کوئی زور زبردستی تو نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں ہر کسی کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔''

''لیکن...... ناہید! میرے بھائی ذرا مختلف قسم کے آدمی ہیں۔ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں بس کلرکی کی ہے زندگی بھر اور بھابی...... توبہ توبہ پوری بی جمالو ہیں۔ لگائی بجھائی تو ان پر ختم ہے۔ پرانے وقتوں کی اور اپنے گُنوں کی پوری ہیں اور بھائی صاحب ٹھہرے بیوی کے بے دام غلام۔ بڑے گھٹیا قسم کے لوگ ہیں۔ آپ اماں جان سے پوچھ لو کہ کیا وہ لڑکا حسینہ کے قابل ہے؟ میری بیٹی تو چاند کا ٹکڑا ہے۔''

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں چاند کا ٹکڑا جھولی میں نہ گرا تو اسے پانے کے لیے وہ لوگ تعویذ گنڈوں اور ٹونے ٹوٹکوں پر نہ اُتر آئے ہوں۔''

''میرا خیال ہے اماں جان کہ حسینہ کو کسی اچھے ماہر نفسیات کو دکھایا جائے۔'' پروفیسر ناہید نے رائے دی۔ اس کی بات سن کر دادی اماں اور جہاں آرا بیگم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''نہیں ناہید، حسینہ کا مسئلہ نفسیاتی نہیں۔ اس پر کسی آسیب کا سایہ لگتا ہے۔''

''کیسی باتیں کرتی ہیں اماں جان...... یہ کون سا دور ہے آسیب وسیب کا۔ ان چکروں میں نہ پڑیں۔ کسی بہترین ہاسپٹل سے اس کا علاج کروائیں۔ اس جدید سائنسی دور میں ہر چیز کا علاج ممکن ہے۔ سوائے وہم کے اور یہ آپ کا وہم ہی ہے کہ اس پر سایہ ہے۔ یہ ہسٹیریا کی علامات ہیں۔'' پروفیسر ناہید نے یقینی انداز میں کہا۔

''میں تمہارے خیال سے اختلاف نہیں کرتی ناہید۔ تم اپنی کوشش کرلو اور ہمیں بھی نہ روکو۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے نوراں ملنگنی کو دکھایا جائے۔''

''نوراں ملنگنی......'' پروفیسر ناہید نے ناک بھوں چڑھائی۔

''پتہ نہیں آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔'' پھر یہ سوچ کر کہ کہیں اماں جان بگڑ ہی نہ جائیں کیونکہ یہ ان کے گھر کا ذاتی معاملہ تھا، پروفیسر ناہید نے اپنے خیالات کو لگام دی اور نرم پڑتے ہوئے بولیں۔ ''آپ جیسا مناسب سمجھیں کرلیں۔ اگر آپ کے دل میں یہ خیال ہے کہ آپ نوراں ملنگنی کو دکھائیں تو دکھا دیجیے۔''

''یہ بات بھی ذرا پریشانی کی ہے کہ میں حسینہ کو اس کے ڈیرے پر لے جاؤں وہاں تو بہت سے لوگ آئے رہتے ہیں۔'' جہاں آرا بیگم نے فکرمند لہجے میں کہا۔

''یہ کام میں کرلوں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔'' پروفیسر ناہید کے منہ سے یہ بات سن کر دادی اماں نے حیرانی سے کہا۔

''کیا؟''

''نوراں کو یہاں لے آؤں گی۔'' پروفیسر ناہید نے دادی اماں کے چہرے پر اُبھرے سوال کو سمجھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے یہ زیادہ مناسب رہے گا۔''

☆......☆......☆

نوراں عمر رسیدہ عورت تھی۔ یتیمی میں پلی بڑھی۔ ابھی نوعمر تھی کہ ماں نے سوچے سمجھے بغیر ایک آوارہ مزاج سے شادی کر دی وہ نوخیز کلی کو مسلتا رہا۔ پھر اس کی گود میں ایک بیٹا چھوڑ کر گاؤں کی ایک اور نوعمر لڑکی لے اڑا اور آج تک نہیں پلٹا۔ اُس کی جوانی کے دن بڑی تکلیفوں میں گزرے تھے۔ بیٹا اس وقت تک بیٹا رہا جب تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد بیوی کو لے کر الگ ہو گیا اور نوراں محلے والوں کا دیا کھانے لگی۔ کوئی اور تھا ہی نہیں جو اس کی خدمت گزاری کرتا۔ پھر ایک دن دماغ میں کوئی بات سمائی۔ سائیں جیون کے مزار پر پہنچ کر خوب شور شرابہ کیا، دھمال ڈالا، سر دھنا اور مردانہ آواز میں اپنے آپ کو سائیں جیون کی ملنگنی کہنے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے واقعی کوئی مرد بول رہا ہے۔ غالباً اس آواز کی اس نے خوب مشق کی تھی۔ لوگوں کو اپنے سحر میں لانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ بہرحال نوراں ملنگنی بن گئی۔ اس نے اپنا ڈیرہ بنا لیا۔ جہاں وہ روزانہ نئے ڈرامے کرتی رہتی۔ لوگوں کو تعویذ دیتی۔ پانی لونگ، الائچیاں دم کر کے دیتی اور ہر طرح کا علاج کیا کرتی۔

اللہ تعالیٰ ہر ایک کا محافظ ہوتا ہے۔ کسی کسی کو فائدہ ہو جاتا اور معصوم لوگ سمجھتے کہ نوراں ملنگنی نے ان کا علاج کر دیا ہے۔ پروفیسر ناہید عمران کے ہمراہ مٹھائی کا ٹوکرا، دو سوٹ اور کچھ پیسے نقد لے کر پہنچ گئیں۔ بھلا ان کی آؤ بھگت نہ ہوتی تو پھر کس کی ہوتی؟ نوراں ملنگنی نے ان سے تنہائی میں ملاقات کی۔ حالانکہ اس وقت زیادہ لوگ بھی موجود نہیں تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈنڈے کو تین بار زمین پر زور سے مارا اور پھر لوبان کی ایک چٹکی اُٹھا کر آگ میں ڈال دی۔

''نوراں اسے بند کر دو۔ دھوئیں سے میرا دم گھٹتا ہے۔'' ناہید نے کہا۔

''کیا بات ہے بتاؤ مجھے؟''

''تمہیں تو سب کچھ معلوم ہونا چاہیے مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہے؟''

''ہاں ہمیں سب معلوم ہے مگر تم بتاؤ اس لیے کہ تم سوالی بن کے آئی ہو۔''

''چلنا ہے تمہیں، نواب سراج الدین صاحب کی حویلی میں۔ ان کی بیٹی کسی مشکل کا شکار ہے۔ تم کیسی پڑوسن اور ملنگنی ہو، تمہیں اتنی سی بات نہیں معلوم؟''

نوراں اپنی جگہ سے اُٹھی اور ڈنڈے کو ہاتھ میں لے کر ناچنے لگی۔ بھاری بدن کی مالک تھی، دو تین بار گرتے گرتے بچی۔ پروفیسر ناہید ناپسندیدہ نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ عمران باہر مردانے میں تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ اچھلتی کودتی رہی پھر بولی۔

''سمجھ گئی میں، سب کچھ سمجھ گئی''

''چلنا ہے تمہیں وہاں۔''

''بچی کو یہاں لے آؤ۔''

''نوراں، میں تم سے کہہ رہی ہوں تمہیں چلنا ہے وہاں۔ یہ لو۔'' پروفیسر ناہید نے کچھ رقم نکال کر نوراں کو دی جسے نوراں نے مٹھی میں دبالیا۔

''چلیں گے...... چلیں گے...... ہمارا فرض ہے کہ سوالی کا ہر سوال پورا کریں۔''

''تو پھر چلیے اپنا فرض پورا کیجیے۔'' پروفیسر ناہید نے کہا۔

وہ کسی نہ کسی طرح نوراں کو گھر لے آئیں۔ حسینہ اس وقت کسی حد تک پرسکون تھی ور مونا کے ساتھ بیٹھی آہستگی سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''میں کیا بتاؤں تمہیں مونا! میرا تو حال ہی بدل کر رہ گیا ہے۔ تنہائی میں بیٹھتی ں تو دل خوف سے لرزنے لگتا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ اُٹھ کر باہر بھاگ جاؤں۔ دماغ ں ایک طوفان سا رہتا ہے۔ عجیب وغریب آوازیں آتی رہتی ہیں اور مجھے کوئی بھی آواز سمجھ ں آتی۔'' اس سے قبل کہ حسینہ مزید کوئی بات کرتی ...... نوراں نے اندر داخل ہوتے ہی ق کا نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ مونا اور حسینہ اس طرف متوجہ ہوگئیں۔ وہ حسینہ کے عین سامنے آ ری ہوئی۔

''اچھا! تو تُو ہے کیوں؟ جانتا ہے میں کون ہوں؟'' حسینہ متعجب اُسے دیکھتی رہی۔

نوراں نے اپنی جھولی سے کوئی چیز نکالی، یہ پانچ گوٹیاں تھیں جو اس نے زمین پر لکیریں کھینچ کر رکھ دیں اور ان کے گرد چکر لگانے لگی۔ وہ کچھ پڑھتی بھی جا رہی تھی اور ڈنڈا بھی زمین پر مارتی جا رہی تھی۔ دفعتاً حسینہ کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا اور وہ بے چین ہو گئی۔ نوراں اردگرد سے بے نیاز اپنا عمل کر رہی تھی۔ ناہید نے مونا کو حسینہ کے پاس سے ہٹا دیا وہ محسوس کر رہی تھیں کہ حسینہ کی کیفیت بدلتی جا رہی ہے۔ یہ ان کے لیے حیرانی کی بات تھی کیونکہ وہ نوراں کو ایسے ہی سمجھتی تھیں۔ لیکن اس وقت کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ حسینہ کے چہرے کا رنگ بالکل ہی بدل گیا تھا پھر اس نے زور زور سے گردن گھمانا شروع کر دی۔ اس کے بال تو تھے ہی قیامت، ذرا سی کوشش پر کھل جاتے تھے۔ سب نے دیکھا کہ حسینہ کے بال چھتری کی طرح پھیل گئے اور ایک زناٹے دار گونج فضا میں پیدا ہو گئی۔ جیسے لاکھوں مکھیاں بھن بھنا رہی ہوں۔ نوراں جو ابھی تک اپنی دھن میں مست تھی، اچانک اس کی نگاہ حسینہ پر پڑی اور اس کا اچھلنا کودنا بند ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں خوف اُبھر آیا، وہ حسینہ کو کچھ دیر بغور دیکھتی رہی۔

پھر اس نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکائے، سر جھکایا اور سیدھی کھڑی ہو گئی اور بولی۔

''میں...... میں آتی ہوں تھوڑی دیر کے بعد کک...... کک...... کو کوئی......تت......تت توڑ کرنا پڑے گا۔ توڑ کرنا پڑے گا۔ آتی ہوں تھوڑی دیر کے بعد۔''

اپنا جھولا اُٹھا کر وہ ایسی بھاگی کہ جوتے وہیں بھول گئی۔ حسینہ بھی ساکت ہو گئی اور چند لمحے بعد بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ پروفیسر ناہید کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ وہ بھی ذرا اُلجھن کا شکار ہو گئی تھیں۔ حسینہ کا انداز بتاتا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ نوراں تو خیر دہشت زدہ ہو کر بھاگی تھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ مذاق حقیقت بھی بن سکتا ہے عام طور پر اس طرح کے واقعات میں لوگوں کی اپنی مرضی شامل ہوتی ہے۔ کسی کی کوئی مشکل اور ان کا حل نہیں ملتا تو ایسے چکر نکل آتے ہیں کوئی کسی کے عشق میں گرفتار ہوتا ہے تو کوئی اپنی مرضی سے شادی کرنے کا خواہش مند اور اس کے لیے جن بھوتوں کا چکر تاکہ دوسرے متاثر ہو جائیں۔ لیکن یہاں جو کچھ دیکھا گیا تھا وہ اُلجھن کا باعث تھا۔ حسینہ کے اندر تو سچ مچ کوئی حلول کر چکا تھا......؟

☆......☆......☆

مونا اور عمران زیادہ تر وقت حسینہ کے گھر گزارتے تھے۔ عمران دل و جان سے اسے چاہتا تھا اور مونا بچپن سے اس کی دوست تھی۔ پروفیسر ناہید تو خیر مصروف ہو جاتی تھیں لیکن یہ دونوں حسینہ کی وجہ سے رات دن پریشان رہتے اور آپس میں گفت گو کرتے رہتے تھے۔ حسینہ اب پہلی جیسی حسینہ نہیں رہی تھی۔ ہر وقت گم صم کھوئی کھوئی۔ بیٹھے بیٹھے لرزنے لگتی تھی۔ ہاتھ پاؤں اُلٹے ہو جاتے۔ تنہائی میں گھبرا کر رونا شروع کر دیتی تھی۔ مونا اپنے سارے کام چھوڑ کر اس کے ساتھ رہتی اور عمران کو جب بھی فرصت ہوتی وہ بھی وہی آ جاتا اور حسینہ کا دل بہلاتا۔ رات بجلی چلی جاتی تو حسینہ کی چیخیں آسمان چھونے لگتیں۔ ایک رات بارش ہوئی بادل گڑگڑائے تو حسینہ بیدار ہوگئی اور اپنے بستر سے اُٹھ کر بھاگ اٹھی۔ دہشت کے مارے چیختی چلاتی وہ اِدھر اُدھر دیواروں سے ٹکراتی صحن میں پہنچ کر رک گئی۔ حسینہ کی آوازیں سن کر دادی اماں، شہریار، نواب صاحب اور جہاں آرا بیگم سب جاگ گئے تھوڑی دیر بعد انہوں نے عجیب وغریب منظر دیکھا۔ حسینہ نپے تلے قدم اُٹھاتی ہوئی آگے بڑھی اور اس کمرے کی جانب چل پڑی جو بند رہتا تھا۔ جیسے ہی وہ کمرے کی ان حدود میں داخل ہونے لگی جہاں کسی کو جانے نہیں دیا جاتا تھا اور سخت ممانعت تھی کہ کوئی وہاں جانے کی کوشش نہ کرے تو سب لوگوں نے حسینہ کو پکڑ لیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے اس کے کمرے میں لے آئے۔ سب کے سب پریشان تھے ایک اچھی خاصی ہنستی کھیلتی لڑکی ایسی مشکل کا شکار ہوگئی تھی جس کا حل کسی کے پاس نہیں تھا۔ کوئی بیماری ہوتی تو علاج کرالیا جاتا۔ پروفیسر ناہید نے ایک بار کہا تھا کہ اسے کسی اچھے ماہر نفسیات کو دکھایا جائے لیکن جو صورتحال نظروں کے سامنے تھی وہ نفسیاتی نہیں تھی۔ پروفیسر ناہید چونکہ پڑھی لکھی خاتون تھیں اور جدید زمانے کی سوچ کے مطابق وہ ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی تھیں لیکن جو کچھ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس دن بھی یہی گفتگو ہو رہی تھی۔ دادی اماں اور جہاں آرا بیگم پروفیسر ناہید کے پاس بیٹھی تھیں۔ حسینہ اپنے کمرے میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ عمران، شہریار اور مونا اس کے کمرے میں تھے۔ پروفیسر ناہید نے کہا۔

’’میں مانتی ہوں کہ کچھ واقعات ایسے ہیں جو صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آتے پھر بھی ہم کسی ماہر معالج سے مشورہ کرلیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔‘‘

''حرج تو واقعی نہیں ہے ناہید بیٹی، لیکن بات وہی ہو جائے گی، کہ ''حلق سے نکلی خلق میں پہنچی'' لوگ پتا نہیں کیا کیا باتیں بنائیں گے۔''

''آپ لوگ اپنی بچی کی صحت اور تندرستی کی طرف دھیان دیں، لوگوں سے آپ خوفزدہ کیوں ہوتے ہیں؟'' پروفیسر ناہید نے کہا۔

''بیٹی جوان بچیوں کی ایک دفعہ رسوائی ہو جائے تو سمجھ لو کہ ان کی زندگی ہی اندھیر ہو گئی۔''

''یہ بات تو آپ ٹھیک کہتی ہیں لیکن ہماری طرف سے آپ اطمینان رکھیں۔ انشاء اللہ ایسی بات کبھی نہیں ہو گی۔''

''کیا مطلب؟'' دادی اماں چونک کر بولیں۔

''اب مطلب میں اپنی زبان سے کیسے کہوں۔ مٹھائی کا ٹوکرا لے کر آئی تھی...... لیکن حالات نے وہ پلٹا کھایا کہ دل کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ دیکھیں اچھے وقت میں تو سب اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں میں اس وقت بات کر رہی ہوں جب آپ لوگ پریشان ہیں اور کسی بھی طرح کی رسوائی سے خوفزدہ ہیں۔'' دونوں ساس بہو پروفیسر ناہید کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

''حسینہ بچپن سے میری نگاہوں کے سامنے ہے میں اسے جانتی ہوں اور آپ لوگوں کو بھی پتہ ہے کہ میرا عمران حسینہ کو پسند کرتا ہے بچپن سے اور حسینہ بھی اسے ناپسند نہیں کرتی۔ جس رسوائی کی آپ بات کر رہی ہیں وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ جب میں اصلیت جانتی ہوں......''

جہاں آرا بیگم کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ وہ روتے ہوئے پروفیسر ناہید کے قریب آ بیٹھیں۔

''ہمیں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں جیسے پڑوسی دیئے ہیں۔ ہم ناز کرتے ہیں آپ پر۔ ناہید تم نے جو بات کہی ہے میں اس کے مفہوم سے سے واقف ہوں، لیکن......''

''نہیں سہیلی سیدھی سی بات ہے بچی ہمارے سامنے بیمار ہوئی ہے اللہ تعالیٰ اسے تندرستی دے گا آپ فکر نہ کریں جو بھی ہو گا ہم ہر حال میں آپ کے ساتھ ہیں۔''

''اجی سنتے ہیں...... ناہید کیا کہہ رہی ہے؟'' جہاں آرا نے نواب سراج الدین کو مخاطب کیا جو آرام کرسی میں دراز مطالعہ میں مصروف تھے۔

''بالکل سن لیا......لیکن ایک بات ہم نے ناہید بہن کی سنی دوسری ان کو بھی سننی پڑے گی۔''

''ہیں......!'' ناہید کے ساتھ ساتھ جہاں آرا اور دادی اماں بھی بیک زبان بولیں اور سوالیہ نظروں سے نواب سراج الدین کو تکنے لگیں۔

''اگر شہریار کو آپ اپنی فرزندی میں لے لیں تو عمران آج سے ہمارا بیٹا بن سکتا ہے۔''

نواب صاحب کی بات سن کر لمحہ بھر کو خاموشی چھا گئی۔

اور پھر سب خوشگوار مسکراہٹوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

پروفیسر ناہید چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد مطمئن انداز میں مسکراتے ہوئے کہنے لگیں۔

''لیکن مونا سے پوچھنا پڑے گا۔''

''میری عمر ساٹھ کے پیٹے میں ضرور ہے۔ لیکن ابھی سٹھیایا نہیں ہوں......بچوں کی ایک ایک حرکت سے واقف ہوں......اس وقت بھی شہریار اور مونا ایک دوسرے سے موبائل فون پر باتیں کر رہے ہیں۔ یقین نہیں آتا تو شہریار کے کمرے میں جا کر تصدیق کر سکتی ہیں۔''

نواب سراج الدین نے پہلی مرتبہ ایسی بات کی تھی کہ ناہید نے سر جُھکا دیا۔

''مجھے منظور ہے بھائی صاحب۔'' پروفیسر ناہید نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

''لیکن ایک شرط میری بھی سن لیں......'' دادی اماں بولیں۔

''حسینہ رخصت ہو کر نہیں جائے گی......بلکہ عمران گھر داماد بن کر حویلی میں رہے گا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے......خالہ جان؟'' پروفیسر ناہید پریشان ہو گئیں۔

''میں پوتی سے جدا نہیں رہ سکتی......'' دادی اماں فیصلہ کن انداز لیے ہوئے تھیں۔

''ناہید......!'' نواب سراج الدین نے مداخلت کی۔ ''کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ گھر بھی تو آپ لوگوں کا ہی ہے۔ تمہاری بیٹی اور بیٹا دونوں یہاں آ جائیں گے۔ تم بھی یہیں آ جاؤ۔ اپنے گھر کو عارضی طور پر کرایہ پر چڑھا دو۔ اماں کی خواہش ہم لوگ کیسے ٹال سکتے ہیں......اتنی بڑی حویلی ہے اور ہم صرف پانچ افراد۔ اچھا ہے یہاں گھما گھمی ہو جائے گی۔''

دادی اماں نے بیٹے کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔'' پروفیسر ناہید خانم نے ہتھیار ڈال دیئے۔

''ناہید......! ایک بار پھر سوچ لو۔ حسینہ کی حالت تمہارے سامنے ہے......'' جہاں آرا افسردہ لہجے میں کہنے لگیں۔

''سہیلی......'' ناہید اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔''ہم ایک دوسرے کے لیے غیر نہیں ہم سب مل کر حسینہ کی دیکھ بھال کر لیں گے۔ مجھے حسینہ ہر حالت میں قبول ہے۔ میرا خیال ہے بچوں کو بلا کر انہیں بتا دیا جائے۔'' جہاں آرا بیگم خوشی سے نہال ہو گئیں۔

عمران حسینہ شہریار اور مونا کو فوری طور پر طلب کر کے بزرگوں کے فیصلے سے آگاہ کیا گیا تو ''جیسے آپ کی مرضی'' کہہ کر سب نے سر جھکا دیا۔ دلوں کی مسرت چہروں سے عیاں تھی مگر اظہار کے راستے میں مشرقی روایات آڑے تھیں۔

تینوں کے برعکس حسینہ کا چہرہ سپاٹ رہا۔ وہ جیسے دور کہیں کھو گئی ہو۔ عمران نے گہری نظروں سے اسے دیکھا تو اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ کیسی شوخ و چنچل طبیعت ہوتی تھی اس کی۔ ہلا گلا کرنے والی۔ موج مستی والی، پہروں گپیں لگانا، گھنٹوں فون پر باتیں کرنا، لیکن اب تو لگتا تھا کسی دوسرے ہی جہان میں رہتی ہے۔ کھوئی کھوئی...... سہمی سہمی...... بیمار بیمار...... شاید شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے۔ عمران سوچوں کی طغیانی میں غرق تھا کہ اچانک صدر دروازے کی کال بیل زور سے گونجنے لگی۔ شہریار اُٹھ کر دیکھنے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد شہریار کی تیز آواز سنائی دی۔

''امی......! ماموں جان آئے ہیں۔''

رفیق احمد صاحب، شاہدہ بیگم اور سب سے زیادہ وہ باکمال شخصیت جس کا نام ہی کمال تھا۔ قد چھ فٹ، توند ڈھائی فٹ، چہرہ اس طرح جیسے تربوز پر لوکاٹ رکھ دیا ہو۔ اتنے بھاری جسم پر اتنا سا چہرہ اور پھر موٹاپے کے جال میں گرفتار آواز ایسے لگتا تھا جیسے ہاتھی میاؤں میاؤں کر رہا ہو۔ کمال میاں شہریار کی جانب گلے ملنے کو دوڑے لیکن شہریار نے لمبی چھلانگ لگا کر تخت پر پاؤں ٹکا دیئے۔ ماموں جان نے کہا۔

''سالا بہنوئی مذاق کر رہے ہیں۔''

''مگر کمال کی تو بہن نہیں ہے۔'' شہریار نے جواب دیا تو رفیق احمد اور شاہدہ بیگم دانت پیس کر رہ گئے۔ باقی لوگ شہریار کی حاضر جوابی پر مسکرانے لگے۔ پروفیسر ناہید، جہاں آرا اور عمران آنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ چونکہ ان لوگوں کی شخصیت مشکوک ہو چکی تھی اس لیے پروفیسر ناہید گہری نگاہوں سے شاہدہ بیگم کو دیکھ رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ شاید یہ لوگ اپنے تعویذ گنڈوں کی کارکردگی دیکھنے آئے ہیں۔ بہرحال مصنوعی خوشی کا اظہار کیا گیا۔ کچھ بھی ہو رفیق احمد صاحب حسینہ کے ماموں تھے۔ گھر میں تھوڑی سی رونق ہو گئی۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کی تیاریاں کی جانے لگیں۔ مونا کچن میں چلی گئی۔ ممانی نے حسینہ کے بارے میں پوچھا تو جہاں آرا بیگم نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''وہ بیمار ہے......''

''ارے کیا ہوا میری بچی کو۔'' شاہدہ بیگم حسینہ کے کمرے کی جانب دوڑیں تو پروفیسر ناہید نے راستہ روک لیا۔

''رُک جائیے......رُک جائیے۔ ایسے منہ اُٹھا کر بھاگا نہیں کرتے۔''

''اے میں تمہیں جانتی ہوں پڑوسن ہو پڑوسن ہی رہیو۔ نانی اماں بننے کی کوشش مت کرو۔''

''نہیں میڈم ابھی میری بیٹی کی شادی نہیں ہوئی ہے میں نانی اماں کیسے بن سکتی ہوں۔ حسینہ کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹروں نے اُسے آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔ آپ ضرور ملیے گا اُسے لیکن اس وقت جب وہ جاگ کر باہر آئے۔''

''ارے واہ! تم مجھے روکنے کی کوشش کیوں کر رہی ہو داروغہ لگی ہو اس گھر کی؟'' شاہدہ بیگم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''بی بی، جو ڈاکٹر حسینہ کا علاج کر رہی ہے، وہ میری بہن ہے آپ پلیز وہ کیجئے جو میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔''

پروفیسر ناہید ظاہر ہے کالج میں پڑھاتی تھیں اور اس طرح کی خواتین سے نمٹنا اچھی طرح سے جانتی تھیں۔ انہوں نے شاہدہ بیگم کو روک ہی لیا۔ مونا گھر کی بچی کی طرح سارے کام کر رہی تھی۔ شاہدہ بیگم نے میاں سے کہا۔

''اے دیکھ رہے ہو ان لوگوں کی حق داری، ایسا لگتا ہے گھر کے مالک یہی لوگ ہیں۔''

''ٹھیک کر دیں گے ایک ایک کو، کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ میری بہن کا گھر ہے معمولی بات نہیں ہے۔'' رفیق احمد صاحب طمطراق سے بولے۔

''ذرا بہن کے تیور تو دیکھو کوئی گرم جوشی ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے بھائی بھاوج نہیں کوئی بھیک مانگنے والے آ گئے ہوں۔''

شاہدہ بیگم کی شخصیت چند لفظوں میں ہی بے نقاب ہو گئی تھی۔ تاہم ان لوگوں کی خوب خاطر مدارت کی گئی پروفیسر ناہید ان کی وجہ سے رُک گئی تھیں جیسے ہی موقع ملا انہوں نے حسینہ کی والدہ سے کہا۔

''دیکھو سہیلی! تمہارے گھر کا معاملہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے اس لیے میں بہت زیادہ مداخلت کر لیتی ہوں ہر لحہ تم ان لوگوں پر گہری نگاہ رکھنا۔ مجھے تو ان کی آمد ہی مشکوک لگتی ہے۔''

جہاں آرا بیگم فکرمندی سے بولیں۔

''خدا کے لیے تم کچھ دن کے لیے کالج سے چھٹی لے لو ان حالات میں میرے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے ہیں۔''

''نہیں خود کو سنبھالے رکھو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔ میں دور کہاں ہوں۔ ہر وقت خبر اور نظر رکھوں گی۔ بے فکر رہو۔''

''ایک اور بات ہاتھ جوڑ کر کرنا چاہتی ہوں۔ یہ جس انداز میں تم سے بات کر رہے ہیں اس کا بُرا نہ منانا، میں......'' جہاں آرا کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ پروفیسر ناہید بولیں۔

''نہیں نہیں بالکل نہیں۔ بالکل بے فکر رہو۔ کیوں پریشان ہوتی ہو؟''

گھر پہنچ کر پروفیسر ناہید نے عمران اور مونا سے کہا۔

''دیکھو بات صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ لوگ ہمارے پڑوسی یا تمہارے سسرال والے ہیں۔ ہمارے درمیان جو محبت ہے ہم نے اسے نبھانا ہے۔ حسینہ کی والدہ مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میں کالج سے چھٹی کر لوں مگر یہ ممکن نہیں ہے ان دنوں کچھ مصروفیت ہے تم لوگ ان پر نگاہ رکھنا، کیا سمجھے؟''

''ٹھیک ہے مما جو آپ کا حکم۔''

مونا اور عمران نے کہا اور اس کے بعد انہوں نے حسینہ کے گھر میں ڈیرا ڈال لیا۔

ادھر شاہدہ بیگم اور رفیق احمد صاحب بمعہ اپنے نورِ چشم کے اپنے کمالات دکھا رہے تھے۔ انہوں نے دو کمروں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان میں سے ایک شہریار کا تھا۔ شہریار فرماں بردار لڑکا تھا اس نے خوشی سے ماموں ممانی کو قبول کر لیا تھا۔ جہاں آرا نے بھی بھائی کے منہ کو دیکھ کر اپنے آپ کو نرم کر لیا تھا۔ حسینہ تو تھی ہی ہوش وخرد سے بیگانہ۔ شاہدہ بیگم نے اسے دیکھا تو سینہ پیٹ لیا۔

''اے...... ہے میری بچی پر کیا ظلم ڈھا دیا گیا۔ ارے یہ کیا ہو گیا اسے، بہن تم نے ہماری امانت کی حفاظت نہیں کی۔''

''عجیب باتیں کر رہی ہیں آپ بھابھی جان! کیسی امانت، کاہے کی امانت......؟''

''لو تمہارا خدا بھلا کرے آنکھوں میں مرچیں ڈالے دے رہی ہو ارے میں اپنی حسینہ کی بات کر رہی ہوں، میرے گھر کی ہونے والی رونق۔''

''کس نے کہہ دیا آپ سے کہ حسینہ آپ کے گھر کی رونق ہے۔''

''لو......رفیق! سنتے ہو۔'' شاہدہ بیگم نے شوہر سے کہا۔

''کمال کرتی ہو تم جہاں آرا! کیا اب تم اس بات سے بھی منحرف ہو گئیں کہ حسینہ کی شادی میرے کمال سے ہو گی۔''

''بھائی جان! میرے اور آپ کے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''واقعی تم تو بالکل بدل گئی ہو، آنے دو نواب صاحب کو۔ کب کی بات طے ہوئی تھی ہمارے بیچ اور تم سرے سے ہی انکار کیے جا رہی ہو۔ ایسا کیوں کر رہی ہو؟''

''دیکھیں میری بچی بیمار ہے۔ میں اس وقت کوئی فضول بات سننے کی روادار نہیں ہوں۔ آپ لوگ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے۔'' حسینہ کی والدہ کی آواز رندھ گئی اور وہ رونے لگیں۔

''ارے واہ! ہماری بچی کا حشر کر کے رکھ دیا ہے تم لوگوں نے۔ کیسی پیلی پڑ گئی ہے اور وہ جو آئیں تھیں ملکہ بن کر میں کہتی ہوں کہ انہیں کیا حق ہے کہ ہمارے گھر کے معاملات

میں کچھ بولیں۔ مجھے نہیں پسند ان کی یہ مداخلت آخر وہ ہوتی کون ہیں؟ میں اس گھر میں کسی کا عمل دخل نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"ارے واہ ممانی جان! آپ چار دن کے لیے مہمان آئی ہیں اور وہ ہمارے پکے پڑوسی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے وہ پروفیسر ہیں؟" شہریار نے گفتگو میں مداخلت کی۔

"ہاں معلوم ہے...... معلوم ہے، پروفیسر...... ہونہہ" شاہدہ بیگم نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"خیر آپ لوگ مہمان ہیں دوسری بات میں نے آپ کو بتادی ہے۔" جہاں آرا نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ارے کچھ نہیں بتایا چھوڑو تم سب کچھ دیکھ لیں گے۔ ہماری بچی ہے۔ ہم تیمارداری کریں گے اس کی اور یہ کیا کہا تم نے کہ چار دن کے لیے آئے ہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے جب تک حسینہ ٹھیک نہیں ہوجائے گی ہم یہیں رہیں گے کیا سمجھیں......؟"

"رہنے کو کس نے منع کیا ہے آپ سے، پر خدا کے واسطے محلے والوں سے جھگڑا کر کے ہماری پریشانی میں اضافہ نہ کیجیے۔"

جہاں آرا بیگم یہ کہہ کر ان لوگوں کے پاس سے ہٹ گئیں۔ لیکن سخت پریشان تھیں کہ یہ کیا عذاب سر پر آن پڑا ہے۔ جہاں آرا نے سوچا کہ یہ لوگ مشکل کا باعث بن سکتے ہیں اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی قدم اُٹھانا ضروری ہے۔ وہ بہت دیر تک سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن رہیں۔

☆......☆......☆

کمال ایک ہونق سا لڑکا تھا۔ بظاہر بھاری ڈیل ڈول لیکن ننھی سی کھوپڑی اور اسی قدر عقل۔ رفیق احمد نے ایک زوردار تھپڑ کمال احمد کے پھُولے ہوئے گال پر رسید کردیا اور کمال احمد بھوں بھوں بھاں بھاں کرنے لگا۔

"اُلو کے پٹھے؟"

"جی ابا"

"تُو نے زندگی میں کچھ کیا ہے؟"

''ہاں کیا ہے اس دن بیر توڑ کر لایا تھا آپ نے کتنی تعریفیں کی تھیں میری۔''

''بیر توڑ کر لایا تھا...... بیر توڑ کر لایا تھا۔'' رفیق احمد صاحب نے پاؤں سے جوتا اُتار کر تین چار جوتے اس کے کندھے پر رسید کر دیئے۔

''مارتے کیوں ہو ابّا، ربڑ کی چپل ہے اتنی زور سے لگتی ہے، قمیض ہٹا کر دیکھ لو۔ اماں ابّا کو منع کرو جوان بیٹوں کی بے عزتی نہیں کی جاتی۔''

''جوان بیٹا...... جوان بیٹا ہیں!...... تُو جوان ہے......؟'' رفیق احمد صاحب کا غصہ برقرار تھا۔

''تو اب کیا بچہ رہ گیا ہوں؟'' کمال احمد نے رفیق احمد کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''کچھ کما کر دکھایا ہے آج تک......؟''

''ابّا تم جو کما لیتے ہو۔ اکلوتا بیٹا ہوں تمہارا۔ مجھ سے نوکری کراتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئے گی۔''

''بک بک کیے جا رہا ہے...... بکواس کرتا ہے آگے سے، اب کوئی سُنے گا تو جُوتے مار کر گھر سے نکال دے گا تجھے۔ صاحب زادے شادی کے شوقین ہیں اور کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ میں کہتا ہوں تُو نے کبھی کسی لڑکی سے عشق کیا ہے آج تک۔''

''کیا ہے ابّا!''

''ایں، کیا ہے؟''

''ہاں ابّا......''

''تو پھر......؟''

''تھپڑ مارا تھا میرے منہ پر۔'' کمال احمد نے معصومیت سے کہا۔

''کک...... کس نے تھپڑ مارا تھا؟''

''اسی لڑکی نے جس سے میں نے اظہارِ عشق کیا تھا۔''

''کیا کہا تھا تُو نے اس سے......؟''

''یہی کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔''

''تو پھر......؟''

''بس تھپڑ مار دیا اس نے۔''

''اور تُو تھپڑ کھا کر چلا آیا......''

''نہیں میں چلا نہیں آیا تھا ابا......!''

''تو پھر......''

''وہیں رُکا رہا تھا میں......''

''تو پھر کیا ہوا......؟''

''بس اس کے بعد اس نے تھپڑ نہیں مارا۔''

''اچھا......! تو کیا اس نے تیری محبت کو قبول کر لیا......؟''

''نہیں ابا!'' کمال احمد نے بسورتے ہوئے کہا۔

''ابے پھر کیا کیا......''

''اس کے بعد اس نے چپل اُتار لی تھی۔'' کمال احمد نے کہا۔

''او بے غیرت تُو چپلیں کھا کر چلا آیا......؟''

''چلا تھوڑا آیا تھا ابا......؟''

''پھر کیا کیا تھا......!''

''دوڑتا ہوا آیا تھا۔ آہستہ چلتا تو وہ اور مارتی۔'' کمال احمد نے جواب دیا۔ رفیق احمد صاحب نے یہ سن کر اس کی پھر پٹائی شروع کر دی۔

''لعنت ہے تیری شکل پر، اور تم اس کی شادی کرنا چاہتی ہو......'' دوسرے الفاظ رفیق احمد نے بیوی کو مخاطب کر کے کہے تھے۔

''ارے بچہ ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا، مگر ان لوگوں نے تو بڑی آفت مچائی ہوئی ہے، ہمارے تو سارے خواب چکنا چُور کر دیئے۔''

''ایسے ہی چکنا چور کر دیئے، اتنی آسانی سے تو نہیں چھوڑوں گا میں انہیں۔'' رفیق احمد بولے۔

''ارے تو کیا لڑ بھڑ کر شادی کرو گے؟'' شاہدہ بیگم نے کہا۔

''نہیں اب تو کچھ اور سوچنا پڑے گا۔''

''کیا سوچو گے؟''

''ویسے میں سوچ کر اور دل میں فیصلہ کر کے آیا ہوں کہ اگر یہ لوگ نہ مانے تو پھر بڑے شاہ جی کے پاس جاؤں گا۔''

''بڑے شاہ جی......؟''

''ارے ہاں شاہ جی، جانتی نہیں ہو تم اُنہیں؟''

''نام تو سنا ہے، میں کیا جانوں کون ہیں؟''

''سمجھتی نہیں ہو تم وہ عظیم کی اماں یاد ہیں تمہیں......جس کا خاوند اسے روز پیٹتا تھا۔''

''جیوے شاہ کی بات کر رہے ہیں آپ......؟''

''سارا کھیل تو جیوے شاہ نے ہی ٹھیک کیا تھا عظیم کے ابا آخر میں کمر ہلاتے تھے بیگم کے سامنے۔''

''کمر ہلاتے تھے......؟'' شاہدہ بیگم نے حیرانی سے پوچھا۔

''تو کیا دُم ہلاتے؟'' رفیق صاحب نے شوخ لہجے میں کہا۔

''آپ کو تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے میں کہتی ہوں ان لوگوں کا رویہ اچھا نہیں لگ رہا مجھے۔ سارے کے سارے ایک ہی آواز میں بول رہے ہیں...... یقیناً کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔''

''میں معلوم کرتا ہوں جیوے شاہ کے بارے میں اور ہاں اپنے اس بے وقوف بیٹے سے کہو کہ زیادہ سے زیادہ حسینہ کے قریب رہے اور اسے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے، کیوں بے! سمجھ رہا ہے نا......؟''

''جی ابا سمجھ رہا ہوں۔'' کمال میاں نے جلدی سے کہا۔ باپ کی عادت جانتے تھے ذرا سی دیر میں جوتے بازی پر اُتر آتے تھے۔ بہرحال ایک طرف تو رفیق احمد صاحب، تعویذ گنڈے کرنے والوں کی تلاش میں نکلے، دوسری طرف ہدایت کے مطابق کمال میاں حسینہ کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ حسینہ کی وہی حالت تھی وہ اب بالکل ہنستی مسکراتی نہیں تھی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھی تھی۔ کتنی ہی بار دادی اماں اور جہاں آرا بیگم نے کمال میاں سے محبت سے کہا۔

''کمال میاں! آپ باہر جا کر بیٹھیے، لڑکی بے چینی محسوس کرتی ہوگی۔ دیکھیے نا آپ کی موجودگی میں وہ آرام سے بیٹھ بھی نہیں سکتی۔''

''میں انہیں آرام سے بیٹھنے سے منع تو نہیں کرتا ابّا کہہ گئے ہیں کہ میں ان کا ہر پل خیال رکھوں۔''

''آپ باہر بیٹھ کر خیال رکھیے جب اس کو ضرورت ہوگی آپ کو بلا لے گی۔''

''ابّا ماریں گے۔'' کمال میاں نے مظلومیت سے کہا۔ لیکن ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

☆......☆......☆

اس شام موسم ابر آلود تھا کہیں دور بجلی بھی چمک رہی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد کمال میاں پھر حسینہ کے پاس آ بیٹھے۔ بادل گرجنے لگے تو حسینہ یکایک چونک پڑی۔ اس کے پورے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی۔ وہ بہت کم اپنے بستر سے نیچے اترتی تھی تھوڑی دیر پہلے ہی عمران اور مونا یہاں سے گئے تھے۔ کمال میاں چوکیدار کی طرح ہر وقت حسینہ پر مسلّط رہتے تھے اور یہ بات کسی کو پسند نہیں تھی۔ اب انہیں کوئی دھکے دینے سے تو رہا۔ اگر دھکے دیتا بھی تو زیادہ سے زیادہ لڑھک جاتے اور پھر اُٹھ کر بیٹھ جاتے لیکن اب جو بادلوں کی گڑگڑاہٹ نے حسینہ پر اثرات مرتب کیے، وہ کمال میاں کے لیے بالکل نئے تھے۔ حسینہ لرزنا شروع ہوگئی۔ کمال میاں بولے۔

''حسینہ! سس سردی لگ رہی ہے کیا؟'' حسینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا۔ آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔ ہاتھ ٹیڑھے ہو گئے، گردن کی رگیں پھول گئیں۔ کمال میاں نے جو غور سے اُسے دیکھا تو ان کے ہوش ہی گم ہوگئے۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے کھسکنے لگے، حسینہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ حسینہ جس طرح چل رہی تھی کمال میاں کے لیے حیرت کا مقام تھا۔ اس کے پاؤں نہیں ہل رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ فضا میں تیرتی ہوئی آگے جا رہی ہو۔ باہر نکل کر اس کا رُخ اس کمرے کی جانب ہوگیا، جو بند رہتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ فضا میں پھیلائے میکانکی انداز میں آگے بڑھتی رہی۔ کمال میاں نے تھوڑی دور تک تو اس کا پیچھا کیا لیکن اس کے بعد ان کے حواس جواب دے گئے اور وہ زور زور سے چیخنے لگے۔

''پھوپھی جان، ابّا، امّاں۔'' ان کی چیخ و پکار سُن کر سب دوڑ پڑے۔ آتے ہی انہوں نے حسینہ کی جو حالت دیکھی تو حواس باختہ ہو گئے۔ شہر یار آگے جا کر بدقت تمام اسے لے کر کمرے میں آیا۔ کمال میاں کو پہلی بار خوف کا احساس ہوا لیکن ڈھیٹ آدمی تھے انہیں حسینہ کے پاس بیٹھ کر لُطف آتا تھا۔ شاہدہ بیگم نے رازداری سے جہاں آرا بیگم سے پوچھا۔

''اے بھابھی! تمہیں اللہ کی قسم ذرا میرے کو سچ سچ بتائیں، یہ کیا چکر ہے؟ حسینہ کو کیا بیماری ہے؟ کچھ پتہ تو چلے مجھے بھی۔''

''بھابھی! آپ نہیں سمجھ پائیں گی اِس بیماری کو بس ہماری تقدیر سو گئی ہے۔''

''بی بی آپ فکر کیوں کرتی ہو ہم لوگ ہیں نا آپ کے سگے بھائی آپ کے ساتھ ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بیماری تو سمجھ میں نہیں آتی۔''

''کسی ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟''

''کیا نہیں کیا میں نے اپنی بیٹی کے لیے۔''

''اب تو کالج بھی نہیں جاتی ہوگی۔'' شاہدہ بیگم نے پوچھا۔

''آپ اس کی حالت دیکھ رہی ہیں کیا وہ کالج جانے کے قابل ہے؟''

''اے بی بی! میں تو ایک ہی بات کہوں، ہم راضی، ہمارا خدا راضی بلاؤ قاضی یہیں نکاح کر دو ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے، جگہ بدل جائے گی تو طبیعت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔'' جہاں آرا بیگم ناخوشگوار نظروں سے اپنی بھابی کو تکتی رہیں۔ کچھ جواب نہ دیا۔

☆......☆......☆

آج صبح سے ہی حسینہ ہشاش بشاش تھی۔ ایک عرصے بعد اس کی رنگت میں نکھار نظر آ رہا تھا۔ علی الصبح اس نے مونا کو فون کیا اور فوراً حویلی پہنچنے کی فرمائش کی۔ مونا حسینہ کی کھنکتی آواز سن کر بہت خوش ہوئی۔ کئی دنوں بعد اس نے حسینہ کی آواز میں شگفتگی محسوس کی تھی۔ جلدی سے اس نے ماں کو بتایا اور آشیانہ چلنے کی تیاری کرنے لگی۔ عمران کو خبر ہوئی تو وہ بھی مچل گیا۔ یوں دونوں بہن بھائی آشیانہ پہنچ گئے۔ سامنے کھلی فضا میں نواب سراج الدین، دادی اماں، جہاں آرا بیگم، شہر یار، حسینہ، ماموں رفیق احمد، شاہدہ بیگم اور کمال میاں ناشتے پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔

''السلام علیکم!'' دونوں ایک ساتھ بولے۔ تو سب نے وعلیکم السلام کہا۔ مونا اور

عمران کو دیکھ کر حسینہ کھل اُٹھی۔ کمال میاں نے منہ پھلا لیا۔ رفیق احمد ناک بھوں چڑھانے لگے۔ جبکہ شاہدہ بیگم سے نہ رہا گیا۔ تڑک سے بول اُٹھیں۔

''اے بیٹا! تمہارے گھر میں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا؟''

''آپ کو جو کچھ چاہیے آنٹی آپ بتایئے۔'' عمران مسکرایا۔

''لو بیٹا میرے لیے تم کیا لاؤ گے صبح صبح بھوکے بِلّوں کی طرح آ دھمکتے ہو اور یہاں آ کر ٹھونستے ہو بیٹی کسی گھر میں ایک آدھ بار کھالینا بُری بات نہیں...... مگر روزانہ آ جانا بہت بُری عادت ہے۔ حیران ہوں یہ لوگ تمہیں کس طرح برداشت کرتے ہیں۔''

''اصل میں جہاں آرا آنٹی نے ہماری عادتیں خراب کر دی ہیں شاہدہ آنٹی آپ نے جو کچھ کہنا ہے انہی سے کہیں۔'' یہ کہہ کر عمران شہریار کے پاس خالی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

مونا حسینہ کے پاس چلی گئی۔

''دیکھو رفیق احمد......!'' نواب سراج الدین ٹھہرے انداز میں کہنے لگے۔ ''ہمارے گھر میں کون آتا ہے، کون جاتا ہے؟ اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔''

''اے بھائی میاں! ہمارا کیوں تعلق نہیں۔ آخر کو حسینہ ہماری بیٹی ہے اور اس گھر میں ہماری امانت۔'' رفیق احمد کی بجائے شاہدہ بیگم بولیں۔

''بس......'' نواب سراج الدین ہاتھ اُٹھا کر گرجے۔ ''اس سے آگے کوئی لفظ نہیں...... تم لوگوں کے ساتھ ہماری ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور نہ میں کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ آپ ہمارے ساتھ کس لہجے میں بات کر رہے ہیں؟'' رفیق احمد نے احتجاج کیا۔

''میں آپ لوگوں پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ عمران اس گھر کا ہونے والا داماد ہے اور مونا اس گھر کی بہو......''

''میں تو پہلے ہی کہتی تھی رفیق احمد! ان لوگوں کی نظریں وہ نہیں ہیں انہوں نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔''

''تم نے اپنے گھر بلا کر ہماری بے عزتی کی ہے جہاں آرا......'' رفیق احمد اپنی بہن سے مخاطب ہوئے۔

''میں نے آپ کی نہ کوئی بے عزتی کی ہے اور نہ ہی آپ کو بلایا ہے۔'' جہاں آرا نے مشرقی روایات کے مطابق آنکھیں جھکا کر نرم لہجے میں بھائی کی بات کا جواب دیا۔

''دیکھ لوں گا ایک ایک کو میں......'' رفیق احمد غصے میں آ گئے۔

یہ صورت حال دیکھ کر شہریار آگے بڑھا اور ماموں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کمرے میں لے گیا اور ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

عمران کا خیال تھا کہ اس صورتحال کے بعد شاید یہ لوگ فوراً چلے جائیں مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب دوپہر تک وہ جانے کی کوئی تیاری کرتے نظر نہ آئے۔ البتہ بڑبڑاہٹ جاری تھی۔ اس کے بعد نواب سراج الدین خاموش لیکن غصے میں نظر آتے رہے۔ گھر کے ماحول میں ایک تناؤ سا آ گیا تھا۔ لیکن خوشی کی بات یہ تھی کہ حیرت انگیز طور پر حسینہ ہشاش بشاش تھی اور خوشی سے چہک رہی تھی۔

☆......☆......☆

''اماں! کیا اب ہم یہاں سے چلے جائیں گے......؟'' کمال میاں منہ بسورتے ہوئے ماں سے مخاطب ہوئے۔

''کیوں چلے جائیں گے؟ میرے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔ ہمارا سکون چھیننے والے کیسے سکون سے رہ سکتے ہیں۔ کچھ کرو رفیق احمد۔'' آخری بات شاہدہ بیگم نے اپنے میاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہی تھی۔

''بالکل کروں گا...... میرا نام تو رفیق ہے۔ لیکن میں کسی کا رفیق نہیں۔ ابھی جاؤں گا بڑے شاہ جی کی طرف اور وہ جادوٹونا کرواؤں گا کہ یہ ساری زندگی یاد کریں گے۔''

اور تُو نکھے کیا تیر مارا ایک لڑکی نہ پھنسا سکا۔''

شاہدہ بیگم نے بیٹے کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''اماں۔ ہر وقت دل جلانے والی باتیں مت کیا کرو۔''

''کچھ نہیں کرسکو گے تم...... میں جانتی ہوں۔''

''جب ساری باتیں جانتی ہو تو مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟''

''کچھ کر لے بیٹا کمال، کچھ کر لے ورنہ لڑکی ہاتھ سے نکل جائے گی اور تُو منہ

دیکھتا رہ جائے گا۔"

"وہ تو نکل ہی چکی۔"

"پھر بھی۔" شاہدہ بیگم اڑی رہیں۔

"کیا کروں بتاؤ تو؟"

"وہ نوراں ملنگنی کا بڑا نام سنا ہے میں نے۔ ذرا اسی سے مل۔" شاہدہ بیگم بیٹے کا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہ تھیں۔

"نام تو میں نے بھی سنا ہے۔"

"جا اس کے پاس۔ دل کی بات کہہ اپنی مشکل بتا کوئی تعویذ گنڈا لے۔"

ٹھیک ہے جاتا ہوں اس کے پاس۔"

کمال میاں نے تیاری کی اور گھر سے باہر نکل گئے۔

نوراں ملنگنی بابا جیون کے مزار کے پیچھے ہی رہتی تھی۔ کمال میاں کو اس کا پتہ ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ کمال میاں کو ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں بڑا روحانی ماحول بنایا گیا تھا۔ ہر طرف خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور بہت سی ایسی چیزیں رکھی تھیں جنہیں دیکھ کر کمال میاں بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے وہاں موجود نوراں کے خدمتگار سے پوچھا۔

"نوراں ملنگنی کہاں ہیں؟"

"تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔"

"کیوں......؟"

"وہ چلّہ کر رہی ہیں۔" کمال میاں کو لانے والے نے کہا۔ یہ سب لوگ تربیت یافتہ تھے اور لوگوں کو جال میں پھانسنا خوب جانتے تھے۔

"تمہیں نوراں مائی سے کیا کام ہے؟"

"ایک مشکل پیش آ گئی ہے۔"

"کیا...... کچھ بتاؤ۔" اس شخص نے کہا اور کمال میاں نے سادگی سے اپنی محبت کی پوری داستان سنا دی تو اس شخص نے کہا۔

"تم ٹھیک جگہ آ گئے ہو۔ مائی نوراں سب ٹھیک کر دے گی۔ میں دیکھتا ہوں کہ ان

کا چلّہ کتنا رہ گیا ہے۔ فارغ ہو گئی ہوں تو تمہیں ملاتا ہوں۔''

ان لوگوں کو تو ایسے سادہ لوح آدمیوں کی تلاش ہر وقت رہتی ہے۔ یہ شخص جس کا نام بلّو تھا مائی نوراں کے پاس پہنچا اور نوراں کو ساری تفصیل بتا دی۔

''کون سے گھر کی بات ہے؟''

''آشیانہ کی۔''

''ہائے مر جاؤں۔ اس حویلی میں تو سچ مچ ایک خطرناک لڑکی رہتی ہے۔ وہ لوگ مجھے بلا کر لے گئے تھے جوتے چھوڑ کر بھاگنا پڑا ورنہ مصیبت میں پڑ گئی تھی۔ بہرحال کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا، ویسے بندہ کچھ مال وال دے گا؟'' نوراں اپنے مدعا پر آ گئی۔

''لگتا تو ایسا ہی ہے۔''

''تم چلو، میں دیکھتی ہوں۔'' مائی نوراں نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اسی کمرے میں آ گئی جہاں کمال میاں اس کا انتظار کر رہے تھے۔

''جیتے رہو بچے...... مشکل کا شکار ہو۔ میں تمہاری مشکل کا حل تلاش کرتی ہوں۔''

''میں آپ کو اپنی مشکل بتانا چاہتا ہوں'' کمال میاں بولے۔

''بتا بچہ''

''اصل میں'' کمال میاں نے آغاز کیا۔

''بس چپ ہو جا۔'' نوراں نے کڑک کر کہا۔

''کیوں؟'' کمال میاں نے نوراں کی بات کاٹنے پر سوال کیا۔

''تو نے اپنی مشکل بتائی تو کیا فائدہ؟ ہم تجھے تیری مشکل بتاتے ہیں۔ تو ایک کسی سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر وہ لڑکی کسی جن کے اثر میں ہے۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟'' کمال میاں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے رات کیا کھایا تھا؟'' نوراں نے بارعب انداز میں کہا۔

''تو مجھے بتاؤ اب میں کیا کروں؟'' کمال میاں نے متاثر ہونے والے انداز میں پوچھا۔

''تو کچھ نہیں کرے گا۔''

''تو پھر۔''

''جو کچھ کریں گے ہم کریں گے۔ ہم اسے جن کے اثر سے نکال دیں گے۔''

''کیا واقعی؟'' کمال میاں نے حیرت اور خوشی سے پوچھا۔

''ہاں۔ بڑا خطرناک جن ہے۔ لیکن ایک مشکل ہے۔''

''کیا؟''

''ہمیں دور ویرانے میں جا کر چلّہ کرنا پڑے گا۔''

''تمہاری مہربانی ہوگی۔''

''دس ہزار روپے خرچہ آئے گا۔''

''دس ہزار......؟'' کمال میاں کے سر پر جیسے بم پھوٹ پڑا۔

''ہاں پورے دس ہزار۔''

''وہ تو اماں ابا سے مانگنے پڑیں گے۔''

''تو پھر جا...... لے آ...... تیرا کام ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' کمال میاں نے مردہ لہجے میں کہا۔ اور وہاں سے واپس لوٹ آئے۔ اب انہیں دس ہزار روپے کا بندوبست کرنا تھا۔

ادھر رفیق احمد جیوے شاہ کے پاس پہنچ گئے۔ جیوے شاہ نے ان سے وعدہ کیا کہ سات دن کے اندر اندر کسی ایسی چیز کا وجود وہاں نہیں رہے گا۔ خرچہ یہاں بھی ہوا تھا اور خرچہ مائی نوراں نے بھی مانگا تھا۔ سات ہزار روپے بڑی مشکل سے شاہدہ بیگم نے نکال کر بیٹے کو دیئے اور اس سے کہا تھا کہ بیٹا ابا کو مت بتانا بلکہ کسی کو بھی مت بتانا۔

تھوڑی ہی دیر میں کمال میاں سات ہزار روپے مائی نوراں کو دینے پہنچ گئے۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو شاید مائی نوراں مزید پیسے حاصل کرنے کے لیے کچھ کاروائی کرتی لیکن اس نے حسینہ کا وہ منظر دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ مسئلہ کچھ اور ہی ہے۔ لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ لہٰذا اس نے تین دن بعد کی تاریخ دے دی۔ لیکن جب کمال میاں نوراں ملنگنی کو پیسے دے کر واپس آ رہے تھے تو ایک لطیفہ ہو گیا۔ محلے کے دو کتے ان کے پیچھے لگ گئے۔ کمال میاں نے جان بچانے کے لیے کتوں کو پتھر مار دیا اور یہ پتھر ہی ان کے لیے مصیبت بن گیا۔ دونوں کتے ان کے دشمن ہو گئے اور جان کی بازی لگا کر کمال میاں کے پیچھے لگ

گئے۔ کمال میاں کو بھاگتے ہی بن پڑی لیکن بھلا ایک ٹینکر کتنی تیز رفتاری سے بھاگ سکتا تھا وہ جان کی پوری قوت لگا کر دوڑ رہے تھے اور کتے بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے یہاں تک کہ ایک کتے نے ان کے کپڑے پکڑ لیے اور کمال میاں دھڑام سے نیچے جا پڑے۔ بدقسمتی سے ایک کتا ان کی زد میں آ گیا اور ان کے نیچے دب گیا اب کیفیت یہ تھی کہ کمال میاں بھی چیخ رہے تھے اور کتا بھی پورا زور لگا کر ان کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اور بُری طرح چیخ رہا تھا۔ دوسرے کتے نے گھبرا کر کمال میاں کے کپڑے چھوڑ دیئے۔ راہگیر قہقہے بھی لگا رہے تھے اور ہمدردی بھی کر رہے تھے۔ پھر کچھ بزرگوں نے کمال میاں کو سنبھال کر اُٹھایا اور کتا ان کے نیچے سے نکل کر ایسا بھاگا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا ادھر کمال میاں پر بے ہوشی طاری ہو رہی تھی بڑی مشکل سے انہوں نے اپنے گھر کا پتہ بتایا اور مضحکہ خیز شکل اور بدحواسی کے عالم میں خراش خراش اور بدحواس گھر پہنچے۔ بہت دیر تک تو وہ یہ بھی نہیں بتا سکے تھے کہ ان کے ساتھ واقعہ کیا پیش آیا۔ پھر جب سب کو یہ پتہ چلا تو گھر والے بھی ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔ سوائے شاہدہ بیگم کے جو بُرے بُرے منہ بنا کر سب کو دیکھ رہی تھیں اور غصّے سے پھنکار رہی تھیں اور دل میں کہہ رہی تھیں۔

''خدا سے ڈرو تم لوگ...... خدا سے ڈرو، میں کہتی ہوں اللہ کرے کتوں کی پوری فوج تمہارے پیچھے لگ جائے......''

بڑی مشکل سے شام تک کمال میاں کی حالت بحال ہوئی۔

رات کو عمران اور شہریار کو شرارت سوجھی تو انہوں نے کتے کی آواز نکالنا شروع کر دی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ کمال میاں سو چکے تھے خوفزدہ ہو کر اُٹھ گئے اور بھاگ کر باپ کی چارپائی پر جا چڑھے اور رفیق احمد صاحب بے چارے ان کی توند کے نیچے دب گئے۔

''ابے...... ابے...... کیا کر رہا ہے، پیچھے ہٹ۔''

''ابّا! کُتے۔''

''ارے ابّا تو ہیں ہی کُتے، تو پیچھے سرک بے غیرت، تو سانس لے گا تو میں نیچے جا پڑوں گا جگہ ہے ہی کتنی۔''

''ڈر لگ رہا ہے ابّا......!''

''ارے اسے غسل خانے میں بند کرو اس کا، سارا ڈر وہیں نکل جائے گا، اب اُٹھتا ہے کہ دوں ایک لات تیرے پیٹ پر۔''

''اماں! ابا کو سمجھاؤ۔''

''میں خود سمجھاتا ہوں تجھے۔'' رفیق احمد صاحب نے کہا۔

بمشکل تمام کمال میاں اپنے بستر پر گئے۔ لیکن ساری رات سوتے جاگتے رہے۔

عمران اور شہریار کی یہ شرارتیں صبح تین بجے تک جاری رہیں پھر تھک ہار کر دونوں دوست سو گئے۔ کچھ ہی دیر میں آشیانہ گھمبیر سناٹے میں ڈوب چکا تھا۔ سبھی خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے کہ سارا دن مطمئن و مسرور رہنے والی حسینہ کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ اسے اتنی پیاس محسوس ہو رہی تھی کہ حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ اس نے قریبی میز پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا اور غٹاغٹ پی گئی لیکن پیاس کم نہ ہوئی حالانکہ جاڑے کا موسم اور شدید سردی تھی۔ یکے بعد دیگرے اس نے دو مزید گلاس حلق سے اتارے اور لیٹ گئی۔ دوبارہ لیٹتے ہی اسے محسوس ہوا جیسے بستر میں کوئی چیز ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھی اور رضائی کو زور زور سے جھاڑنے لگی لیکن اس میں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ پھر لیٹنے کی تیاری کرنے لگی لیکن جیسے ہی اس نے رضائی اوڑھی اسے اپنے پیروں پر کوئی چیز رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اب تو وہ بُری طرح گھبرا گئی اور بستر چھوڑ کر آرام کرسی پر جا بیٹھی اور متوحش نظروں سے بیڈ کو تکنے لگی۔ اور پھر سر جھٹک کر مسکرانے لگی جیسے خود سے بات کر رہی ہو۔

''کیا ہو گیا ہے حسینہ تجھے؟ کیوں ہر وقت ڈرتی رہتی ہو۔ اپنا گھر اپنا کمرہ اپنا بستر کس بات کا خوف ہے۔ وہ اُٹھ کر کھڑکی کے قریب آ گئی اور اس کے پٹ کھول دیئے۔ سرد رات کی خنک ہوائیں اس کے تن بدن میں سوئیاں چبھونے لگیں۔ اس طرف کے کھلے صحن میں درختوں کی بھرمار تھی۔ تن آور پیڑ قطار در قطار بھوتوں کی مانند سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ اب نیند حسینہ کی آنکھوں سے کوسوں دور ہو چکی تھی۔ آسمان پر بجلی چمکی تو حسینہ نے نگاہیں اُٹھا کر دیکھا تو نیل گگن پر تاروں کا نام و نشان نہ تھا بلکہ آسمان گھرے سیاہ بادلوں کی لپیٹ میں تھا۔ بجلی پھر چمکی۔ دور کہیں بادل گرجا۔ سامنے درختوں کے جھنڈ سے ایک باریک چیخ اور ساتھ ہی پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی اور پھر ایک اُلّو چیختا ہوا ایک درخت

سے اُڑ کر دوسرے درخت پر چلا گیا۔ ہوا میں آہستہ آہستہ تیزی آنے لگی۔ تیز ہوا حسینہ کے بال اُڑانے لگی اور ہوا میں پُراسرار سرسراہٹ پیدا ہو گئی۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج میں بھی شدت آنے لگی۔ حسینہ پر سراسیمگی چھا گئی۔ انجانے خوف سے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس کے لمبے گھنیرے سیاہ بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ وہ سفید کپڑوں میں کسی روح کی مانند نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ اور جسم میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ کھڑکی کی چوکھٹ پکڑے حسینہ کو اگر اس وقت کوئی دیکھ لیتا تو یقیناً حواس باختہ ہو کر بھاگ نکلتا۔

پھر بادلوں کی طویل گڑگڑاہٹ کے بعد موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بارش شروع ہوتے ہی حسینہ کی نشیلی آنکھوں میں بے پناہ چمک اُبھر آئی اور آنکھیں کھل کر یوں ساکت ہو گئیں جیسے دو مرکری بلب روشن ہو گئے ہوں۔ گردن میں تناؤ آ گیا اور ہاتھوں کی انگلیاں کسی ترشول کی مانند نیم دائرے کی شکل اختیار کرنے لگیں۔ تیز بارش کے قطرے حسینہ کے چہرے سے ٹکرائے تو اسے جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ وہ ابھی تک کھڑکی کی چوکھٹ تھامے کھڑی تھی۔ مگر اب کسی روبوٹ کی مانند دونوں پیروں کی ایڑیاں اُٹھا کر پنجوں کے بل خودکار انداز میں گھومنے لگی۔ بارش کے قطرے شبنم کی طرح اس کی ریشمی زُلفوں پر چمک رہے تھے۔

☆......☆......☆

کمال میاں کو یہ تو اندازہ ہو چکا تھا کہ اب حسینہ سے ان کی شادی کے امکانات ختم ہو چکے ہیں مگر دل کا کیا کریں صاحب ہم تمہی پہ مرتے ہیں، کے مصداق دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اخیر شب جب ہر طرف ہُو کا عالم تھا وہ بستر پر اُٹھ بیٹھے۔ دیکھا تو ابا آڑے ترچھے سوئے ہوئے تھے۔ دور کھڑکی کے پاس والے پلنگ پر اماں کے بے ہنگم خراٹے گونج رہے تھے۔

کمال میاں آہستگی سے بستر سے اُترے اور عجلت میں ننگے پاؤں ہی کمرے سے باہر نکل آئے برآمدہ غریب کی جیب کی طرح خالی تھا۔ اسی لمحے بجلی کی خوفناک کڑک پیدا ہوئی جس سے کمال میاں ڈر گئے۔ برآمدے میں انہیں سردی کا احساس ہوا تو سوچا کہ کمرے سے کوئی چادر اوڑھ آؤں لیکن پھر خیال آیا کہ اماں کی آنکھ کھل گئی تو بے نقط کی سنائیں گی اور اگر ابا اُٹھ گئے تو بے بھاؤ کی پڑیں گی لہٰذا واپسی کا ارادہ منسوخ کر کے ٹھٹھرتے کپکپاتے حسینہ کے کمرے کی جانب بڑھنے لگے۔ اسی اثنا میں بارش شروع ہو گئی۔ بوندیں

پھوار کی صورت برآمدے تک آ رہی تھیں۔

برآمدے سے صحن میں پہنچنے پر یخ بستہ ہوائیں جسم سے ٹکرائیں تو تن بدن میں برف گھستی محسوس ہوئی جس سے بتیسی طبلے کی طرح بجنے لگی۔ اسی حالت میں حسینہ کے کمرے تک آ پہنچے۔ دروازے کے پاس پہنچ کر کی ہول سے آنکھ لگائی تاکہ اندر جھانک کر دیکھ سکیں کہ حسینہ سوتے ہوئے کیسی لگ رہی ہے۔ لیکن جیسے ہی کمال میاں نے آنکھ کی ہول سے لگائی دروازے کے دونوں پٹ کھٹاک سے باہر کی طرف کھل گئے اور ان کے سر سے آ ٹکرائے۔ کمال میاں کا دماغ جھنجھنا اُٹھا، آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ مشکل سے سنبھلے اور جب دروازے کی طرف دیکھا تو اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ حسینہ سفید لباس میں ملبوس دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ اس کے گھنیرے سیاہ بال ہوا کے دوش پر لہرا رہے تھے۔ بلی کی طرح چمکتی آنکھیں کمال میاں پر مرکوز تھیں۔ کمال میاں کا چہرہ اس اچانک صورت حال سے خوف کی آماجگاہ بن گیا۔ بھاگنے کا ارادہ کیا تو قدم من من کے ہو گئے۔ چیخنے کی کوشش کی تو زبان تالو سے چپک گئی۔ حسینہ سفاکیت چہرے پر سجائے ہولے ہولے کمال میاں کی جانب بڑھنے لگی۔ عین اسی وقت ایک سمع خراش چیخ نے حویلی کا سکون غارت کر دیا۔

☆......☆......☆

بادلوں کی گڑگڑاہٹ سے شہریار کی نیند ٹوٹ گئی۔ چند لمحے سپاٹ نظروں کے ساتھ چھت کی کڑیاں گننے کے بعد یک لخت اس کے ذہن نے قلابازی کھائی اور اسے حسینہ کا خیال آیا جو طوفانی بارش میں ڈر کے چیخنے چلانے لگتی تھی۔ کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف نظر کی تو آسمان کو سُرخ پایا۔ خوفناک گھن گرج کے ساتھ چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ لمحہ بھر میں اس نے اپنا بستر چھوڑ دیا اور حسینہ کے کمرے کی طرف لپکا۔ برآمدے میں آتے ہی سرد ہواؤں کے جھونکوں سے ٹھٹھر کر رہ گیا۔ کچھ ہی دور حسینہ کا کمرہ تھا۔ شہریار ٹھٹک کر رک گیا۔ اسے شاہدہ بیگم برآمدے میں دبے قدموں چلتی نظر آئیں۔ یہ کہاں جا رہی ہیں؟ اس خیال کے ذہن میں اُبھرتے ہی شہریار برآمدے کے ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ ضرور ممانی کسی جادو ٹونے کے چکر میں اتنی رات گئے باہر آئی ہیں۔ یہ دوسرا خیال تھا جس نے اس کے دماغ میں کروٹ لی تھی۔ شاہدہ بیگم شہریار سے تقریباً اٹھارہ بیس قدم آگے تھیں۔ حسینہ کا کمرہ

تھوڑا سا آگے وہاں تھا جہاں برآمدہ خم لے رہا تھا۔ اچانک شاہدہ بیگم کے حلق سے دل دہلا دینے والی سمع خراش چیخ نکلی اور وہ بے جان ہو کر گر پڑیں۔

ممانی کی یہ حالت دیکھ کر شہریار ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر دوڑ پڑا۔ برآمدے کے خم سے جیسے ہی آگے بڑھا تو سامنے ہی حسینہ اپنے کمرے کے دروازے کے بیچوں بیچ وحشت ناک حلیے میں موجود تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ کمال میاں کی گردن پر تھا۔ اور کمال میاں کو اس نے ایک ہاتھ سے کچھ اس طرح زمین سے اُٹھا کر بلند کر رکھا تھا کہ وہ دونوں پاؤں سے ہوا میں سائیکل چلا رہے تھے۔ زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ شاہدہ بیگم یقیناً اکلوتے بیٹے کی حالت دیکھ کر چیخی تھیں۔ حسینہ کی شکل دیکھ کر شہریار بھی ڈر گیا لیکن اسے پتہ چل چکا تھا کہ چند لمحوں کی تاخیر سے کمال میاں جان سے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا شہریار یکبارگی ایک ایڑی پر گھوم گیا اور زور سے حسینہ سے جا ٹکرایا۔ اس اچانک اُفتاد سے حسینہ لڑکھڑائی اور اس کا دھیان بٹا تو کیم و شحیم کمال میاں اس کے ہاتھ کی گرفت سے چھوٹ کر زمین پر گر گئے۔ شور شرابہ سن کر ماموں رفیق اور نواب سراج الدین بھی وہاں پر پہنچ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے جہاں آرا بیگم دادی اماں اور دیگر ملازمین بھی اکٹھے ہو گئے۔ حسینہ چند لمحوں تک کینہ توز نظروں سے سب کو گھورتی رہی اور پھر اس کا رُخ صحن کی طرف ہو گیا اور وہ قدم بہ قدم اس پُراسرار کمرے کی طرف بڑھنے لگی جو گزشتہ سو برسوں سے مقفل تھا۔ سب مرد اُسی کی طرف بڑھے۔

حسینہ کی مدافعت اس قدر شدید تھی کہ وہ اتنے مردوں کے قابو میں بھی نہ آ رہی تھی۔ انتہائی مشکل سے گھسیٹ کر حسینہ کو واپس لایا گیا۔ لیکن حسینہ بستر پر لیٹنے کی روادار نہ تھی۔ جہاں آرا اور شاہدہ بیگم بھی اب ان کی مدد کر رہی تھیں۔ اچانک حسینہ نے ایک ہاتھ چھڑا کر زوردار تھپڑ شاہدہ بیگم کو رسید کیا تو ان کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا۔ انتہائی مشکل سے حسینہ کو قابو کیا جا سکا لیکن جب تک بادلوں کی گھن گرج رہی حسینہ جیسے انگاروں پر لوٹتی رہی۔ ڈاکٹر شیرازی کو بلایا گیا۔ جنھوں نے فوری طور پر اسے بے ہوشی کا انجیکشن لگا دیا۔ اتنی دیر میں بادلوں کی گھن گرج ختم ہو چکی تھی اور بارش بھی دم توڑ چکی تھی۔ حسینہ کی حالت بھی سنبھل گئی اور وہ گہری نیند سو گئی۔

نیند سب کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کمال میاں کی حالت قدرے بہتر ہو چکی

تھی مگر وہ بہ دستور چپ اور گم صم تھے۔ خوف کی پیلاہٹ ان کے چہرے سے اب بھی ہویدا تھی۔ اپنی درگت اور بیٹے کی حالت دیکھ کر شاہدہ بیگم کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ وہ ہاتھ نچا نچا کر کوسنے دینے لگیں کہ تم سب فراڈ ہو۔ یہ سب ڈرامہ صرف مجھے اور میرے بیٹے کو مارنے کے لیے رچایا گیا ہے۔

☆......☆......☆

اس واقعہ کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اگلے دن صبح سویرے ہی ماموں رفیق احمد اور شاہدہ بیگم نے بوریا بستر لپیٹا اور نو دو گیارہ ہو گئے۔

حسینہ انتہائے سحر سے بے سدھ سوئی تو پھر دوپہر بارہ بجے کے قریب اُٹھی۔ اس کے جاگتے ہی سب ہوشیار ہو گئے لیکن حسینہ تو جیسے بالکل ہشاش بشاش تھی، بستر سے اتر کر باہر آئی۔ سب کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔

''ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں سب مجھے......؟'' اس کی زبان سے طربیہ جملہ سن کر سب کی جان میں جان آئی۔ پروفیسر ناہید، مونا اور عمران بھی آ چکے تھے۔

''ارے مونا تم......!'' حسینہ مونا سے معانقہ کرنے لگی جیسے بڑے عرصہ بعد ملی ہو...... اور پھر باتھ روم چلی گئی۔ ایک گھنٹہ کے اندر نہا دھو کر تیار ہو کر کہنے لگی۔ ''بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے۔''

جہاں آرا بیگم بیٹی کو تندرست دیکھ کر بلائیں لینے لگیں۔ آج بڑے دنوں بعد حسینہ کھلی کھلی فریش لگ رہی تھی۔ اس نے ڈٹ کر کھانا کھایا اور مونا سے خوش گپیوں میں مصروف ہو گئی۔

نواب سراج الدین کسی کام سے شہر چلے گئے۔ دادی اماں اور جہاں آرا بیگم ظہر پڑھنے کی تیاریاں کرنے لگیں۔ پروفیسر ناہید کالج تھیں۔ حسینہ کے پاس صرف مونا تھی۔

شہریار ابھی تک اپنے کمرے میں تھا...... شاید سو رہا تھا عمران نے اسے جگانا مناسب نہ جانا بلکہ حسینہ کے کمرے میں آ گیا۔

وہ دونوں کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ عمران...... حسینہ کی خوبصورتیوں میں کھب گیا۔

مونا اس کی لاڈلی بہن تھی...... لیکن اس وقت وہ چاہ رہا تھا کہ مونا کچھ لمحوں کے

لیے کہیں اور چلی جائے...... مونا بھائی کی نظروں کا مفہوم بھانپ گئی اور ''ابھی آتی ہوں'' کہہ کر بھائی کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر باہر چلی گئی۔

''حسینہ......!'' تنہائی پاتے ہی عمران نے ہولے سے کہا۔

''ہوں......'' حسینہ نے پلکوں کی جھالریں لمحہ بھر کے لیے اُٹھا کر گرادیں۔

''کیا ہوگیا ہے تمہیں......؟'' عمران کے لہجے میں یاسیت تھی۔ ''جوں جوں ملن کی گھڑیاں قریب آتی جارہی ہیں تم مجھ سے دور ہوتی جارہی ہو...... کبھی کبھی تو تمہاری حالت قابلِ رحم نظر آتی ہے۔''

''میں کیا جانوں......؟'' حسینہ مسکرائی۔

''تمہیں پتہ ہے ہمارے والدین ہماری شادی پر رضامند ہوگئے ہیں۔''

''مشکل ہے......'' حسینہ ہولے سے بولی...... تو عمران چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''کیوں...... کیا مشکل ہے؟''

''وہ نہیں ہونے دے گا۔''

''وہ کون......؟''

''وہی...... جو مجھے بلاتا ہے...... جو مجھے لے جانا چاہتا ہے...... وہی جس نے مجھے کالج جانے سے منع کررکھا ہے۔''

''نہیں حسینہ...... تم میرا پیار ہو...... میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا...... کوئی تمہیں نہیں لے جاسکتا۔ تم اسے کہہ دو...... کہ تم عمران کی ہو...... صرف عمران کی...... میں مما سے بات کرتا ہوں...... کہ جلد از جلد ہماری شادی کردیں۔ پھر سارے مسئلے حل ہوجائیں گے۔''

''عمران......!'' حسینہ بڑی بڑی غزالی آنکھیں عمران کے چہرے پر مرکوز کر کے کہنے لگی۔

''بولو...... بولو...... جانِ عمران......''

''مم...... مجھے ڈر لگتا ہے۔ کچھ ہو نہ جائے...... وہ کہتا ہے میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ اپنے محل میں...... اپنی سلطنت میں...... اپنے آشیانے میں...... اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے مجھے جانا ہوگا۔''

''تم فکر نہ کرو حسینہ......!'' عمران نے بے تابی سے بڑھ کر اس کے شانے تھام لیے۔ ''عمران کے بازو اتنے کمزور نہیں کہ کوئی حسینہ کو اس سے چھین سکے...... دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمیں ملنے سے نہیں روک سکتی۔''

''عمران......!'' حسینہ سسک پڑی اور اپنا سر عمران کے شانے سے ٹکا دیا......اور عمران اس کی ملائم زُلفوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگا۔

☆......☆......☆

مونا جیسے ہی حسینہ کے کمرے سے نکل کر برآمدے تک آئی۔ موبائل کی بیل بجی، شہریار کا نمبر دیکھ کر ایک جاندار مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں پر بسیرا کر لیا۔

''جی کیا تکلیف ہے جناب کو......؟'' مونا موبائل کانوں سے لگا کر بولی۔

''کتنی سنگ دل ہو تم...... تمہیں ذرا بھی میرا خیال نہیں......'' دوسری طرف شہریار حسرت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''اوں ہونہہ...... بالکل نہیں......''

''اتنی کٹھور نہ بنو...... کہیں ملنے کی سبیل نکالو۔''

''ندیدے نہ بنو...... چند سال صبر کرو۔''

''چند سال کی بچی......! اگر تُو مجھے اب تنگ کرے گی تو شادی کے بعد میں تجھے تنگ کروں گا۔''

''شادی کے خواب دیکھنا چھوڑ دو مجنوں میاں۔ ابھی اگلے پانچ سال میرا شادی کا کوئی پروگرام نہیں۔''

''تو پھر کیا پروگرام ہے......؟'' شہریار حیران تھا۔

''جناب جی پہلے شادی کروں گی اپنے بھائی کی...... حسینہ کو اپنی بھابی کے روپ میں دیکھوں گی۔ ہماری شادی اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک تم ماموں اور میں پھوپھی نہیں بن جاتی۔'' مونا باتیں کرتے کرتے شہریار کے کمرے کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ شہریار صوفے میں دھنسا بیٹھا تھا مونا کو اچانک سامنے پا کر مصنوعی غصّے سے کھڑا ہو گیا۔

''ٹھہر...... پھوپھی کی بچی! میں تجھے بتاتا ہوں۔'' شہریار موبائل صوفے پر پھینک

کر مونا کی طرف لپکا۔ تو مونا ہنستے ہوئے اُلٹے قدموں بھاگی۔ اس کا رُخ بارہ دری کی طرف تھا۔ جس کے گرد پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ شہریار کوشش کے باوجود اسے نہ پکڑ سکا۔ وہ کبھی ایک درخت کے پیچھے چھپ جاتی کبھی کیاریوں کی آڑ لے لیتی۔ لیکن وہ اپنی ہنسی کنٹرول نہ کر سکتی تھی لہٰذا شہریار اسے پالیتا۔ تو مونا اپنی ملائم زُلفوں کو ایک ادا سے اس کے چہرے پر مار کر چکنی مچھلی کی مانند پھسل جاتی۔ دونوں کی یہ آنکھ مچولی کئی منٹ جاری رہی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ ''مونا......!'' ''مونا......!'' شہریار اسے پکار رہا تھا۔ لیکن جواب نہ پا کر پریشان ہو گیا۔

اس نے پھر آوازیں دیں۔ مگر جواب ندارد۔ مسلسل خاموشی۔ نہ کوئی آہٹ، نہ مونا کی ہنسی۔ نہ بھاگنے چھپنے کی سرسراہٹ۔ حویلی کا آنگن پورا جنگل تھا شہریار کہاں تلاش کرتا۔ اچانک مونا کی چیخ سن کر شہریار چونک اُٹھا۔ چیخ خوف سے لبریز تھی۔ چند لمحے سمت کا اندازہ کرنے کے بعد شہریار اندھادھند بھاگتا ایک جگہ پہنچا تو دیکھا سیاہ کالی چمکتی آنکھوں والی صحت مند بلی مونا کے پیر چاٹ رہی تھی جبکہ مونا دہشت زدہ خاموش، پتھرائی نظروں کے ساتھ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ بلی کی آنکھوں سے لیزر لائٹ جیسی نیلی روشنی نکل رہی تھی۔ آہٹ پا کر بلی نے سرعت سے پلٹ کر دیکھا اور شہریار کو گھورتے ہوئے غوں غوں غرانے لگی اور اگلے پنجوں پر زور دے کر جھکی اور شہریار کی طرف جست لگائی۔ شہریار جھکائی دے کر پلٹا اور بلی کی طرف جھپٹا۔ لیکن......اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بلی کو پتہ نہیں آسمان کھا گیا تھا یا زمین نگل گئی۔ شہریار ہونقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اسے مونا کا خیال آیا، تو وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ابھی تک سکتے کے عالم میں تھی اور پھٹی پھٹی نظروں سے شہریار کو تکے جا رہی تھی۔ شہریار اس کی حالت سے بھانپ گیا کہ اگر اسے سنبھالا نہ گیا تو گر پڑے گی اور ہوا بھی یہی۔ جیسے ہی شہریار نے ہاتھ بڑھائے مونا سسکتے ہوئے اس کی بانہوں میں جھول گئی۔

☆......☆......☆

دونوں گھروں کے تمام افراد سر نیہوڑے بیٹھے تھے۔

صورت حال مزید گھمبیر ہو چکی تھی یک نہ شد دو شد والی مثال حقیقت کا روپ ھار چکی تھی۔ پہلے حسینہ اور اب مونا...... پروفیسر ناہید دادی اماں، جہاں آراء بیگم، عمران،

شہریار اور نواب سراج الدین۔ سب کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ پے در پے پُراسرار واقعات سے گھر کا ماحول مکدّر ہو چکا تھا۔ بھوک، پیاس اُڑ چکی تھی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ دونوں لڑکیاں اس وقت قدرے پُرسکون تھیں۔ حسینہ نسبتاً زیادہ ہشاش بشاش تھی۔ رات والے واقعے کے کسی تاثر کا شائبہ تک اس کے چہرے سے عیاں نہ تھا۔ اس کے برعکس مونا سراسیمہ لگتی تھی۔

نواب سراج الدین ٹیلیفون کانوں سے لگائے کسی سے بات کر رہے تھے وہ کافی دیر تک مصروف گفتگو رہے۔ سب کی نظریں نواب صاحب کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ خدا خدا کر کے انہوں نے فون بند کیا۔

''حاجی صاحب کیا کہتے ہیں ابو۔'' شہریار نے فوراً ہی پوچھا۔

''کل کسی وقت حاجی ہمدان حکیم نیاز اللہ کو ساتھ لے کر آئیں گے۔''

''یہ کون ہے بیٹا.....'' دادی اماں نے نواب صاحب سے استفسار کیا۔ ''اماں جی یہ بہت ہی قابل عامل ہیں۔ میں ان کا نام بھول گیا تھا یہ جو میرا دوست ہمدان ہے نا...... ان کا کوئی دوست تھا فیاض۔ یہ بھی ہم جیسی صورت حال سے دوچار ہوا تھا یہ آج سے تقریباً دس برس پہلے کا قصہ ہے۔''

''کیا ان کے گھر میں بھی جنات کا بسیرا تھا؟''

''نہیں بلکہ ہمدان کے دوست فیاض کا بھائی توقیر ایک مشکل میں پھنس گیا تھا۔ اسے اس مشکل سے حکیم نیاز اللہ نے ہی نکالا تھا...... اب انہی حکیم نیاز اللہ کا میں ہمدان سے پتہ کر رہا تھا...... سہ پہر کو فون کیا تو ہمدان نے کہا کہ میں رابطہ کرتا ہوں حکیم صاحب سے۔ اب اس کا فون آیا ہے کہ حکیم صاحب نے کل شام کا وقت دیا ہے۔''

''ہمدان کے دوست کو کیا واقعہ پیش آیا تھا؟'' عمران کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

''ہونے والے داماد کی فرمائش سن کر نواب سراج الدین تھوڑی دیر خاموش رہے پھر کہنے لگے۔'' توقیر کی کہانی بڑی عجیب ہے۔ میں تمہیں ویسے ہی بتاتا ہوں جیسے مجھے ہمدان نے سنائی۔

ہمدان نے مجھے بتایا کہ توقیر ایک دفعہ سیر کرنے نکل گیا۔ شام کو واپس آیا تو عجیب

وغریب بیماری کا شکار ہو چکا تھا۔ یہ ایک نہ سمجھ آنے والی بیماری تھی۔

ایک شام توقیر گھر واپس آیا تو اس کے چہرے کا رنگ زرد تھا۔ اس نے والدہ کو بتایا کہ وہ آج بہت تھک گیا ہے۔ کھانا وغیرہ کھا کر وہ سو گیا۔

رات کے دو بجے تھے جب توقیر دہشت ناک آواز میں چیخ پڑا۔ فیاض اور اس کے والدین نزدیک ہی سو رہے تھے، چیخ سن کر سب جاگ اُٹھے۔ وہ سمجھے کہ توقیر خواب میں ڈر گیا ہے۔ توقیر کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں وحشت ناک چمک تھی۔ اور پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

اہلِ خانہ اس کی یہ حالت دیکھ کر سخت پریشان ہوئے۔ رات کے اس پہر کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سب بے بس تھے۔ کافی دیر تک توقیر کی حالت ایسی ہی رہی اور پھر اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان میں وہی تیز چمک برقرار تھی۔ ایک خوفناک چمک، توقیر کی والدہ نے اس کی آنکھوں کو دیکھا اور دہشت زدہ ہو گئیں۔ اس کے بعد توقیر نے آنکھیں بند کر لیں اور سو گیا۔

گھر والوں کو رات کے باقی حصے میں نیند نہ آئی وہ اس اچانک اور عجیب بیماری سے پریشان ہو گئے تھے۔ اس سے قبل توقیر کو کبھی یہ بیماری نہیں ہوئی تھی تاہم صبح توقیر حسبِ معمول جاگا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور وہ برسوں کا بیمار دکھائی دیتا تھا۔ گھر والوں نے اس کی اس صورت حال کی بابت پوچھا لیکن اس نے لاعلمی ظاہر کی البتہ یہ بتایا کہ اس کی کمر میں درد کی شدید ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔ فیاض کے والد صاحب نے کمر کے اس حصے کو کھول کر دیکھا جہاں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور حیران رہ گئے۔ اس جگہ ایک گول اُبھرا ہوا نشان تھا۔ نشان کے ابھار کسی عبارت کی شکل کے تھے لیکن وہ عبارت کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔

توقیر سے اس نشان کے بارے میں پوچھا گیا لیکن اس نے اس بارے لاعلمی ظاہر کی۔ پھر اس سے پچھلے دن کی مصروفیات پوچھی گئیں لیکن کوئی خاص بات سامنے نہ آئی۔ توقیر نے بتایا کہ وہ اور اس کے دوست پہاڑی پر گئے تھے اور پورا دن انہوں نے وہیں گزارا۔ مزید معلومات حاصل کرنے پر اس کے ایک دوست نے بتایا کہ پہاڑی پر چونے سے بنی ایک قبر تھی جس کے نزدیک بیٹھ کر وہ لوگ کافی دیر تک تاش کھیلتے رہے تھے۔

لیکن اس دوست سے گول سرخ نشان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ دوپہر تک توقیر کی حالت ٹھیک رہی، لیکن ایک بجے کے قریب وہ پھر رات کے انداز میں چیخنے لگا۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو گیا اور آنکھوں میں مشعلیں سی روشن ہو گئیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں مُڑ گئے اور زبان بھی باہر نکل آئی۔ توقیر کی والدہ صدمے اور خوف سے بے حال ہو گئیں۔

تقریباً پندرہ منٹ تک توقیر چیختا چلاتا رہا۔ فیاض ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دوڑ گیا۔ جب وہ ڈاکٹر کو لے کر واپس آیا تو توقیر پُرسکون سو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا لیکن اس بیماری اور زخم کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ سکی۔ اس نے گول سرخ نشان دیکھ کر کہا کہ یہ نشان شاید جل جانے سے بن گیا ہے۔

اور پھر چند دوائیں اور ایک انجکشن دے کر چلا گیا۔ توقیر نے شبہ ظاہر کیا کہ ممکن ہے یہ نشان کسی زہریلے کیڑے کے کاٹنے سے بن گیا ہو اور اس کیڑے کے زہر سے یہ حالت ہو رہی ہو لیکن یہ سب صرف قیاس آرائیاں ہی تھیں اصل بات اللہ ہی جانتا تھا۔

شام کو توقیر کو بخار ہو گیا اور جو تیز ہی ہوتا گیا۔ اب گھر کے سب لوگ گھبرا گئے تھے۔ فیاض نے صورت حال سے آگاہ کیا تو میں اس کے ہاں پہنچا۔

''کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے ہسپتال لے چلو۔'' میں نے مشورہ دیا۔ توقیر کو دیکھ کر مجھے بے حد دکھ ہوا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب آئے ہوئے ہیں۔ ان کا معائنہ مکمل ہو جائے تو فیصلہ کیا جا سکے گا۔'' فیاض نے بتایا۔ وہ روہانسا ہو رہا تھا۔ میں اسے تسلیاں دینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب چلے گئے اور میں فیاض کے ساتھ توقیر کے کمرے کی طرف چل دیا۔ توقیر کی والدہ اس کے سرہانے کرسی پر بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ پھر رونے لگیں اور میں بھی رنجیدہ ہو گیا۔ میں نے جب توقیر کی حالت دیکھی۔ اس وقت وہ آنکھیں بند کیے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

''ڈاکٹروں نے کیا بتایا؟'' میں نے فیاض کی والدہ سے پوچھا۔

''ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا بیٹے! کہہ رہے ہیں ہسپتال بھجوا دیا جائے تاکہ اس

گول نشان کا معائنہ کیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ شاید کوئی زہریلا پھوڑا ہے۔ نہ جانے میرے بچے کو کیا ہو گیا ہے۔" وہ سسکیاں لے کر رونے لگیں۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیسے تسلی دوں۔ توقیر کو ہسپتال داخل کرا دیا گیا۔ گول نشان کا جدید آلات سے معائنہ ہوا لیکن اس میں کسی قسم کے جراثیم یا زہریلے مادے کے آثار نہیں ملے البتہ وہ بڑھتا جا رہا تھا۔ توقیر کے بخار میں کمی ہو گئی تھی لیکن اس کی ذہنی حالت درست نہیں رہی تھی۔ اب وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا تھا۔

فیاض کے والدین کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ میں ان لوگوں کی اس حالت پر بہت کڑھتا لیکن ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا سوائے اس کے کہ ہر وقت ان کے ساتھ رہتا اور انہیں تسلی دیتا۔

توقیر کی کمر کا نشان اب پھوڑا بن گیا۔ اس کا حجم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ڈاکٹر بھی پریشان تھے آخر انہوں نے اس کے آپریشن کا فیصلہ کیا۔ جب انہوں نے آپریشن کیا تو وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ پھوڑے سے کسی قسم کا مواد نہیں نکلا...... وہ بالکل خالی تھا۔

ڈاکٹروں نے زخم کو بجلی سے جلایا۔ کئی دن تک توقیر کی حالت نازک رہی چند دنوں میں پھوڑا پھر سے پھلنے پھولنے لگا اور تین چار دن میں پھر اسی طرح ہو گیا۔

غرض تین بار پھوڑے کا آپریشن کیا گیا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ پھر اسی طرح پھول جاتا۔ فیاض کے والدین نے توقیر کو دوسرے شہر لے جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے والد صاحب سے اس کے ساتھ جانے کی اجازت لے لی اور پھر ہم لوگ ساتھ ہی دوسرے شہر پہنچ گئے۔

شہر کے ماہر سرجنوں نے پھوڑے کا معائنہ کیا۔ یہاں بھی دو آپریشن ہوئے اور ن کا نتیجہ بھی پہلے سے مختلف نہیں تھا۔

توقیر اب مکمل دیوانہ ہو گیا تھا۔ اسے اپنی تکلیف کا بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہر وقت ٹ سیدھی حرکتیں کرتا۔ کبھی ہنستا کبھی رونے لگتا اور کبھی اس پر تشنج کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔

پھر قدرت کی نگاہِ کرم ہوئی اور توقیر کی والدہ کی دعائیں قبول ہو گئیں۔ توقیر کچھ بھلا تو اس روز فیصلہ کیا گیا کہ دوسرے دن ہسپتال سے رخصت لے لی جائے۔ توقیر کی ہ اس کی مسہری کی پائنتی لگی بیٹھی تھیں۔ قریب کے بستر والے مریض کو دیکھنے کے لیے

چند خواتین آئیں۔ ان میں سے ایک معمر خاتون نے توقیر کو دیکھا اور اس کی والدہ سے اس کی بیماری کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ توقیر کی والدہ نے آنسو بھری آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز میں اپنے بیٹے کی کہانی سنائی جسے سن کر وہ خاتون بھی رونے لگیں۔

''بہن! میری مانو تو یہ ڈاکٹروں کا علاج چھوڑو۔ کسی عامل کو دکھاؤ۔ یہ بیماری نہیں کوئی اور ہی چکر معلوم پڑتا ہے۔''

توقیر کی والدہ تعلیم یافتہ خاتون تھیں لیکن بیٹے کی حالت پر خود اعتمادی کھو چکی تھیں۔ بات ان کے دماغ میں بیٹھ گئی اور انہوں نے خاتون سے پوچھا کہ اگر وہ کسی عامل کو جانتی ہوں تو بتائیں۔ جواب میں خاتون نے ایک عامل صاحب کا پتہ بتا دیا۔ دوسرے دن ہسپتال سے رخصت لے لی گئی۔ فوری طور پر ایک خوبصورت علاقے میں مکان کا بندوبست کرلیا گیا اور سب وہاں منتقل ہو گئے۔

میں بہ دستور ان کے ساتھ تھا۔ ہر معاملے میں پیش پیش۔ فیاض اور اس کے والدین میرے بہت احسان مند ہو گئے۔ اس کی والدہ ہر وقت مجھے دعائیں دیتیں اور کہتیں کہ میری موجودگی سے انہیں بہت ڈھارس ہے۔

بہرحال ہم ان عامل صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ اچھا خاصا مکان تھا جس کے ایک کمرے میں بابا کا قیام تھا۔ خود بابا صاحب اس کمرے کو بابا کی کٹیا کہتے تھے۔ ایک طرف تعویذوں کے لیے کاغذ رکھا تھا، دوسری طرف بوتلیں سجی تھیں جن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ ان بوتلوں میں ہر مرض کا پانی ہے۔ پیٹ میں درد ہو، کان میں درد ہو، داڑھوں میں درد ہو، بچے کو نظر لگ گئی ہو، دست آ رہے ہوں، بوتلوں میں موجود پانی ہر مرض میں شافی تھا۔

عامل صاحب نے توقیر کے بارے میں تفصیل سنی اور اس انداز میں مسکرا کر گردن ہلانے لگے جیسے اس تمام ڈرامے کے ذمہ دار وہ خود ہی ہیں۔ پھر انہوں نے ایک سیاہ مرغ اور مرغی کا جوڑا طلب کیا جن کے پروں پر وہ توقیر کے لیے تعویذ لکھنا چاہتے تھے۔ سوگز لٹھا، پانچ ہزار روپے اور ایک تسبیح طلب کی اور ہم یہ چیزیں لانے کا وعدہ کر کے اُٹھ گئے۔

راستے میں، میں نے فیاض سے کہا۔ ''یار فیاض! مجھے تو یہ بابا صاحب بالکل نہیں جچے تم نے ان کے سرخ ٹماٹروں جیسے گالوں کو دیکھا یقیناً یہ انہی کالی مرغیوں کا کرشمہ ہے جن

کے پروں پر وہ تعویذ لکھتے ہیں۔''

فیاض کے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے بھی یہی کہا کہ عامل صاحب فراڈ ہیں۔ بہرحال ہم نے والدہ سے عامل صاحب کی طلب کی ہوئی اشیاء کے بارے میں کہا اور انہوں نے ہماری بدعقیدگی پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے وہ سامان عامل صاحب کے پاس بھجوا دیا۔ عامل صاحب ایک ہفتے تک فیاض کی ماں سے مال اینٹھتے رہے لیکن فائدے کی کوئی شکل نظر نہ آئی تھی۔ تب فیاض کی والدہ بھی بددل ہوگئیں اور کسی اور عامل کی تلاش شروع ہوگئی۔

دواؤں کا مرحلہ ختم ہو چکا تھا۔ اب صرف دعاؤں کی بات تھی۔ فیاض کی والدہ نے رات دن ایک کر دیا تھا۔ ہر وقت مصلے پر ہوتیں۔ توقیر کی بیماری جوں کی توں تھی۔ پھوڑا کرکٹ کی گیند کے برابر ہوگیا تھا۔ اس کا رنگ ہلکا پیلا تھا جس سے اس کے زہریلے ہونے کا اندازہ ہوتا تھا۔ توقیر ہر وقت پڑا بڑبڑاتا رہتا۔ کبھی کبھی اس پر دورہ بھی پڑ جاتا۔ لیکن اب اس دورے کی دوسرے لوگوں کی نظروں میں بہت زیادہ اہمیت نہیں رہی تھی کیونکہ سب اس کے عادی ہو چکے تھے اور قطعی بے بس تھے۔

ایک شام میں اور فیاض ایک نواحی بستی کے بس اسٹاپ پر کھڑے ٹیکسی کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک ہی روٹ کی دو بسیں دوڑ لگاتی ہوئی آئیں۔ ایک بس کی سواریوں کو اسٹاپ پر اترنا تھا لیکن ڈرائیور کو جلدی تھی کہ دوسری آگے نہ نکل جائے چنانچہ اس نے ایک لمحے کے لیے بس کی رفتار سست کی اور دو نوجوان دھم دھم کر کے بس سے نیچے کود گئے۔ ان کے آگے یک باریش بزرگ اترنا چاہتے تھے، لیکن نوجوان انہیں پیچھے دھکیل کر پہلے خود کود گئے، اتنے بس ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ ناچار بزرگ بھی نیچے کود پڑے اور گر گئے۔ ہم دونوں ان کے بالکل نزدیک تھے۔ بس ڈرائیور اور ان نوجوانوں کی بدتمیزی پر سخت طیش آیا۔ تاہم ہم نے بزرگ کو جلدی سے اٹھایا۔ وہ کراہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے ان کے گھٹنوں پر چوٹ ئی تھی اور سفید پاجامے پر خون کے دھبے بھی لگ گئے تھے۔

''اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا اجر دے بچو!'' انہوں نے دُعا دی۔ بس ڈرائیور اور ان جوانوں کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں کہا۔

"ڈرائیوروں کے سلسلے میں قانون بالکل بے بس ہوگیا ہے میں نے بس کا نمبر نوٹ کرلیا ہے۔ آپ پولیس میں رپورٹ درج کرادیں۔" فیاض نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اللہ انہیں نیک ہدایت دے جو ہونا تھا ہوگیا اب رہنے دو۔" انہوں نے جلدی سے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ہم ان کی نیک فطرت سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

"آپ کے گھٹنوں میں زخم ہیں۔ ہم آپ کو گھر پہنچا دیتے ہیں۔ آپ ہمارا سہارا لے لیجئے۔"

"ہمیشہ خوش رہو بیٹے! میں تکلیف دینے پر شرمندہ ہوں لیکن خود بھی محسوس کر رہا ہوں کہ اپنے قدموں سے چل کر نہ جا سکوں گا۔ میرا گھر وہ سامنے نظر آرہا ہے مجھے وہاں تک پہنچا دو۔" انہوں نے کہا۔

ہمیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ ہم انہیں سہارا دے کر ان کے کوارٹر کی طرف چل دیئے چند لمحوں کی مسافت کے بعد کوارٹر آ گیا۔ انہوں نے علی کہہ کر کسی کو آواز دی اور کوارٹر سے گیارہ بارہ سال کا ایک لڑکا نکل آیا۔

"پردہ کراؤ بیٹے کچھ مہمان آئے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

لڑکا ان کے گھٹنوں سے رِستا ہوا خون اور ان کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ تاہم اس نے کہا کچھ نہیں، تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے بزرگ کو اندر ایک چارپائی پر پہنچا دیا اور اجازت طلب کی۔

"اوہ بیٹے! ابھی نہیں۔ ایک ایک پیالی چائے پی لو تو مجھے مسرت ہوگی۔"

"آپ گھٹنے کے زخم صاف کرائیے۔ ہمیں اجازت دیجئے۔" میں نے کہا۔

"ارے نہیں بیٹے......! تم بیٹھو میں تمہیں چائے کے بغیر نہیں جانے دوں گا۔ علی!" انہوں نے لڑکے کو آواز دی اور لڑکا ان کے قریب پہنچ گیا۔ "میں ابھی آیا۔ تم آرام سے بیٹھو۔" انہوں نے لڑکے کا سہارا لے کر اُٹھتے ہوئے کہا اور ہم مجبوراً دوسری چارپائی پ بیٹھ گئے۔ تقریباً چھ منٹ کے بعد وہ واپس آئے۔ انہوں نے دوسرا پائجامہ پہن لیا تھا چارپائی پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے اندر رُخ کر کے کہا۔

''چائے بھیج دو۔'' فوراً ہی ٹین کے ٹرے میں صاف ستھری پیالیوں میں چائے آ گئی۔ چائے کے دوران انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ ''میرا نام نیاز اللہ ہے۔ حکیم ہوں اور ایک چھوٹی سی دکان ہے جسے مطب بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت مطب سے ہی واپس آ رہا تھا کہ......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئے اور چند لمحات کے بعد بولے......

''کیا میں آپ دونوں کا تعارف حاصل کر سکتا ہوں؟''

''میرا نام ہمدان ہے اور یہ میرے دوست فیاض ہیں۔'' میں نے جواب دیا اور وہ گردن ہلانے لگے اور ہم خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ چائے ختم ہو گئی تو وہی لڑکا پیالیاں واپس لے گیا اور ہم دونوں نے اجازت طلب کی۔

''اگر جلدی نہ ہو تو کچھ دیر اور بیٹھو بیٹے میں بڑی اپنائیت محسوس کر رہا ہوں۔'' وہ بڑے خلوص سے بولے۔

ہم ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ گو وہ معمولی سے کوارٹر میں رہتے تھے لیکن جس قدر پاکیزہ ماحول تھا اور جس انداز کے وہ لوگ نظر آ رہے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کبھی بہت اچھے دن دیکھے ہوں گے۔ اس دوران ایک بات میں نے محسوس کیا کہ حکیم نیاز اللہ کے چہرے پر کبھی کبھی کشمکش کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔

ہم مزید کچھ دیر ان کے پاس بیٹھے۔ حکیم صاحب ہم سے ہمارے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ ہم نے دوبارہ اجازت طلب کی تو وہ بسم اللہ کہہ کر کھڑے ہو گئے۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود وہ دروازے تک آئے اور مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔

''میاں! اگر بُرا نہ مانو تو مجھے اپنے گھر کا پتہ دے دو۔ کل حاضر ہوں گا۔''

''ضرور حکیم صاحب!'' میں نے کہا اور مکان کا پتہ لکھوا دیا اور وہاں سے چلے آئے۔ گھر پہنچے تو سب پریشان تھے۔ توقیر پر پھر دورہ پڑا تھا اور اس کی وہی حالت تھی۔ فیاض کے والد مصلّے پر بیٹھے رو رو کر دعائیں مانگ رہے تھے ان کے الفاظ میرے دل میں تیر کی طرح اُتر گئے اور میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''یا اللہ! اگر توقیر کے نصیب میں صحت نہیں ہے تو اسے اُٹھا لے۔ تیرے کام تو ہی جانتا ہے ہم اس کی تکلیف نہیں دیکھ سکتے۔''

ایک باپ اپنے بیٹے کے لیے موت کی دعا مانگ رہا تھا۔ ماحول بے حد سوگوار تھا۔ فیاض کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ فیاض کی والدہ کو دوسرے کمرے میں لٹا دیا گیا تھا کیونکہ ان کی حالت بگڑنے کا بھی اندیشہ ہوتا تھا۔ توقیر حسبِ معمول تڑپتا رہا۔ اس کی کمر کا پھوڑا اب کرکٹ کے گیند سے بھی بڑا ہو گیا تھا۔ کافی دیر بعد وہ کچھ پُرسکون ہوا اور پھر سو گیا۔

''دوسرے دن ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دروازے پر دستک سنائی دی اور فیاض دروازے کی طرف چل دیا۔ کسی نے سلام کیا تو میں نے حکیم صاحب کی آواز پہچان لی۔ فیاض ڈرائنگ روم کھولنے چلا گیا۔

''کون ہے؟'' فیاض کی والدہ نے پوچھا اور میں نے مختصراً گزرے ہوئے دن کا واقعہ سنا دیا۔ ''انہیں ناشتہ وغیرہ کراؤ۔''

''میں ناشتہ کر کے آیا ہوں۔'' حکیم صاحب نے کہا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں وہی کشمکش دیکھی جیسی گذشتہ روز دیکھ چکا تھا۔ بہت اصرار پر انہوں نے چائے پی لی اور پھر بولے۔

''مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کسی پریشانی میں مبتلا ہیں۔ فرمایئے میرے لائق کیا خدمت ہے۔'' جواب میں توقیر کے والد نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر توقیر کے بارے میں تفصیل بتا دی۔ میں نے حکیم صاحب کی آنکھوں میں اطمینان کے آثار دیکھے۔ کشمکش دور ہو گئی تھی اور سکون سے تفصیل سنتے رہے اور پھر بولے۔

''اللہ تعالیٰ اسے شفا عطا فرمائے۔ کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔''

''ضرور۔ میں پردہ کرائے دیتا ہوں۔'' فیاض کے والد بولے اور اُٹھ کر اندر چلے گئے اور پھر ہمیں آواز دی اور ہم حکیم صاحب کے ساتھ اندر پہنچ گئے۔ میں اور فیاض پہلے اندر داخل ہوئے۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے دروازے میں قدم رکھا۔ توقیر اس وقت آنکھیں بند کیے لیٹا تھا لیکن جوں ہی حکیم صاحب نے اندر قدم رکھا اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت بھی وہی وحشیانہ چمک تھی اور اس کی نظریں حکیم صاحب پر جم کر رہ گئیں۔

حکیم صاحب آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور توقیر کی چارپائی کے نزدیک پہنچ گئے۔ توقیر جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ حالانکہ اس سے قبل اسے سہارے کے بغیر نہیں اُٹھایا جا سکتا

تھا۔ہم سب نے اس کو حیرت سے دیکھا۔حکیم صاحب ایک خاص انداز میں مسکرا رہے تھے اور توقیر کے چہرے پر خوف کے آثار گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ پھر اس کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''سلام عرض کرتا ہوں سیّد صاحب!''

''وعلیکم السلام۔'' حکیم صاحب نے خوش اخلاقی سے کہا۔ہم سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے کیونکہ توقیر کے حلق سے جو آواز نکلی تھی وہ اس کی نہیں تھی بلکہ اس میں سختی تھی۔

''کیا بات ہے میاں! بچے کو کیوں پریشان کر رہے ہو؟'' حکیم صاحب نے بڑی ملائمت اور اپنائیت سے پوچھا۔

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے سیّد صاحب! براہ کرم اس میں دخل اندازی نہ کریں۔'' توقیر نے اسی آواز میں کہا۔

''بُری بات ہے میاں......! بفضلِ تعالیٰ تم مسلمان ہو، ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔کیا تمہیں ان لوگوں کی حالت پر رحم نہیں آتا۔'' حکیم صاحب نے ایک بار پھر نرمی سے بات کی۔

''میں کہہ چکا ہوں سیّد صاحب! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔آپ اس میں دخل نہ دیں۔'' توقیر اسی بدلی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں تمہیں ظلم سے روک رہا ہوں ہر مسلمان کے مسائل دوسرے کے لیے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔'' حکیم صاحب نے حلیم لہجے میں کہا۔

''اگر آپ نے میرے خلاف کچھ کیا تو میں اس کی جان لے لوں گا۔'' توقیر نے کہا۔

''تم جانتے ہو زندگی اور موت ربِّ حقیقی کی پابند ہے۔تمہارے یہ الفاظ شریعت سے انحراف کے مترادف ہیں۔ چنانچہ تمہارے کیے کی سزا لازمی ہو گئی ہے۔'' حکیم صاحب کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور جلال جھلکنے لگا۔ہم سب لوگ بُت بنے حکیم صاحب اور توقیر کی گفتگو سن رہے تھے۔توقیر جب سے بیمار ہوا تھا اس وقت سے اب تک اس نے اتنی گفتگو نہیں کی تھی اور یہ گفتگو اس کی اپنی نہیں تھی۔کوئی اور اس کی زبان سے بول رہا تھا۔

''مجھ سے بگاڑ کر آپ نقصان میں رہیں گے سید صاحب! سوچ لیں۔'' توقیر نے کہا۔

''ایک کٹورے میں پانی اور صاف بوتل لے آؤ۔'' میں فوراً باہر کی طرف دوڑا اور چند لمحوں میں حکیم صاحب کی مطلوبہ چیزیں لاکر ان کے سامنے رکھ دیں۔

''حکیم صاحب نے تھوڑا سا پانی لے کر کلی کی اور پھر ایک طرف بیٹھ کر کچھ پڑھنے لگے۔ توقیر کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جا رہا تھا اور پھر اس پر وہی دورہ پڑنا شروع ہو گیا۔ لیکن حکیم صاحب پُرسکون انداز میں پڑھ رہے تھے۔ اچانک توقیر پلنگ سے نیچے گر پڑا اور فیاض کے والد اسے اٹھانے کے لیے لپکے تو حکیم صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں منع کر دیا۔ فیاض کے والد مضطرب انداز میں رُک گئے۔ چند منٹ کے بعد حکیم صاحب نے دم کیا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

''اُٹھ کر بیٹھ جاؤ میاں۔'' اور توقیر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ خونخوار نظروں سے حکیم صاحب کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اب بتاؤ کیا چاہتے ہو؟''

توقیر کچھ نہ بولا۔ اس کے ہونٹ کچھ پڑھنے کے انداز میں ہل رہے تھے۔ حکیم صاحب ہنسنے لگے پھر ہماری طرف رُخ کر کے کہا۔

''آپ لوگ یا تو کمرے سے باہر چلے جائیں یا پھر اس حصار سے باہر نہ نکلئے گا۔''

انہوں نے انگلی سے فرش پر ایک دائرہ بنایا اور ہم لوگ اس دائرے میں آ کھڑے ہوئے۔ باہر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ دفعتاً توقیر کھڑا ہو گیا اور اس نے زمین کی طرف پھونک ماری۔ ہم لوگوں نے خوف و دہشت سے دیکھا جس جگہ پھونک ماری گئی تھی وہاں سیاہ رنگ کا ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ سانپ نے پھنکار ماری اس کی نظریں حکیم صاحب پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے دوسری پھنکار ماری اور حکیم صاحب کی طرف لپکا ہم لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ حکیم صاحب نے مٹھی بند کر کے سانپ کے سامنے کر دی اور سانپ نے ان کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔ حکیم صاحب نے دوسرا ہاتھ بھی سامنے کر دیا سانپ نے اس پر بھی کاٹ لیا۔

ہماری سانسیں جیسے رک گئی ہوں لیکن حکیم صاحب پہلے کی طرح مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے ایک انگلی کٹورے میں ڈالی اور پانی سانپ کی کاٹی ہوئی جگہوں پر لگایا۔ پھر انہوں نے پانچوں انگلیاں پانی میں ڈبوئیں اور ان کے چھینٹے سانپ پر مار دیئے۔ سانپ نے پھن

زمین پر ڈال دیا اور بُری طرح تڑپنے لگا۔ چند ثانیے بعد ہم نے اس کے پورے جسم سے دھواں اُٹھتے دیکھا اور چند منٹ بعد وہاں راکھ پڑی تھی۔

''تمہارا یہ سانپ تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا میاں کچھ اور کوشش کرو۔''

''میں آپ کو فنا کر دوں گا سید صاحب!'' توقیر کی غرائی ہوئی آواز سنائی دی اور اچانک توقیر نے منہ کھول کر ''ہا'' کی آواز نکالی۔ اس کی آنکھیں بے حد خوفناک ہو رہی تھیں اور ہمارا دہشت سے بُرا حال تھا۔

''ہا'' کی آواز کے ساتھ اس کے منہ سے شعلوں کی لپٹیں نکل پڑیں۔ یہ شعلے حکیم صاحب کی طرف لپکے۔ توقیر کا منہ مسلسل شعلے اُگل رہا تھا اور حکیم صاحب کا جسم ان کی زد میں تھا۔ قریب تھا کہ ہم چیختے ہوئے بھاگ نکلتے کہ ہمیں حکیم صاحب کی آواز سنائی دی۔

''آپ لوگ اس دائرے سے باہر نہ نکلیے گا۔''

حکیم صاحب کی بات سن کر ہمارے پاؤں زمین پر جم گئے ہم نے حیرت زدہ نظروں سے حکیم صاحب کی طرف دیکھا تو دم بخود رہ گئے۔ شعلے حکیم صاحب کے گرد رقص کر رہے تھے اور وہ اطمینان سے کٹورے کا پانی بوتل میں ڈال رہے تھے۔ آدھا پانی انہوں نے بوتل میں ڈال دیا اور آدھا کٹورے میں ہی رہنے دیا۔ پھر انہوں نے دونوں ہاتھ فضا میں لہرائے تو شعلے غائب ہو گئے۔

'ایک کوشش اور کر لو! میاں اس کے بعد میری باری ہے۔''

''سید صاحب! اگر میں نے اسے چھوڑ دیا تو میرا کیا ہوگا؟ میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔''

''تم اپنی شکل میں بھی زندہ رہ سکتے ہو۔ جو کچھ کیا ہے وہ اب بھگتنا ہوگا۔'' حکیم صاحب نے کہا اور کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے کٹورے کا بقیہ پانی توقیر پر اُچھال دیا۔ توقیر کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ وہ پورے کمرے میں چیختا پھر رہا تھا۔ حکیم صاحب کھڑے ہو گئے اور آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور سکون سے اُسے دیکھنے لگے۔ توقیر کمرے میں لوٹ رہا تھا اور چیخیں مار رہا تھا۔

''معاف کر دو سید صاحب! معاف کر دو۔ ہائے میں مر گیا۔ معاف کر دو۔ ورنہ میں مر جاؤں گا۔ ہائے...... ہائے...... آہ...... ہائے میں مرا...... میں مر گیا۔ خدا کے لیے

مجھے معاف کر دو۔"

"خوب تو تم نے خدا کا نام لیا تو سہی، ورنہ تم تو فرعون بن گئے تھے۔" حکیم صاحب نے کہا اور پھر کچھ پڑھ کر توقیر کی طرف پھونک ماردی۔ توقیر زمین پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ وہ سہی ہوئی نظروں سے حکیم صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ "اب کیا خیال ہے؟" حکیم صاحب نے پوچھا۔

"میں واپس چلا جاؤں گا سید صاحب! پھر اپنی پچھلی زندگی میں واپس چلا جاؤں گا۔"

"مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"میرا نام ابوسعید ہے۔ مجھ سے ایک غلطی ہوگئی تھی جس کی سزا میں ہمارے شہنشاہ نے میری ہیئت تبدیل کر دی اور میں ایک قبر میں رہنے لگا۔ اپنی دنیا سے میرا رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں ۹۰ برس سے اس قید میں زندگی گزار رہا تھا۔ پھر یہ آیا اس کے ساتھ دو لڑکے اور بھی تھے۔ یہ قبر کے اس حصے سے پشت لگا کر بیٹھ گیا جہاں سے قبر میں جانے کا راستہ تھا۔ ہوا بند ہوئی تو مجھے پتہ چلا اور میں اس کی پشت میں داخل ہو گیا۔ اس طرح مجھے انسانی جسم مل گیا۔ مگر آپ نے...... آپ نے...... مجھے بڑی سزا دی ہے سید صاحب!"

"تم مشیتِ ایزدی میں دخل دینے لگے تھے ابوسعید! میں نے تم سے مصالحت کی گفتگو کی تھی۔ مجھے مجبوراً یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ خیر اب تم اس بوتل میں آ جاؤ۔ میں تمہیں واپس تمہاری جگہ پر بھجوا دوں گا۔"

توقیر خاموشی سے اوندھا لیٹ گیا۔ حکیم صاحب نے اس کی قمیض پیچھے سے ہٹا کر پھوڑا کھول لیا اور پھر ہم نے اپنی زندگی کا سب سے حیرت انگیز منظر دیکھا۔ توقیر کا پھوڑا درمیان سے کھل گیا اور اس میں سے کوئی سرخ رنگ کی شے نکلی اور رینگتی ہوئی توقیر کی کمر پر آ گئی۔

ہم نے خوفزدہ نظروں اور دھڑکتے دل سے دیکھا۔ وہ سرخ رنگ کا ایک بچھو تھا۔ انتہائی خوف ناک بچھو جس کا منہ سیاہ تھا۔ ٹانگیں لمبی اور پتلی اور رنگ گہرا سرخ۔ وہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا بوتل کی طرف گیا اور پھر بوتل کے اوپر چڑھنے لگا اور اس کے منہ میں داخل ہو گیا۔ حکیم صاحب نے بوتل کا منہ ڈھکن سے بند کر دیا اور ہمیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"بچے کو مسہری پر لٹا دیں۔" فیاض کے والد بے ساختہ دوڑے اور حکیم صاحب

کے قدموں میں گر پڑے۔ ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اور فیاض نے توقیر کو اُٹھا کر مسہری پر لٹا دیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

حکیم صاحب نے جلدی سے فیاض کے والد کو اٹھایا اور لرزتے ہوئے بولے۔

''کیا کر رہے ہیں آپ! کیوں مجھے گنہگار کر رہے ہیں۔ میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔ مجھے اوپر سے حکم ملا تھا کہ ابو سعید کو ایک مسلمان کو پریشان کرنے سے روکو اور میں بے چین تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے کامران کیا بس اب مجھے اجازت دیجئے۔''

''ابھی نہیں، مجھے کچھ خدمت کا موقع دیجئے۔'' فیاض کے والد نے کہا۔

''براہِ کرم جس خدمت کا تصور آپ کے ذہن میں ہے اسے نکال دیجئے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے میرے پاس۔ بس دعائے خیر کی ضرورت ہے۔'' حکیم صاحب نے جواب دیا۔ پھر بوتل اُٹھائی اور میری طرف رُخ کر کے بولے۔

''ہمدان میاں اجازت چاہیے......''

میں انہیں چھوڑنے باہر تک گیا۔ میں دل سے حکیم صاحب کا معتقد ہو گیا تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ شام کو ملاقات کا موقع دیں۔

''غریب خانہ حاضر ہے جب دل چاہے آؤ۔'' انہوں نے گرم جوشی سے کہا۔

میں انہیں رخصت کر کے اندر چلا آیا۔ اندر فیاض کی والدہ سجدۂ شکر ادا کر رہی تھیں۔ ان کی سسکیاں جاری تھیں۔ فیاض نے بتایا کہ توقیر نے اسے بھائی جان کہہ کر مخاطب کیا اور پانی مانگا تھا۔ ہم سب کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ فیاض کے والد صاحب بار بار حکیم صاحب کے بارے میں استفسار کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اللہ کے حضور ان کی دعا قبول ہوئی۔ حکیم صاحب رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئے۔ میں نے حکیم صاحب کی آنکھوں کی کشمکش کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان بزرگ صفت انسان سے ہماری پریشانی کہاں چھپی رہی ہو گی اگرچہ انہوں نے صاف طور پر نہیں کہا تھا مگر وہ ہر قیمت پر یہاں آنا چاہتے تھے۔''

شام کو حیرت انگیز طور پر پھوڑے کا نشان تک غائب ہو گیا اور توقیر باقاعدہ گفتگو کرنے لگا۔ جس مصیبت میں ہم سب عرصہ سے گرفتار تھے وہ چند گھنٹوں میں ہی دور ہو گئی۔ اسی شام ہم پھول اور مٹھائی لے کر حکیم صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ اطلاع ملتے ہی حکیم

صاحب نے اندر بلایا۔ فیاض کے والد صاحب بھی ساتھ تھے انہوں نے حکیم صاحب کا ہاتھ چومنا چاہا تو حکیم صاحب نے اپنا ہاتھ جلدی سے پیچھے ہٹا لیا۔

''میں بھی آپ کی طرح ایک گنہگار انسان ہوں۔ یہ مناسب نہیں ہے اور یہ نذرو غیرہ بھی قبول نہیں کروں گا البتہ آپ حکم دیں تو مٹھائی پر نیاز کر دوں۔ باہر بچوں کو تقسیم کر دیں۔''

ہم لوگ بڑا خوشگوار تاثر لیے حکیم صاحب کے گھر سے واپس آئے۔

توقیر کو اب کوئی بیماری نہیں تھی۔ صرف کمزوری تھی۔ فیصلہ کیا گیا کہ اُس وقت تک اسی شہر میں قیام کیا جائے جب تک توقیر بالکل تندرست نہیں ہو جاتا۔

اُداسیاں چھٹ چکی تھیں سب خوش و خرم تھے اور خوب سیر و تفریح کرتے رہے۔

توقیر تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ حکیم صاحب سے روزانہ ملاقات ہمارا معمول بن گئی۔ وہ بھی ہم سے بے حد مانوس ہو گئے تھے۔ نہ صرف وہ بلکہ ان کے گھر کے تمام لوگ پابند شرع تھے۔ اتنے دن سے ہم جا رہے تھے لیکن ان کے گھر کی کسی خاتون کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔ ویسے ہمیں حیرت تھی کہ حکیم صاحب اتنی عظیم شخصیت کے مالک تھے مگر ان کی زندگی بے حد سادہ تھی۔ بچے تک پیوند لگے کپڑے پہنتے تھے۔ مطب سے مناسب آمدنی تھی۔ مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ لیکن حکیم صاحب اتنے معمولی پیسے لیتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ روزانہ کئی نادار مریضوں کو مفت دوا دی جاتی تھی۔

حکیم صاحب ایک دن بڑے خوشگوار موڈ میں تھے میں ان سے خاص طور پر بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔ انہیں خوش و خرم دیکھ کر میں کہہ بیٹھا۔

''حکیم صاحب! اس قدر عظیم قوتوں کے مالک ہوتے ہوئے بھی اپنے لیے کچھ نہیں کرتے میرا مطلب ہے اپنے بچوں پر بھی نگاہ کریں۔ انہیں اچھی زندگی دینا بھی آپ کا فرض ہے۔'' میری بات پر پہلے وہ قدرے سنجیدہ ہوئے اور پھر مسکرا کر بولے۔

''میاں میں حتی المقدور محنت کرتا ہوں۔ جو کچھ اپنے طور پر کماتا ہوں بچوں کے سپرد کر دیتا ہوں۔ اس سے زیادہ میرے بس میں نہیں ہے اور بحمداللہ میرے بچے مطمئن ہیں۔ رہا ان عظیم قوتوں کا معاملہ جن کا تم نے ذکر کیا ہے تو میں ان قوتوں کا مالک نہیں ہوں۔ میں تو معبودِ حقیقی کا ایک گنہگار بندہ ہوں اس نے جو قوتیں میرے سپرد کی ہیں ان کی حفاظت

کی کوشش کرتا ہوں اور میں انہیں اس کے حکم کے مطابق ہی خرچ کرتا ہوں کیا میں امانت میں خیانت کروں؟''

''یہ بچے بھی خدا کی امانت ہیں حکیم صاحب! معاف کیجئے گا آپ نے بے تکلفی کی اجازت دی ہے اس لیے یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ انہیں اچھی زندگی دینا بھی آپ ہی کا فرض ہے۔''

''جو کچھ ان کے لیے کر رہا ہوں اس سے زیادہ کرنا میرے بس میں نہیں ہے بیٹے! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے بچے صبر کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان کے دل کی کوئی خواہش تشنہ نہیں ہے جبکہ اللہ کے فضل سے میں انہیں دنیا کی ہر شے مہیا کر سکتا ہوں۔''

''میں مانتا ہوں حکیم صاحب! لیکن بنیادی ضرورتیں۔ میرا مطلب ہے......'' میں نے کہا۔

''میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ تمہاری مراد آسائش کی چیزوں سے ہوگی۔''

''آسائش کی نہیں ضرورت کی۔''

میری بات سن کر انہوں نے شانے پر پڑا بڑا سا رومال اتارا اور چارپائی پر ڈال دیا۔ چند لمحوں بعد انہوں نے رومال اٹھایا تو میں دنگ رہ گیا۔

رومال کے نیچے ایک تھال موجود تھا جس میں انتہائی نفیس مٹھائی بھری ہوئی تھی۔ انہوں نے مٹھائی میں سے ایک ٹکڑا مجھے دیا اور پھر اپنے لڑکے کو آواز دی۔

لڑکا اندر آ گیا۔ ''بیٹا! یہ مٹھائی محلے کے بچوں میں تقسیم کر دو۔''

''جی ابا جان!'' لڑکے نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں مٹھائی کے لیے کوئی دلچسپی نظر نہیں آ رہی تھی۔

وہ تھال لے کر باہر نکل گیا اور باہر بچوں کا شور سنائی دینے لگا۔ پھر وہ واپس آیا اور خالی تھال چارپائی پر رکھ دیا۔ حکیم صاحب نے مسکراتے ہوئے تھال پر دوبارہ رومال ڈال دیا۔ لڑکا خاموشی سے اندر چلا گیا۔

''یہ سب کچھ میرے اوپر قرض ہے بیٹے! اور میں اس میں سے اپنے لیے کچھ نہیں لے سکتا۔''

میں عقیدت بھری نگاہوں سے حکیم صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے پوچھا۔

''حکیم صاحب! آپ جس دن پہلی بار ہمیں ملے تھے۔ میرا مطلب ہے جس روز آپ کے ساتھ بس کا حادثہ پیش آیا تھا۔ اس دن آپ کو ہماری پریشانی کا حال معلوم تھا؟''

حکیم صاحب کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ ان کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ پھر انہوں نے کہا۔

''یہ سوال ضروری ہے؟''

''میری خواہش ہے کہ آپ بتائیں۔'' میں نے کہا۔

''بہت اصرار کر رہے ہو۔ اللہ گواہ ہے کہ میں تمہیں یہ بات شہرت حاصل کرنے کے لیے نہیں بتا رہا۔''

''مجھے یقین ہے حکیم صاحب!'' میں نے کہا۔

''وہ حادثہ اسی لیے ہوا تھا کہ میں تم سے متعارف ہو جاؤں۔''

میں گنگ بیٹھا ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''آپ کسی کشمکش کا شکار نظر آتے تھے حکیم صاحب!''

''ہاں۔''

''اس کی کیا وجہ تھی؟''

''میں چاہتا تھا کہ تم توقیر کی بیماری کا تذکرہ کرو تا کہ میں اسے دیکھ لوں۔''

''اوہ مگر آپ نے اس کا اظہار نہیں کیا؟''

''میں نے کہا نا کہ میں تم پر اپنی قابلیت کا رعب نہیں ڈالنا چاہتا تھا لیکن تم اس موضوع پر آئے ہی نہیں...... مجبوراً مجھے ابتدا کرنی پڑی اور میں نے تم سے تمہارا پتہ معلوم کیا...... حالانکہ......'' حکیم صاحب رُک گئے۔

''جی...... حالانکہ......؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''حالانکہ مجھے تمہارا گھر معلوم تھا۔''

''میں یقین کر سکتا ہوں!''

''بس بیٹے! میری حیثیت ایک کوتوال کی سمجھو جسے اپنے علاقے کے تمام افراد کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ یہ سب روحانیت کی باتیں ہیں بیٹے! کیا کرو گے ان کی

تفصیل جان کر۔"

"پھر بھی کچھ تو بتائیں حکیم صاحب۔ مجھے بہت دلچسپی ہے۔"

"کوتوال ان مجرموں کی فہرست بھی رکھتا ہے، جو جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ میری فہرست کا ایک مجرم غائب تھا۔ مجھے اس کی تلاش ہوئی۔ پتہ چلا کہ وہ تم لوگوں کو پریشان کر رہا ہے۔"

"بہت خوب پھر......؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"بس مجھے اس کی گرفتاری کا بندوبست کرنا پڑا۔"

میں حکیم صاحب سے متاثر تو تھا ہی ان باتوں نے مجھے ان کا معتقد بنا دیا۔ حکیم صاحب بظاہر ایک دنیادار انسان تھے لیکن انہیں زبردست روحانی قوتیں حاصل تھیں۔

حکیم صاحب چند لمحے خاموش رہے، پھر مسکرا کر بولے۔ "چائے پیو گے؟"

"آپ تکلف نہ کیجئے۔" میں نے کہا۔

"کوئی تکلف نہیں ہے۔ علی میاں! ارے بھئی ہمدان صاحب کو چائے نہ پلواؤ گے؟"

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر حکیم صاحب کا لڑکا گردن جھکائے اندر آ گیا۔ "وہ ابا جی......! آج چائے کی پتی ختم ہو گئی ہے۔"

"اوہ......اچھا اچھا......تو پتی لے آؤ بھاگ کر۔" انہوں نے کہا اور پھر ایک دم ہنس پڑے۔

"اوہ معاف کرنا میاں! جاؤ دکاندار سے کہنا اُدھار دے دے۔ ایک آدھ دن میں واپس کر دیں گے۔"

"جی ابا جی۔" لڑکے نے کہا اور باہر چلا گیا۔

"بھئی تم سے کیا چھپانا آج کوئی مریض ہی نہیں آیا مطب پر، خداوند تعالیٰ سب کو صحت عطا فرمائے۔"

میرا دل لرز گیا۔ اتنا عظیم انسان اور یہ کسمپرسی۔ میں نے دبی زبان میں کہا۔ "حکیم صاحب! میں بھی تو آپ کا اپنا ہوں۔ مجھ سے غیریت کا برتاؤ کیوں کرتے ہیں؟ کیا میں......!"

"ارے نہیں میاں! یہ غیریت نہیں ہے۔ محبت ہے تمہاری، دکاندار سے ادھار

چلتا رہتا ہے۔ واپسی ہو جائے گی۔''

میرے دل میں عجیب سے جذبات نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ حکیم صاحب اگر چاہتے تو ان کے سامنے زر و جواہر کے ڈھیر لگ جاتے لیکن ان کا دل دنیاوی طمع سے پاک تھا وہ نیک جذبوں کی دولت سے مالا مال تھے۔

ہمدان نے بڑی عقیدت سے مجھے حکیم نیاز اللہ کے بارے میں تفصیل بتائی تھی۔ اس وقت میں نے سرسری طور پر یہ داستان سنی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن مجھے اس طرح حکیم صاحب کو تلاش کرنا پڑے گا۔''

سہ پہر کے چار بجے تھے۔ جب حاجی ہمدان حکیم نیاز اللہ کو لے کر حویلی آ پہنچے۔

حاجی ہمدان باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ دراز قد، کھلتی رنگت، تقریباً سفید بال پیچھے کی جانب کنگھا کیے ہوئے۔ کلین شیو، پینٹ شرٹ میں ملبوس، ساٹھ کو چھوتی عمر، بھاری آواز کے ساتھ السلام علیکم کہہ کر نواب سراج الدین سے برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست کی طرح بغلگیر ہو گئے ان سے الگ ہوئے تو باقی سب سے بھی حسبِ مراتب علیک سلیک کی۔

حکیم نیاز اللہ کرتے پاجامے میں ملبوس تھے۔ سر پر نمازی ٹوپی، شانے پر رومال، پاؤں میں سلیپر، اُلٹے ہاتھ میں کپڑے کا بڑا سا تھیلا، سیدھے ہاتھ میں چھڑی، ماتھے پر محراب، چہرے پر گھمبیر خاموشی لیکن نور کی کرنوں سے منور چہرہ۔ وہ سب سے ملے۔ کم گو معلوم ہوتے تھے۔ حسینہ اور مونا کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں چائے کا دور چلنے لگا۔ اس کے بعد نواب سراج الدین، حاجی ہمدان اور حکیم نیاز اللہ کو لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ جہاں انہیں تمام واقعات من و عن سنائے گئے۔ حکیم نیاز اللہ دھیمی آواز میں کرید کرید کر مختلف باتیں پوچھتے رہے۔ گھنٹہ بھر بعد وہ تینوں صحن میں آ گئے۔ باقی لوگ ابھی تک وہیں بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ ان کو دیکھ کر چپ ہو گئے۔ حکیم نیاز اللہ نے پانی منگوایا، وضو کیا نماز عصر ادا کی اور سب کو اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر بند کمرے کی جانب چل پڑے۔ نواب سراج الدین ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ملازمین کرسیاں وہیں لے کر آ گئے۔ شاید زندگی میں پہلی بار اس گھر کے تمام افراد ایک

ساتھ اس کمرے کے بند دروازے تک آئے تھے۔ کمرے کے گرد خزاں رسیدہ پتوں کا ایک ڈھیر جمع تھا۔ پرندوں کی بیٹوں کی بھی بھرمار تھی۔ کمرے کے مضبوط چوبی دروازے پر بڑا سا زنگ آلود تالا پڑا تھا۔ کمرے کے چاروں طرف جھاڑیوں اور خودرو پودوں کا قبضہ تھا۔

حکیم صاحب کمرے کے گرد چکر لگانے لگے۔ دروازے سے تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر دو نیم دائرے بنا دیئے گئے۔ تمام خواتین کرسیوں پر براجمان ہوگئیں۔ نواب سراج الدین اور حاجی ہمدان بھی بیٹھ گئے۔ عمران اور شہریار حکیم صاحب کے ساتھ ساتھ تھے۔ حکیم نیاز اللہ نے اس پر کوئی تعرض نہ کیا۔

حکیم صاحب کے ہاتھ میں کھجوروں کی گٹھلیاں تھیں جنہیں وہ کمرے کے گرد تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گراتے جا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ پڑھتے بھی جا رہے تھے۔ سات چکروں میں پچاس ساٹھ گٹھلیاں گرانے کے بعد وہ دروازے کے عین سامنے آ گئے اور تھوڑی سی جگہ صاف کرنے کی ہدایت کی دو ملازموں نے دیکھتے ہی دیکھتے پچیس مربع فٹ جگہ صاف کر دی۔ اب حکیم صاحب نے چھڑی کی مدد سے ایک بڑا دائرہ اور ایک اس سے چھوٹا دائرہ بنایا۔ اس کے بعد وہ چھڑی ٹیکتے ہوئے حسینہ اور مونا کے سامنے آ گئے۔ دونوں لڑکیاں سہم گئیں۔ حکیم صاحب کچھ پڑھتے جاتے اور پھونکتے جاتے۔ ان کی نظریں مونا اور حسینہ کے چہروں پر تھیں جو بیزاری سی محسوس کر رہی تھیں۔

اچانک حکیم صاحب چونکے اور نظریں مونا پر مرکوز کر لیں۔ تھوڑی دیر تکتے رہنے کے بعد رُخ حسینہ کی طرف کر لیا اور بولے۔

''بیٹا! تم ادھر آ جاؤ۔'' حسینہ نے سوالیہ نظروں سے نواب سراج الدین کی طرف دیکھا تو نواب صاحب اُٹھ کر بیٹی کے پاس آ گئے۔ ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور حکیم صاحب کی بتائی ہوئی جگہ پر لا کر بٹھا دیا۔

''اُس لڑکی کو کچھ نہیں ہے صرف ڈر گئی تھی۔'' حکیم صاحب نے مونا کی طرف اشارہ کیا اور پھر حسینہ کے گرد بوتل سے پانی کا چھڑکاؤ کرنے لگے۔

اور آخر میں تین بار حسینہ پر بھی پانی چھڑکا تو حسینہ نے جھرجھری سی لی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدلنا شروع ہو گئے۔ وہ کسمسانے لگی۔ حسینہ کی لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتی

حالت سے سب چونکے۔ حکیم صاحب بھی چوکنے نظر آنے لگے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے شہریار اور عمران کو دور ہو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں تھوڑا پرے کھسک گئے لیکن وہیں کھڑے رہے۔

حکیم صاحب مسلسل کوئی ورد کر رہے تھے ان کی نظریں حسینہ پر مرکوز تھیں۔ اب انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چند گٹھلیاں دائرے کے اندر موجود حسینہ کی طرف پھینکیں۔ ایک گٹھلی اس کے شانے پر لگی اور ایک سر پر دو ایک اِدھر اُدھر گر گئیں لیکن ردعمل بڑا ہی غیر متوقع ہوا۔ حسینہ نے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں گول کر لیے، آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں اور وہ سر کو دائیں بائیں جھومنے کے انداز میں حرکت دینے لگی جس سے اس کے بالوں کا کلپ گر گیا حالانکہ حرکت معمولی نوعیت کی تھی۔ گھنیری، ملائم زُلفیں بکھر گئیں، ہاتھ تن گئے، گلے سے غرانے جیسی غوں غوں غرر غرر کی آوازیں آنے لگیں۔ مونا مارے ڈر کے کانپنے لگی۔ دادی اماں تسبیح کے دانے تیز تیز پھینکنے لگیں۔ پروفیسر ناہید، حیران و پریشان ادھ کھلے منہ سے یہ منظر ملاحظہ کر رہی تھیں۔ جہاں آرا نے بیٹی کی حالت دیکھ کر دایاں ہاتھ سینے اور بایاں گال پر دھر لیا۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے اعصاب تہہ و بالا ہو رہے ہوں۔ حاجی ہمدان بھی محو تھے جبکہ نواب سراج الدین بیٹی کی حالت سے خاصے پریشان مگر پُرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ادھر حکیم نیاز اللہ سب سے بے پرواہ پورے انہماک سے اپنے عمل پر توجہ مرکوز کیے ہوئے تھے۔ حسینہ آہستہ آہستہ مزید جنونی ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے کی سرخ و سپید رنگت سیاہی مائل ہونے لگی، چہرے کے نقوش بگڑ گئے۔ ہاتھ پیر مرض تشنج کی مانند مُڑ گئے۔ خرخراہٹیں، غراہٹوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ سب ہی لحہ بہ لحہ بدلتی صورتحال پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

اچانک حسینہ تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے تیور جارحانہ ہو چکے تھے۔ آنکھیں سفید ہو گئیں اور پھر اس کے حلق سے ایک کھڑکھڑاتی کھردری خوفناک قسم کی مردانہ آواز نکلی۔

”نیاز اللہ......! چلے جاؤ......میرا نام ہزار جان ہے میں تمہارے بس کا نہیں ہوں۔“

”کیا چاہتے ہو......؟“ منحنی سے حکیم نیاز اللہ جو ہمیشہ دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے، یکدم کڑکدار آواز میں بولے۔

''اس لڑکی کو چاہتا ہوں۔''

''میں کہتا ہوں چھوڑ دو اس کے وجود کو۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔''

حکیم نیاز کا اعتماد بلا کا تھا۔ وہ ذرہ برابر بھی خوف زدہ نہیں تھے۔

''بھلائی کیا ہے اور کیا نہیں...... میں تجھ سے بہتر سمجھتا ہوں...... نیاز اللہ...... تُو اپنی جان بچا۔''

''میری فکر نہ کر بچہ......'' حکیم نیاز اللہ اپنا تھیلا گھسیٹ کر اس میں سے ایک ڈبیہ نکالتے ہوئے بولے۔ ڈبیہ کا ڈھکن کھول کر اس میں سے خاک کی چٹکی بھری اسے اپنی دائیں ہتھیلی پر رکھا اور زور سے پھونک ماری تو وہ خاک غبار کی صورت اُڑتی ہوئی حسینہ پر گرنے لگی جس سے بظاہر حسینہ مگر دراصل اس کے اندر حلول کرنے والا جن شدید کھانسی کی لپیٹ میں آ گئے۔ اب حکیم نیاز اللہ نے منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے اپنی لمبی چھڑی اُٹھائی اور زور سے حسینہ کے سر پر دے ماری۔ حسینہ کا جن ڈکرانے لگا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پہلے خاک کی چٹکی اور پھر چھڑی کی ضرب سے اس کو غیر متوقع پریشانی اور نقصان پہنچا ہے۔ حکیم صاحب نے ایک اور ضرب لگائی جو حسینہ کے شانے پر لگی۔ کنگرے دار چھڑی سے پھر وہ مسلسل حسینہ کو پیٹنے لگے۔ پھر اچانک ہی پرندے جو درختوں پر بسیرا کر چکے تھے چیختے چلاتے پھڑ پھڑاتے گھونسلوں سے نکل کر ہوا میں چکر لگانے لگے۔ فضا چیں چیں ٹیں ٹیں کی ملی جلی آوازوں سے گونج اُٹھی۔ ہر طرف پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ اضطراری طور پر سب کی نظریں بلندیوں کو تکنے لگیں۔ حکیم نیاز اللہ کا چھڑی والا ہاتھ چند ثانیے کے لیے رک گیا۔ ان کی نظریں بھی فضا میں اُڑتے پرندوں پر جا پڑیں۔ بس اسی ایک لمحے سے حسینہ کا جن فائدہ اُٹھا گیا۔ ایک سنسناہٹ سی اُبھری۔ حسینہ چاروں شانے چت نیم بے ہوش ہو کر گر گئی تو حکیم صاحب چوکنا ہو گئے۔

''بھاگ کر کہاں جائے گا خبیث......!'' وہ گرجے اور ایک ہاتھ سے اپنی چھڑی کو حسینہ کے دائیں بائیں زمین پر مارنے لگے اور دوسرے ہاتھ سے پانی والی بوتل سے چھڑکاؤ کرنے لگے۔ اچانک ہی اوہ...... اوہم...... ہاؤ...... آہ جیسی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ آواز بھاری کرخت اور غراہٹ آمیز تھی جیسے کوئی نادیدہ مخلوق سخت تکلیف میں مبتلا ہو۔

''مم...... میں چلا جاتا ہوں۔ جانے دو مجھے۔ اب نہیں تنگ کروں گا۔'' ہزار جان کی صلح جوئی دیکھ کر حکیم نیاز اللہ کا ہاتھ رک گیا۔ قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔ ''کیوں نہ تجھے بھسم ہی کر دیا جائے تا کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔''

''نہیں...... نہیں حکیم جی مجھے معاف کر دیں۔ میں چلا جاؤں گا۔ دور...... بہت دور پھر کبھی نہیں آؤں گا۔'' ہزار جان واویلا کرنے لگا۔ سبھی مبہوت اور دم بخود تھے۔

''تیری بات کا کیسے یقین کرلوں۔'' حکیم نیاز اللہ متذبذب تھے۔

''دوبارہ آؤں تو آپ کو اختیار ہے مجھے بھسم کر ڈالیں۔'' وہ چلاّ رہا تھا۔ حکیم صاحب کا کڑکدار لہجہ بتدریج دوبارہ نرم ہونے لگا۔ روایتی ملائمت اُبھرنے لگی۔ بالآخر حکیم نیاز اللہ نے ہزار جان کو اس شرط پر جانے کی اجازت دے دی کہ وہ پھر کبھی اس حویلی کی طرف نہیں آئے گا۔

☆......☆......☆

حکیم نیاز اللہ نے جیسے ہی یہ اعلان کیا کہ جن ہزار جان جا چکا ہے اور وعدہ کر کے گیا ہے کہ پھر کبھی حویلی کی طرف نہیں آئے گا تو سب ہی کھل اٹھے جبکہ حسینہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اسے اُٹھا کر کمرے میں لایا گیا۔ تھوڑی سی کوشش سے وہ ہوش میں آ گئی لیکن اس پر شدید نقاہت طاری تھی۔ دادی اماں سرہانے بیٹھ کر اوراد و وظائف پڑھنے لگیں۔ حکیم صاحب بھی اپنی کوششوں میں لگے رہے۔ ڈاکٹر شیرازی کو بلا لیا گیا جنہوں نے سکون کا انجیکشن لگا دیا تو حسینہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

مغرب پڑھ کر حکیم نیاز اللہ چلنے کو تیار ہو گئے۔ حاجی ہمدان اور نواب سراج الدین انہیں گھر تک چھوڑنے کے لیے جانے لگے لیکن حکیم صاحب نے منع کر دیا۔

''نہ بھئی نہ...... تم لوگوں کا یہاں رہنا ضروری ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔'' لیکن پھر نواب صاحب نے شہریار اور عمران کو گاڑی دے کر حکیم صاحب کے ساتھ روانہ کیا کہ پوری عزت و تکریم کے ساتھ ان کے گھر تک چھوڑ کر آؤ جبکہ نواب صاحب سمیت سب گھر والے حکیم صاحب کو حویلی کے صدر دروازے تک رخصت کرنے آئے۔ سب نے حکیم صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

مونا اور جہاں آراء بیگم ملازمین کی مدد سے عشائیہ کا بندوبست کرنے لگیں۔ حویلی کی خوشیاں جیسے لوٹ آئیں۔ کھانے کا دور چل رہا تھا۔ پروفیسر ناہید نے اس موقع کو مناسب جان کر شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ کہنے لگیں۔

''بھائی صاحب! میری تجویز ہے کہ اب ہمیں جھٹ پٹ بچوں کے فرائض سے سبکدوش ہو جانا چاہیے۔''

''کیا مطلب......؟'' نواب سراج الدین سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گئے۔

''مطلب یہ کہ اب جب راوی نے چین لکھ دیا ہے تو ہمیں فوری طور پر شادیوں کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

''میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔'' جہاں آرا نے مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

''میں پوتی پوتے کی شادی دھوم دھام سے کروں گی۔'' دادی اماں اپنے تخت پوش پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

نواب سراج الدین اور حاجی ہمدان ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ حاجی ہمدان کہنے لگے۔ ''بس بھئی نواب صاحب۔ میں سمجھ گیا اس عورت راج کے سامنے تمہاری ایک نہیں چلنی۔'' حاجی صاحب کی بات سن کر قہقہے بلند ہونے لگے۔

حاجی ہمدان صاحب اور حکیم نیاز اللہ اگلے دن اپنے شہر واپس لوٹ گئے۔

☆......☆......☆

آشیانہ حویلی بقعہء نور بنی ہوئی تھی۔ شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ تاہم نواب صاحب نے کسی غیر متوقع واقعہ کے پیشِ نظر اور حسینہ کی صحت کو مدنظر رکھتے ہوئے زیادہ مہمان بلانے سے احتراز کیا تھا۔ صرف قریبی رشتہ داروں اور خاص احباب کو مدعو کیا گیا تھا۔ تقریبات بھی انتہائی مختصر رکھی گئیں تھیں۔ ایک دن مہندی اور اگلے دن نکاح اور نکاح کے بعد رات کو دعوت۔

نہ تو بارات آنی تھی اور نہ جانی تھی۔ سب کچھ حویلی کے اندر ہی تھا۔ مہندی کل ہو چکی تھی۔ آج نکاح تھا۔ رات کا فنکشن تھا۔ باغیچے میں قناتیں کھڑی کر کے ہال بنا لیا گیا تھا۔ ایک طرف چبوترہ بنا کر صوفے لگائے گئے تھے۔ جن پر دونوں دولہے اور دلہنیں ایک

دوسرے کی قربت میں براجمان تھے۔ مہمانوں کے لیے بہترین میز کرسیاں لگی تھیں۔

☆......☆......☆

آخر وہ وقت آ ہی گیا جو ہر انسان کی زندگی میں ایک بار آتا ہے۔

عمران عروسی لمحات کے خواب من کی دنیا میں سجائے خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

یہ کمرہ عمران کا دیکھا بھالا تھا لیکن آج کچھ زیادہ ہی اچھا دکھائی دے رہا تھا۔ مسہری کے تین اطراف چھت سے فرش تک موتیا اور گلاب کے پھولوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ ایک طرف دیوار پر دولہا دلہن کے ناموں کی آؤٹ لائن میں کیلی گرافی کر کے اس میں چمک دار پتیاں چپکائی گئی تھیں۔ ڈبل بیڈ پر سرخ ریشمی بیڈ شیٹ کے اوپر کلیاں اس طرح بکھیری گئی تھیں کہ دل بنا ہوا تھا۔

دلہن کے لباس میں حسینہ گھٹنوں کو بازوؤں کے گھیرے میں لیے، اپنی بانہوں میں آپ ہی سمٹی ہوئی تھی۔ عمران کے قدموں کی آہٹ پا کر وہ ہولے سے کسمسائی۔ عمران آنکھوں میں خواب سجائے چھپر کٹ پر بیٹھی حسینہ کو تکنے لگا۔ حسینہ دھڑکتے دل سے جیون ساتھی کی پہل کے انتظار میں تھی۔

عمران مسہری کی پٹی پر آ کر ٹِک گیا۔ حسینہ گھونگھٹ کی آڑ میں اور سر جھکاتے ہوئے مزید گٹھڑی بن گئی۔ عمران نے دونوں ہاتھ حسینہ کے شانوں پر ٹکا دیئے...... شانے ہولے سے لرز رہے تھے۔ عمران کے ہاتھوں پر بھی غیر ارادی رعشہ طاری ہو گیا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اس خوش گوار پریشانی سے حلاوت کشید کر رہے تھے۔

اور پھر عمران نے شہادت کی انگلی حسینہ کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ دی۔ حسینہ چاہنے کے باوجود ٹھوڑی نہ اُٹھا سکی۔ آخر کار خود ساختہ لیکن کمزور مدافعت نے ہتھیار ڈال دیئے۔ عمران کی انگلی حسینہ کی ٹھوڑی اُوپر اٹھانے میں کامیاب ہو گئی۔ دلہن کا چہرہ دلہا کے سامنے آ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے گہرے جاننے والے تھے۔ لیکن مشرقیت کا اپنا ہی ایک رنگ ہوتا ہے۔

''حسینہ......!'' آخر کار عمران خامشی کا قفل توڑنے میں کامیاب ہوا۔

''ہوں......'' جیسے کسی خوابوں کے جزیرے سے حسینہ کی آواز آئی ہو......

''ہم ایک ہو چکے ہیں حسینہ......! آج تم میری دلہن ہو اور میں تمہارا دولہا۔ ہم

میاں بیوی بن چکے ہیں حسینہ......!'' عمران بول رہا تھا لیکن حسینہ شاید سن نہیں رہی تھی۔

اور پھر اس کی آنکھیں کھلنے لگیں۔ عمران ان نرگسی آنکھوں کا پرانا آشنا تھا......اسے ان گہری جھیلوں سے خاصی واقفیت تھی......لیکن......لیکن......اچانک عمران کی آنکھوں میں حیرت اُمڈ آئی...... یہ آنکھیں...... وہ تو نہیں تھیں...... یہ...... یہ آنکھیں تو کوئی اور ہی تھیں......سرخ لال......انگاروں جیسی......انگشتِ شہادت ٹھوڑی کے نیچے سے پھسل گئی......ٹھوڑی چھوٹ گئی۔

عمران مسہری سے دو قدم دور ہٹ گیا۔ حسینہ مسکرانے لگی بلکہ ہنسنے لگی......لیکن...... یہ مسکراہٹ اور یہ ہنسی بھی وہ نہ تھی......اس میں تو...... دل کشی کا شائبہ تک نہ تھا۔ یہ آواز حسینہ کی ہرگز نہ تھی۔ بلکہ یہ تو......خرخراہٹ تھی...... یا شاید غراہٹ تھی۔

''آؤ...... آؤ...... سرتاج...... اپنی سہاگ رات منا لو......'' حسینہ نے دونوں بانہیں وا کر دیں۔ لیکن یہ آواز مردانہ تھی۔ عمران کے چہرے سے خوف چھلکنے لگا۔ حسینہ کا چہرہ بگڑنے لگا۔ خوبصورتی اُڑنچھو ہونے لگی۔ حسینہ اب دلہن نہ رہی تھی۔ اس کے اندر تو کوئی اور ہی چیز حلول کر چکی تھی۔ آنکھیں اوپر کو چڑھنے لگیں۔ اس کے دیدے بالکل سفید ہو گئے۔ ہونٹوں سے رال ٹپکنے لگی۔ وہ مسہری سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عمران ساکت کھڑا تھا۔ اس کی دلہن ڈائن بن چکی تھی۔ اس کی شبِ زفاف غارت ہو چکی تھی۔ خوابوں کا آئینہ چھناک سے کرچی کرچی ہو گیا۔ مچلتی خواہشیں، خوف میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن قدم زمین پر جیسے جم گئے تھے اور چہرہ لٹھے کی طرح سفید! کاٹو تو لہو نہیں۔

حسینہ ڈبل بیڈ پر کھڑی ہو گئی اور رقص کرنے لگی۔ اچانک عمران کی نظر اس کے پیروں پر پڑی۔ سیاہ کالے بھدے...... بالوں سے بھرے...... یہ قطعاً حسینہ کے پاؤں نہ تھے۔

یہ سب کچھ اتنا جلدی غیر متوقع انداز میں ہوا کہ عمران کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا بہرکیف وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ حسینہ کی جنونیت اس کے لیے نئی نہ تھی۔ اس سے قبل بھی بارہا حسینہ اس کے سامنے ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکی تھی لیکن رنگت و ہیئت پہلی مرتبہ تبدیل ہوئی تھی۔

ایک لمحے کو عمران نے سوچا کہ کمرے سے بھاگ کر باہر نکل جائے......لیکن نئی

نویلی دلہن کو یوں اس حال میں چھوڑ کر جانے کو اس نے بزدلی جانا۔

''بھاگ جاؤ دولہا کے بچے......!'' حسینہ کا جن غرایا۔

''نہیں جاؤں گا۔'' عمران مردانگی دکھانے پر اڑ گیا۔

''نہیں جاؤ گے......تو جان سے جاؤ گے۔''

''کیوں ایک معصوم کی زندگی کو خراب کرنے پر تلے ہوئے ہو؟''

''معصوم......ہونہہ......میں مہابت خان کا بدلہ اس سے لوں گا۔''

''تمہارے ساتھ اگر کچھ کیا ہے تو انہوں نے کیا ہے اس کا کیا قصور ہے؟''

''اس کا قصور یہ ہے کہ یہ اسی کی پڑپوتی ہے۔''

''لیکن یہ ظلم ہے۔''

''وہ بھی ظلم تھا جو مہابت خان نے میرے ساتھ کیا اور ظلم کا بدلہ صرف ظلم ہے۔ سہاگ رات منانے کا خیال اپنے من سے کھرچ دو......'' حسینہ کے اندر کا جن گرج رہا تھا۔

''خبردار! جواب حسینہ کو ہاتھ بھی لگایا یہ میری ہے اور میں اسے لے جا رہا ہوں۔'' حسینہ کے جن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' عمران پوری طرح سنبھل چکا تھا۔

''کون روکے گا مجھے؟''

''میں روکوں گا تجھے!''

''ہونہہ......'' حسینہ نے ہنکارہ بھرا اور پھر چھلانگ لگا کر پلنگ سے فرش پر اُتر آئی۔ اس کے وجود سے بدبو کے بھبکے نکل رہے تھے۔ بدبو اتنی شدید تھی کہ عمران کو ناک جلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ لیکن وہ وہاں سے ہٹا نہیں۔ حسینہ کی شکل مزید بگڑ چکی تھی۔ اس کے گلابی گال، سیاہ سلوٹ دار ہو چکے تھے۔ وہ قدم قدم دروازے کی سمت بڑھنے لگی۔ عمران نے راستہ روکنا چاہا تو اس نے کھینچ کر چانٹا اس کے منہ پر دے مارا۔ یہ ہاتھ حسینہ کا نہ تھا، انتہائی نپی تلی ضرب تھی۔ عمران پٹخنیاں کھاتا دیوار کے پاس جا گرا۔ گر کر فوراً اُٹھا اور پلٹا......لیکن حسینہ اتنی دیر میں دروازہ کھول کر باہر جا چکی تھی۔

عمران اس کے پیچھے لپکا تو راہداری میں دور اسے حسینہ جاتی ہوئی دکھائی دی۔

راہداری سنسان تھی باقی لوگ رات زیادہ ہونے کے باعث اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔حسینہ کا کمرہ ویسے بھی ذرا الگ تھلگ تھا۔عمران کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ چکے تھے۔وہ چلا چلا کر سب کو بلاتا لیکن اس کی آواز نہ نکل سکی۔وہ حسینہ کے پیچھے حواس باختہ چل رہا تھا۔ حسینہ آہستہ آہستہ اسی کمرے کی طرف جا رہی تھی۔یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی تنویمی عمل کے زیراثر ہو۔اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے اور مڑ کر دیکھا۔اس کی آنکھیں چمکیلے بلبوں کی طرح چمک رہی تھیں اُس کے بال اس طرح اُڑ رہے تھے جیسے ہواؤں کے جھکڑ چل رہے ہوں حالانکہ ہوا بالکل نہیں چل رہی تھی۔وہ اسی بند کمرے کی طرف جا رہی تھی۔اور......
اور پھر وہ کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ گئی۔پھر عمران کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حسینہ بند دروازے سے ہی اندر داخل ہوگئی تھی۔عمران نے ایسا عجیب وغریب منظر زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔دروازہ بند تھا اور پرانا بوسیدہ زنگ آلود تالا جوں کا توں منہ چڑا رہا تھا۔

عمران ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگیا۔اس کا وجود کپکپانے لگا اور خالی خالی نظروں سے دروازے کو تکتا رہا پھر جیسے اسے ہوش آ گیا۔وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر اس پر ہسٹریائی کیفیت طاری ہوگئی۔وہ بے اختیار بند دروازے کی طرف بڑھا اور اُسے زور زور سے پیٹنے لگا۔

''حسینہ......!''اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''حسینہ......!''وہ اتنی زور سے چیخا کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔

''حسی...... نہ......حسی...... نہ......'' عمران کی چیخوں سے حویلی گونج اُٹھی۔ پرندے اپنے گھونسلوں سے نکل کر فضا میں چکرانے اور شور مچانے لگے...... پٹ پٹ دروازے کھلنے لگے۔ٹک ٹک لائٹیں جلنے لگیں اور چند ہی لمحوں میں گھر کے تمام افراد عمران کے پاس جمع ہوگئے جو پُراسرار کمرے کے دروازے کے پاس بے ہوش پڑا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر سب ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

☆......☆......☆

عمران نے ہوش میں آکر بمشکل تمام ساری صورت حال بتائی تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ اس وقت عمران سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ یک ٹک دور خلا میں کسی غیر مرئی

نکتے پر نگاہیں مرکوز کیے بیٹھا تھا۔ سب لوگ اس کے اطراف نیم دائرے میں کھڑے تھے۔ پو پھٹنے کا وقت تھا۔ ہر طرف اِک نئی روشن صبح کا آغاز ہو رہا تھا۔ مگر حویلی میں تو جیسے شب دیجور اُتر آئی تھی۔ حسینہ جو دادی کی آنکھ کا تارا تھی، حسینہ جو ابّا کی آنکھوں کا نور تھی، حسینہ جو اماں کے سینے کی ٹھنڈک تھی۔ حسینہ جو نئی نویلی دلہن تھی عمران کی خواہشات کا مرکز تھی خدا جانے کہاں اور کس حال میں تھی۔ اس کا کچھ پتہ نہ چل رہا تھا۔ اس منحوس کمرے کا تالا توڑ ڈالا گیا۔ مگر یہ کیا...... اندر تو کچھ بھی نہ تھا...... البتہ فرش پر جمی صدی بھر کی دھول کی موٹی تہہ پر نوکیلے پنجوں کے نشانات واضح تھے۔ چھوٹا سا ہال نما کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ چھت جالوں سے اَٹی ہوئی تھی۔ حشرات الارض کی بھرمار تھی۔ بُو سے دماغ پھٹے جا رہے تھے۔

''سمجھ نہیں آتی میری بچی کہاں گئی؟'' جہاں آرا بیگم سسکنے لگیں۔

''حوصلہ رکھو بیگم۔'' نواب صاحب بھنچے ہوئے دانتوں سے بولے۔

''''میرے خدایا...... !میرے مالک رحم کر دے، میری بچی کہاں چلی گئی؟''

''میرے معبود...... !میری بچی کی حفاظت کر......'' دادی اماں نے روتے ہوئے کہا۔

''آمین......'' سب بولے۔

''ہائے میری بچی نہ جانے کس حال میں ہو گی۔'' جہاں آرا بیگم نے سینے پر دوہتڑ مار کر کہا اور سب رونے لگے۔

☆......☆......☆

حویلی میں صف ماتم بچھ گئی تھی۔ موت کا سا عالم طاری تھا۔ ہر شخص ایک دوسرے کو خالی خالی نظروں سے تکتا رہتا۔ دادی اماں مصلے پر تسبیح رولتی رہتیں۔ جہاں آراء بیگم سائیں جیون کے مزار پر جا کر بیٹھ جاتیں تو سارا دن وہیں رہتیں۔ شہریار اِدھر اُدھر پھرتا رہتا اور عمران خالی خالی نظروں سے خلاؤں میں گھورتا رہتا۔ نئی نویلی دلہن مونا کو چپ سی لگ گئی۔ نواب سراج الدین بیٹی کی گمشدگی سے ٹوٹ پھوٹ گئے۔ انہوں نے حکیم نیاز اللہ سے رابطہ کرنا چاہا تو پتہ چلا کہ وہ حج کو چلے گئے ہیں۔ ہر طرف مایوسی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ آشیانہ ویران ہو کر رہ گیا۔ نہ کسی کو کھانے کا ہوش نہ پینے کی فکر۔ شہریار اور عمران دونوں نے تو کئی دن سے شیو بھی نہیں بنائی تھی۔

سبھی ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔ سب کی آنکھیں ایک دوسرے کے لیے سوالیہ نشان بن گئیں۔ انہیں تو یہ بھی سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا کریں، کہاں جائیں، کس سے فریاد کریں، کس سے مدد طلب کریں، کون ان کی دادرسی کرے گا اور کون اس بات پر یقین کرے گا کہ ایک رات کی دلہن اپنے ہی گھر کے ایک کمرے میں جا کر غائب ہو گئی۔ لیکن یہ بات ناقابلِ یقین ہی سہی مگر حقیقت تھی۔ اس کمرے کو بار بار دیکھا گیا لیکن حسینہ نہ ملی۔ شہریار اور عمران اس وقت شام کے ملگجے میں حویلی کی چھت پر بوہڑ کے درخت کی لٹکتی شاخوں کے پاس آلتی پالتی مارے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''شہریار...... میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔'' عمران بولا۔

''کیا......؟'' شہریار عمران کا چہرہ تکنے لگا۔

''میں آج کی رات اُس کمرے میں گزاروں گا۔'' عمران نے عجیب سے لہجے میں کہا تو شہریار بُری طرح چونکا۔

''کیا فضول باتیں کر رہے ہو؟''

''نہیں شہریار! تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ اگر ممی سے اجازت مانگوں گا تو وہ نہیں دیں گی۔ اگر نواب صاحب یا تمہاری امی سے بات کروں گا تو سختی سے منع کر دیں گے اسی لیے صرف تم کو بتا رہا ہوں کہ آج رات ٹھیک ایک بجے میں اس کمرے میں داخل ہو جاؤں گا۔''

''یہ تو آ بیل مجھے مار والی بات ہو گی۔'' شہریار جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔'' عمران نے آہنی ارادے سے کہا۔

''یہ پاگل پن ہے یار!''

''تمہیں میری مدد کرنا ہو گی۔'' عمران جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔

''میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''تمہیں پتہ ہے ناں کہ ہم لوگ آج رات کا کھانا کھا کر اپنے گھر چلے جائیں گے۔ کیونکہ ممی کا حکم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ رات ایک بجے تمہارے گھر آؤں تو تم چپکے سے دروازہ کھول دینا۔ رات میں اس کمرے میں گزاروں گا اور صبح سویرے اپنے گھر چلا جاؤں گا۔''

''اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو؟'' شہریار نے فکر انگیز انداز میں پوچھا۔

''دیکھا جائے گا۔ دنیا ہمیشہ بہادروں نے ہی فتح کی ہے۔'' عمران کا ارادہ غیر متزلزل تھا۔

''تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ کمرے میں جاؤں گا۔''

''نہیں شہر یار!'' عمران نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میں اپنے ساتھ کسی اور کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔''

''لیکن حسینہ میری بہن ہے اور بھائی بہنوں پر قربان ہو جایا کرتے ہیں۔'' شہر یار جذباتی ہونے لگا۔

''تمہاری بہن ضرور ہے لیکن اب وہ میری بیوی ہے۔ میری عزت ہے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے لیکن پلیز اتنا بڑا خطرہ مول نہ لو۔'' شہر یار کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے گردن جھکا لی۔

☆......☆......☆

''حسبِ پروگرام رات ٹھیک ایک بجے۔''

عمران حویلی کے دروازے پر پہنچ گیا۔

شہر یار اس وقت بوڑھے چوکیدار بابا رمضانی کے پاس بیٹھا اسے باتوں میں لگائے ہوئے تھا۔ عمران نے شہر یار کے موبائل پر ادھوری بیل دی۔ شہر یار نے بظاہر اچٹتی نظر سے موبائل کو دیکھا اور پھر بابا رمضانی سے باتوں میں مشغول ہو گیا جو اسے اپنی جوانی کا کوئی قصہ سنا رہا تھا۔ شہر یار نے اس کی بات کو کاٹ کر کہا۔

''بابا! تمہارا قصہ بڑا دلچسپ ہے اگر ساتھ میں گرما گرم چائے مل جائے تو قصے کا مزہ دوبالا ہو جائے گا۔''

''کیوں نہیں بیٹا میں ابھی چائے بنا کر لایا۔ تم یہیں بیٹھو۔'' باتونی بابا کو بڑے دنوں بعد کوئی باتیں سننے والا ملا تھا، جسے چائے کے بہانے وہ مزید کچھ دیر قصے سنا سکتا تھا۔

ادھر بابا چائے بنانے کے لیے گیا ادھر شہر یار نے بڑے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ عمران لپک کر اندر آیا اور دونوں دبے قدموں اُس کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔

دروازے کا تالا تو اُس دن ہی توڑ دیا گیا تھا اب صرف کنڈی لگی ہوئی تھی۔

دروازے کے بالکل قریب جا کر دونوں کھڑے ہو گئے۔

''میں اب بھی تمہارے لیے فکر مند ہوں۔'' شہریار گلوگیر آواز میں بولا۔

''اللہ پر بھروسہ رکھو شہریار!'' عمران بلند حوصلے سے بولا۔

''گھر والے تو سب سو گئے ہوں گے۔'' عمران نے بات بدلی۔

''آج کل سب صرف ضرورت پوری کرتے ہیں۔ زندہ رہنے کے لیے تھوڑا بہت کھا لیتے ہیں اسی طرح تھک جاتے ہیں تو سونے کی اداکاری کر لیتے ہیں۔''

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' عمران نے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میں پھر کہتا ہوں عمران اتنا بڑا رسک نہ لو۔'' شہریار نے اسے روکنا چاہا۔

''سو سالوں سے بند اس کمرے میں واقعی جنات ہیں۔''

''کوئی بات نہیں...... میرے یار! شاہ جہاں نے اپنی بیوی کے لیے تاج محل بنا ڈالا تو کیا میں اپنی بیوی کے لیے ایک رات جنوں والے کمرے میں نہیں گزار سکتا۔''

عمران کا برجستہ جواب سن کر خوفناک ماحول میں بھی شہریار ہنسنے لگا۔ اور پھر دونوں ہنستے ہوئے ایک دوسرے سے گلے مل کر جدا ہو گئے۔ عمران اللہ حافظ کہہ کر کمرے میں گھس گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ شہریار کے رونگٹے کھڑے ہونے شروع ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک وہ کھڑا رہا کہ شاید عمران مارے ڈر کے آواز دے دے یا پھر اس کی چیخ سنائی دے لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ ہر طرف موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ درخت بھوتوں کی طرح سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ دفعتاً ایک اُلو درخت کی کسی شاخ سے اُڑا اور چیختے ہوئے شہریار کے سر کے پاس سے گزر کر کسی دوسرے درخت کی شاخ پر جا بیٹھا۔ اس کے وجود میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے وہاں سے ہٹنے میں ہی عافیت جانی۔ پھر اسے بابا رمضانی کا خیال آیا کہ وہ چائے لے کر بیٹھا ہوگا اور وہ ٹہلتا ہوا دوبارہ حویلی کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس کے دل میں خوف کا گزر نہیں ہے تو یقیناً وہ جھوٹ بول رہا ہوتا ہے۔ رات کی تاریکی...... سناٹا...... قبرستان...... ویرانہ...... اُجاڑ...... بیاباں...... جنگل کھنڈرات...... یہ سب خوف کی علامتیں ہیں۔

آشیانہ

کچھ قدیم گھر ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا کوئی کمرہ یا کمرے کا گوشہ ''بھاری'' ہوتا ہے، میرے جاننے والوں میں ایک صاحب کا گھر ایسا ہے جو اپنے ایک کمرے میں ہر جمعرات غروب آفتاب کے وقت دیا جلا دیتے ہیں۔ میرے قریبی دوست عبدالحمید عرف ڈاکٹر کے آبائی گھر میں بھی ایک گوشہ کچھ ایسی ہی صورتحال پیش کرتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں کسی بزرگ کا قیام ہے۔

ہماری خالہ کے گھر میں تو ایک کمرہ باقاعدہ ''بھاری'' ہے۔ بعض اوقات اس کمرے کا دروازہ اگر باہر سے بند ہو تو اندر سے باقاعدہ کھٹکھٹایا جاتا ہے اور دروازہ کھلتے ہی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہوا کا کوئی معطر جھونکا آپ کو چھو کر گزر گیا ہو۔ ایسی جگہوں سے خاص طور پر رات کو جب آپ بالکل اکیلے ہوں تو ڈر جانا فطری امر ہے۔ اور کجا یہ کہ ایک شخص سو سال سے بند کمرے میں داخل ہو جائے جہاں اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی بیوی جس کو جن قابو کر چکا ہو اور وہ چڑیل کا روپ دھار کر کمرے میں داخل ہو کر غائب ہو چکی ہو، درختوں میں گھرے اُجاڑ خوفناک کمرے میں آدھی رات کو داخل ہو جانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ عمران کمرے میں داخل تو ہو گیا دروازہ بھی جی کڑا کر کے بند کر لیا لیکن یکدم ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ خوف سے رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ چھٹی حس کسی انجانے خطرے کا احساس دلانے لگی۔ دل دھاڑ دھاڑ دھڑکنے لگا۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ چیختا ہوا باہر نکل جائے لیکن پھر حواس مجتمع کر کے اس نے اپنے قدم جما لیے اور چیخ پر قابو پانے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

کمرے میں گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

فوری طور پر اسے سیلن کی بدبو کے بھبکے اور گہرے اندھیرے کے سوا کچھ محسوس نہ ہوا۔ وہ ہمت کر کے قدم قدم چلتا ہوا کمرے کے بیچوں بیچ آ کھڑا ہوا۔

اسی طرح وقت گزرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چونک کر کبھی پیچھے اور کبھی دائیں بائیں دیکھنے لگا لیکن ہر طرف گھٹاٹوپ اندھیرے کا راج یا گہری خاموشی۔ کمرہ خاصا بڑا تھا لیکن اندھیرے میں وہ کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ یکایک کسی کی سسکی سنائی دی۔ وہ فوراً ہوشیار ہو گیا۔ سسکی پھر سنائی دی اپنے عقب سے...... وہ پھر پلٹا...... لیکن وہاں کوئی نہ

تھا۔ اس کے لاشعور نے کہا کہ آواز حسینہ کی ہے۔ تھوڑے وقفے کے بعد سسکی تیسری بار سنائی دی لیکن اب آواز کہیں دور سے آئی تھی جیسے کوئی لڑکی یا شاید حسینہ انتہائی کرب سے کراہ رہی ہو۔ ''عم......را......ن......'' ایک کرب آمیز آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''حسینہ......!'' عمران کے لبوں سے اچانک نکلا لیکن پھر گھمبیر خاموشی چھا گئی۔ اندھیرا مزید گہرا ہونے لگا۔

عمران آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

اندھیرا......قبر کا سا اندھیرا......خاموشی......قبر کی سی خاموشی۔

اچانک چٹک کی آواز آئی یوں لگا جیسے کسی نے بجلی کا بٹن آن کیا ہو۔ عمران چوکنا ہو کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔ پھر اسے کمرے کے ایک کونے میں روشنی کا ایک موہوم نکتہ دکھائی دیا۔ عمران نے اپنی نگاہیں اس نکتے پر مرکوز کر لیں۔ نکتہ آہستہ آہستہ بڑا ہونے لگا۔ یہ نارنجی رنگ کی روشنی تھی جو ایک دیوار سے پھوٹ رہی تھی۔ عمران لاشعوری طور پر اس روشنی کی سمت قدم بڑھانے لگا۔ قریب آ کر اس نے دیکھا کہ یہ ایک موم بتی کی لَو ہے۔ وہ مزید قریب آیا۔ منظر مزید واضح ہوا۔ غور سے دیکھا تو اس کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہ موم بتی نہ تھی بلکہ ایک انسانی اُنگلی تھی جس کے اوپر شعلہ تھا جو جھلملا نہیں رہا تھا بلکہ ساکت تھا۔ یہ انسانی انگلی نما موم بتی ایک دل کے اوپر رکھی تھی جو ہولے ہولے پھول اور پچک رہا تھا۔ موم بتی کے پگھلنے سے موم کے بجائے خون کے قطرے گر رہے تھے۔ دل پر رکھی اُنگلی نما موم بتی کے گرد نارنجی شعاعوں کا ہالہ بنا ہوا تھا جس کا ڈیزائن دروازہ نما تھا۔ پھر عمران کے دیکھتے ہی دیکھتے موم بتی کا چوکھٹا بڑا ہوا۔ ہوتے ہوتے قدِ آدم جتنا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہونے لگا کہ یہ صرف دروازے کا ڈیزائن ہی نہیں بلکہ دیوار میں باقاعدہ دروازہ ہے۔ اب موم بتی چھوٹی ہونے لگی لیکن دروازہ اپنے سائز میں قائم رہا۔ موم بتی کا قد گھٹتے گھٹتے اسی نکتے جتنا ہو گیا جو اسے شروع میں دکھائی دیا تھا۔ پھر موم بتی غائب ہو گئی اور دروازہ رہ گیا۔ دروازے میں اسے ایک راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک کسی خیال کے تحت عمران پلٹا اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ وہ اس دروازے کو تلاش کر رہا تھا جس سے وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ لیکن وہ اسے کہیں نظر نہ آیا۔ ہر طرف سیلن زدہ دیواریں......لیکن یہ

کیا......؟ دیواریں بھی نہ تھیں دور دور تک بس تاریکی ہی تاریکی...... نگاہیں گھور تاریکیوں سے سر پٹخ پٹخ کر لوٹ رہی تھیں۔ وہ پھرتی سے ایڑیوں پر گھوم گیا۔

یہ...... یہ...... وہ کمرہ تو نہ تھا...... وہ اندھیری رات میں کسی انتہائی ویران اور کھلی جگہ پر کھڑا تھا لیکن منظر واضح نہ تھا۔ صرف اندھیرا تھا۔ اچانک اسے اپنے اوپر روشنی کا احساس ہوا۔ اس نے اوپر دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کے سر پر تاروں بھرا آسمان تھا اور آخری تاریخوں کا چاند اپنی روپہلی روشنی سے اندھیرے کو اُجالے میں ڈھالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

عمران کے حلق سے ایک گہری سانس آزاد ہوگئی۔ یقیناً وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ آس پاس جھینگر بول رہے تھے۔ چاند کی دھندلی روشنی میں اس کی آنکھوں نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ پھر نارنجی روشنی والے دروازے کی طرف متوجہ ہوا، دروازہ جوں کا توں موجود تھا۔ اس کے پیچھے ایک جھونپڑی تھی اور وہ جھونپڑی کا ہی دروازہ تھا۔ آس پاس تاحدِ نظر ریت کے ٹیلے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ وسیع و عریض ریگستان میں موجود ہو۔ ٹھنڈی تھپکیاں دیتی ہوا چل رہی تھی۔ سوائے اس جھونپڑی کے دور دور تک ریت ہی ریت تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کروں......؟ اس کے پاس جھونپڑی میں داخل ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کا پورا بدن درد سے ٹوٹ رہا ہے۔ پیروں میں جیسے جان ہی نہ رہی ہو اسے یوں لگتا تھا جیسے پاؤں من من کے ہو چکے ہوں۔ طوعاً و کرہاً اس نے قدم آگے بڑھائے اور نارنجی شعاعوں والے دروازے سے جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔

عمران جیسے ہی دروازے کے قریب پہنچا تو ایک عجب منظر اس کا منتظر تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکنے لگا۔

☆......☆......☆

"آؤ......اندر آجاؤ......" اندر سے ایک مردانہ آواز سنائی دی تو عمران کو بڑی تسلی ہوئی کہ یہاں کوئی ہے تو سہی، جھونپڑی کے اندر داخل ہونے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ جھونپڑی باہر سے جتنی چھوٹی نظر آتی تھی، اندر سے اتنی ہی کشادہ تھی۔ چراغ کی مدھم لو اندر اجالا کر رہی تھی، اس اجالے میں اس نے دیکھا کہ جھونپڑی میں ایک طرف کھانے پینے کی اشیاء رکھی ہیں، پانی کا مٹکا بھی وہاں موجود تھا۔ جھونپڑی کے ایک حصے میں چارپائی پر ایک انسانی ڈھانچہ سیدھا لیٹا تھا۔ ڈھانچے کو دیکھ کر عمران کانپ گیا۔ ڈھانچہ کافی پرانا معلوم ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی انسان بے لباس ہو کر پلنگ پر لیٹا ہو اور پھر اس نے وہیں دم توڑ دیا ہو۔

عمران کے دل میں تجسس جاگا اور وہ آہستہ آہستہ اس ڈھانچے کے قریب پہنچ گیا۔
ے ایک خیال آیا کہ جب اس نے دروازے پر قدم رکھا تھا تو اندر سے آواز آئی تھی "آؤ
ر آجاؤ" یہ آواز کس کی تھی اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا، اس چارپائی
تو ڈھانچہ تھا وہ گہری گہری سانسیں لے کر چاروں طرف دیکھنے لگا تب اس کی نگاہ ایک
ویر پر پڑی جو اس ڈھانچے کے عین اوپر دیوار پر لگی ہوئی تھی یہ ایک باریش بزرگ کی تصویر
ا جن کا چہرہ بڑا بارعب تھا، داڑھی بھی مناسب تھی اور چہرے سے وہ شخصیت نورانی نظر آتی
ا۔ وہ حیرانی سے تصویر کو دیکھنے لگا اور پھر اس نے جھک کر دیکھا تو انسانی ڈھانچے کے
، کی ہڈیوں میں بہت سے بال تھے۔ ان بالوں کا اصل رنگ برقرار تھا اور وہی تھا جو تصویر
بزرگ کی داڑھی کے بالوں کا تھا۔ یعنی ایسا لگتا تھا یہ تصویر انہی بزرگ کی ہے جن کا
نچہ چارپائی پر پڑا ہے ابھی وہ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا کہ اسے وہی آواز سنائی دی۔

"تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے یہ میرا ہی جسم ہے۔" عمران نے چونک کر تصویر کی
ے دیکھا تو تصویر کی پتلیاں متحرک تھیں اور ہونٹ بھی ہل رہے تھے تصویر نے آنکھیں بند

کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
''ہاں یہ میں ہی ہوں میرا نام بابر خان ہے۔ میرے بیٹے میری ہی بے گور وکفن لاش یہاں پڑی ہوئی ہے حالانکہ میں زندہ بھی ہوں مگر...... میری زندگی بڑی عجیب وغریب ہے۔'' عمران کے دل میں تجسّس بیدار ہوگیا اور ہمت کر کے بولا......''
''بابا صاحب آپ کون ہیں اور یہاں اس طرح...... کیسے لیٹے ہوئے ہیں؟ اس جھونپڑی میں کیوں قیام پذیر ہیں؟''
''میں کون ہوں...... کیا ہوں...... بیٹے یہ ذرا تفصیل طلب بات ہے لیکن جب تم یہاں تک آ ہی پہنچے ہو تو میری مدد کرو۔ میں دنیا کو یہ بتا تا چاہتا ہوں کہ کوئی بھی انسان اپنی ذات میں مکمل نہیں ہے۔ ہر شخص کے اندر کمزوریاں ہیں وہ اپنے آپ کو کتنا ہی بلند و بالا سمجھ لے ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ میری طرح بے بس ہو جاتا ہے۔ دیکھ رہے ہو میرا یہ جسم میں اس بستر پر ہی فوت ہوا ہوں، میں بہت کچھ رہا ہوں اپنی زندگی میں، لیکن وقت کسی سے وفا نہیں کرتا اس بات کو ذہن میں رکھنا......!''
عمران پر جو بیت رہی تھی وہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ طلسم در طلسم ایک تصویر بولا رہی تھی۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد عمران نے کہا......
''آپ یقیناً کوئی بزرگ ہستی ہیں......؟''
''میں کیا تھا یہ جاننے سے تمہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا...... بس یوں سمجھ زندگی بے پناہ مشکلات میں گزری ہے۔''
''بابا صاحب! میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں......''
''میری بے گور وکفن لاش دیکھ رہے ہو۔ اس بستر پر لیٹے لیٹے میں نے جان دی ہے۔ میری زندگی کا یہ انجام ایک طویل پس منظر رکھتا ہے۔''
عمران تو اپنی آگ میں جلتا ہوا یہاں پہنچا تھا لیکن یہ جو کچھ تھا اس کے لئے عجیب تھا ایک بولتی ہوئی تصویر اور ایک ڈھانچہ۔ تصویر کے بابا صاحب کی آواز نے اس کے خیالات کے سلسلے کو منتشر کر دیا وہ کہہ رہے تھے۔
''میں جس بستی میں رہتا تھا اس کا نام بستی دیال چند تھا، بستی دیال چند، ہندو

اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی پر مشتمل تھی۔ میرے والد چودھری احمد خان زمیندار تھے جن کی کافی زمینیں تھیں۔ لوگ میرے والد کی بڑی عزت کرتے تھے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور زمیندار کا بیٹا جس شان کے ساتھ پل سکتا ہے میں اسی شان کے ساتھ پل کر جوان ہوا۔ میں بے پناہ ضدی اور ہٹ دھرم تھا۔ جس چیز کا ارادہ کرلیتا، اسے کر کے چھوڑتا۔ بہت سے دوست احباب تھے جو میرے پیسوں پر پل رہے تھے۔ ایک وفعہ ہم سب دوست ایک میلے میں چلے گئے۔ بستی دیال چند سے کافی فاصلے پر ایک آبادی 'چھوٹی بستی' کہلاتی تھی۔ یہاں کافی مندر تھے۔ ان مندروں میں ایک خاص طور سے بڑا مشہور تھا اور بھوانی دیوی مندر کہلاتا تھا۔ اس مندر کے بارے میں ان گنت کہانیاں سننے کو ملتی تھیں' لیکن میں نے کبھی ان پر توجہ نہیں دی تھی۔ اپنا تو بس یہی شوق تھا کہ جو بات دماغ میں سما گئی اُسے کر کے چھوڑا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ میں چھوٹی بستی کے میلے میں پہنچ گیا۔ میرے دوستوں میں ایک دو ہندو بھی تھے جو بڑی عقیدت سے بھوانی دیوی کی پوجا کے لئے آئے تھے۔ چھوٹی بستی کے آس پاس کا علاقہ بھوت پریتوں کے لئے بہت مشہور تھا۔" بابا صاحب نے بات جاری رکھی۔

بھوانی دیوی کے مندر میں ایک بڑے مہان پجاری بھیم چند رہتے ہیں۔ بھیم چند کے بارے میں سنا ہے کہ وہ صدیوں سے زندہ ہیں۔ چھوٹی بستی کے رہنے والوں کی کئی نسلوں نے اس کی تصدیق کی ہے۔ بھیم چند مہاراج کبھی کسی کے سامنے نہیں آتے۔ وہ مندر کے نیچے بنے تہہ خانوں میں رہتے ہیں اور ان کے چیلے چانٹے سارے کام کرتے ہیں۔ یہ کہانی میں نے کئی بار سنی تھی لیکن کبھی میرے دل میں بھیم چند کو دیکھنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ جب چھوٹی بستی پہنچے تو وہاں بڑی رونق تھی' میلہ اپنے جوبن پر تھا' لوگ آرہے تھے' یاتریوں نے جگہ خیمے لگا رکھے تھے' ہم لوگوں نے بھی خیمہ لگالیا۔ ہندو دوست پوجا پاٹ میں مشغول جبکہ مسلمان میلے کی دلچسپیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

رات کو سب دوست بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ پجاری بھیم چند کا ذکر آ گیا۔ میرے ہندو دوستوں کا خیال تھا کہ وہ بہت بڑا پجاری ہے۔ اس کے قبضے میں بہت سے جن، بدروحیں اور چڑیلیں ہیں۔ ان کی بات سن کر میں ہنس پڑا تو انہوں نے بُرا منایا کہ تم بھیم چند جی کا مذاق اُڑا رہے ہو۔ میں نے جواباً کہا کہ مذاق نہیں اُڑا رہا بلکہ یوں سمجھو کہ میں

بھوتوں، چڑیلوں اور بدروحوں پر یقین نہیں رکھتا۔

''بے کار باتیں کر رہے ہو تم' اگر تم اتنے ہی بہادر ہو تو برابر کے جنگل میں جا کر دِکھا دو......''

''وہاں کیا ہے......؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''بھوت' پریت اور چڑیلیں......''

''کمال ہے۔ اس سے پہلے میں نے نہ کبھی بھوتوں کو دیکھا' نہ پریتوں کو دیکھا لیکن اب تم اگر دکھا سکتے ہو تو دکھا دو......''

''ہم تو خیر وہاں نہیں جا سکتے' اگر تم میں ہمت ہے تو وہاں جا کر دکھاؤ۔''

''کیا واقعی؟......''

''ہاں۔''

''بتاؤ کس طرف جانا ہے مجھے......''

''وہ الٹے ہاتھ پر جو آبادی ہے، جب یہ آبادی ختم ہوتی ہے تو جنگل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے' تو آج ہی میں وہاں جاؤں گا......''

''ارے یار کیوں بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو' ہم یہاں میلہ دیکھنے آئے یا بھوت پریتوں اور چڑیلوں کو دیکھنے۔'' میرے ایک مسلمان دوست نے کہا۔

''نہیں' میں ضرور جاؤں گا وہاں......تفریح رہے گی۔''

''دیکھو میری بات سنو' اس طرف مت جاؤ' وہ جگہ بہت خطرناک ہے......''

''اب تو کوئی کچھ بھی کہے مجھے ادھر جانا ہی ہے۔'' میری ضد کی عادت عود آئی۔ میں زمیندار کا بیٹا تھا اور ضدی مشہور تھا۔ میں نے جانے کا پروگرام بنایا تو یار دوست مجھے روکنے لگے......

''دیکھو بابر خان! بھگوان کی سوگند مذاق کی بات تھی' مذاق میں جانے دو ہم نہیں چاہتے کہ تمہیں کوئی مشکل پیش آ جائے......'' چیلنج کرنے والے ہندو دوست نے بھی روکنے کی کوشش کی لیکن میں نے کسی کی بات نہ مانی اور اس طرف چل پڑا۔ میں نے بھوتوں اور

چڑیلوں کی کہانیاں بہت سنی تھیں لیکن کبھی دیکھا نہیں تھا اس لئے میں نے سوچ لیا کہ ذرا دیکھوں تو سہی۔ آخرکار میں آبادی کے آخری کنارے پر پہنچ گیا۔ میں بستی کے دوسری طرف پھیلے جنگل میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ ایک طرف تھوڑی سی روشنی دکھائی دی۔ یہ روشنی ایک خوانچہ فروش کے ٹھیلے پر رکھے پیٹرومیکس کی تھی۔ اس ویرانے میں ایک انوکھا دوکاندار ایک تھال میں کوئی مٹھائی سجائے بیٹھا تھا' مٹھائی کا یہ تھال ایک موڑھے پر رکھا تھا اور موڑھا ٹھیلے پر' وہ شخص ایک گندا سا کمبل اوڑھے ہوئے تھا' حالانکہ سردی نہیں تھی' پتہ نہیں اس نے یہ کمبل کیوں اوڑھ رکھا تھا' وہ گردن جھکائے بیٹھا تھا' میں نے اس سے کہا:

''بھائی صاحب!'' میری آواز سن کر بھی اس نے گردن اٹھائی اور نہ منہ سے کچھ بولا۔

میں نے پھر کہا:

''سنو' میں تم سے آگے کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کمبل سرکایا اور دونوں ہاتھ سامنے کر دیئے اس کے ہاتھ کہنیوں کے پاس سے کٹے ہوئے تھے اس نے بغیر ہاتھ کے دونوں کلائیاں آگے کر کے منمناتی ہوئی آواز میں کہا:

''میرے تو ہاتھ ہی نہیں ہیں۔'' کچھ عجیب سا انداز تھا اس کا۔ میں نے گردن اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کی آنکھیں بھی نہیں تھیں' ماتھے سے لے کر ناک تک چہرہ سپاٹ تھا' دانت لمبے لمبے تھے' نیچے کا ہونٹ ٹھوڑی تک لٹکا ہوا تھا اور اس سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ میں گھبرا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا اس کی آواز پھر ابھری:

''بھائی میرے تو ہاتھ ہی نہیں ہیں۔'' میں نے وہاں سے دوڑ لگا دی اور جنگل کی طرف دوڑتا چلا گیا' میرے دل میں پہلی بار خوف و دہشت کی لہر اُٹھی تھی۔ میں ایک درخت کے پاس پہنچ کر رکا اور دہشت بھری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ہٹ دھرمی میں یہاں تک چلا تو آیا تھا لیکن اب خیال آ رہا تھا کہ غلطی ہو گئی ہے۔ دفعتاً درخت کے عقبی حصے میں کچھ آہٹ سنی۔ پلٹ کر دیکھا تو پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ ادھر وہی شخص کھڑا تھا اور لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا اس نے آہستہ سے کہا:

''بھائی میرے تو ہاتھ ہی نہیں ہیں۔'' میں نے وہاں سے دوڑ لگائی۔ عقل کا تقاضہ تو یہ تھا کہ واپس بھاگ جاتا لیکن عقل تو شاید سلب ہو چکی تھی میں درختوں کی جانب آگے ہی

آگے بڑھتا گیا اور پھر ایک درخت کی اوٹ میں پناہ لی۔ ابھی دو سانس نہ لئے تھے کہ سامنے سے ایک سایہ سا آتا دکھائی دیا۔ میں نے سوچا کہ یہ وہی خوفناک بھوت ہوگا جو کہتا ہے میرے تو ہاتھ ہی نہیں ہیں' لیکن اب کی بار میں نے کچھ اور ہی دیکھا' وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی' بہت ہی خوبصورت لباس پہنے ہوئے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی دیہاتی لڑکی ہو' جو راہ بھٹک کر ادھر آ گئی ہو۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا' میں حیرانی سے اسے دیکھنے لگا تو وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آ گئی:۔

''کہاں جا رہے ہو بابو جی؟'' اس کی آواز سنائی جس میں ایک عجیب سی منمناہٹ تھی۔ میں نے خوفزدہ ہو کر اُسے دیکھا۔ میری نگاہ اس کی آنکھوں پر گئی جن میں پتلیاں نہیں تھیں۔ دیدے بالکل سفید تھے مگر باقی چہرہ خوبصورت لڑکیوں جیسا تھا۔ اس نے میری طرف کچھ اور قدم بڑھائے اور بولی۔

''میرے ساتھ شادی کر لو بابو جی!''

''کک...... کون ہو تم......؟''

''لاجونتی۔'' اس نے جواب دیا......

''لاجونتی' تم یہاں کیا کر رہی ہو......؟''

''تمہارا انتظار کر رہی تھی بابو جی۔'' وہ بولی......

''میرا انتظار......؟''

''ہاں۔'' اس نے کہا اور عجیب سے انداز میں لہریں لینے لگی۔ تبھی میری نگاہیں اس کے پیروں پر جا پڑیں۔ اس کے پیروں کے پنجے پیچھے کی طرف تھے اور ایڑھیاں آگے کی طرف تھیں۔ مجھے ان معاملات سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ لیکن اتنا میں ضرور جانتا تھا کہ چڑیلوں کے پاؤں ایسے ہی ہوتے ہیں۔ گویا یہ چڑیل ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ واقعی یہ بھوتوں اور چڑیلوں کا جنگل ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو بابو جی! چلو گے نا میرے ساتھ، کرو گے نا شادی...... کرو گے نا شادی؟'' اس نے اٹھلاتے ہوئے کہا......

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اچانک مجھے عقب سے آہٹ سنائی

دی۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو وہی شخص جو کہتا تھا کہ میرے تو ہاتھ ہی نہیں ہیں آگے آرہا ہے۔ چند لمحوں میں وہ قریب پہنچ گیا۔ اس نے خونخوار لہجے میں کہا:

''لاجونتی! تو پھر آگئی ادھر......''

''تو کیوں مر رہا ہے تو جا...... اپنا کام کر''

''یہ میرا شکار ہے......'' بغیر ہاتھوں والا بولا۔

''نہیں میرا ہے......'' لاجونتی غرائی۔

''میرا ہے......'' وہ پھر بولا۔

''نہیں میرا ہے۔'' اور وہ دونوں لڑنے لگے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ایسے دوڑا کہ زندگی میں کبھی اس سے زیادہ تیز نہیں دوڑا تھا۔ اب میرا رخ اسی طرف تھا جدھر ہم نے خیمہ لگایا تھا۔ کافی دور تک دوڑنے کے باوجود میں ان خیموں تک نہ پہنچ سکا شاید میں راستہ بھٹک گیا تھا۔ میرے خدا میں اب کیا کروں......؟ میں نے دل میں سوچا اور جہاں تھا وہیں رُک گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے عجیب وغریب منظر دیکھا جس جگہ میں کھڑا تھا وہاں سے کوئی دس گز کے فاصلے پر وہ دونوں لڑ رہے تھے۔ میں نے آس پاس کا منظر دیکھا تو میری جان ہی نکل گئی۔ اتنی دیر دوڑنے کے باوجود میں وہیں کا وہیں تھا۔ میری سانس سینے میں رُکنے لگی۔ میں واقعی کتنی بڑی مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا۔ لگ رہا تھا کہ اب جان چھڑانا مشکل ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ لڑتے لڑتے وہ دونوں زمین پر گرے اور ان کی گردنیں جسموں سے جدا ہو گئیں۔ اس کے بعد بھی وہ لڑ رہے تھے۔ ان کے دھڑ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ میں خوفزدہ ہو چکا تھا اور میرا سر چکرا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی بے ہوش ہو کر گر پڑوں گا لیکن زندگی بڑی پیاری ہوتی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکا میں خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ دونوں اپنے اپنے سر لیکر وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔ اور میں نڈھال ہو کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اور ایک بار پھر واپسی کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ اس مرتبہ مجھے کامیابی ہوئی اور دور خیموں کی روشنیاں نظر آئیں۔ مندر کے پاس پہنچ کر اپنا خیمہ تلاش کر کے دوستوں کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا:

''کہیے مہاراج! بھوت پریتوں سے ملاقات ہوگئی؟'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا

اُور ایک طرف جا کر لیٹ گیا۔ ان کو میری خراب حالت کا اندازہ ہو گیا تھا اور اس وقت یقین میں بدل گیا جب مجھے تیز بخار ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔ بخار تیز سے تیز تر ہوتا گیا وہ لوگ مجھے گھر لے آئے۔ گھر آنے کے بعد بخار تو اتر گیا لیکن میری ذہنی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ مجھے ہر وقت وہی دونوں نظر آتے رہتے۔ ایک مجھ سے کہتا ''میرے تو ہاتھ ہی نہیں ہیں'' اور دوسری کہتی ''میرے ساتھ شادی کرو گے؟'' میں نیم پاگل ہو گیا دیوانوں جیسی حرکتیں کرنے لگا۔ علاج کے لیے والدین مجھے کہاں کہاں نہیں لے کر گئے کس کس کو نہیں دکھایا۔ مجھے ڈراؤنے خواب آتے اور میں سوتے میں ڈر جاتا۔ ایک دن میں گھر والوں کو بتائے بغیر جدھر منہ اُٹھا، چل پڑا۔ میرے حواس کبھی کام کرنے لگتے تھے اور دیوانگی کا دورہ پڑ جاتا۔ اسی لیے شاید گھر والوں نے بھی تلاش نہ کیا ہو گا پھر مجھے یوں ہی آوارہ گردی کرتے کرتے ایک سادھو مل گیا۔ میں اس کے ساتھ رہنے لگا۔ ایک دن میں نے ہوش میں اس کو سارا واقعہ بتایا تو سادھو نے کہا کہ میں تمہارا علاج کروں گا لیکن وہ اصل میں بھیم چند کا چیلا تھا...... اور میرے ساتھ دھوکہ کر رہا تھا۔ مجھے اس نے اس چار پائی پر لٹا دیا اور جانے کیا کیا عمل کرتا رہا کہ میرے جسم کا گوشت گلنے لگا۔ آہستہ آہستہ میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تو وہ میری روح اس تصویر میں قید کر کے خود چلا گیا۔

اب یہ ڈھانچہ میرا ہی ہے لیکن میری جان اس تصویر میں ہے۔ میرے زندہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ یہ تصویر اور ڈھانچہ ایک ہو جائیں اور ڈھانچے پر گوشت اور کھال آ جائے۔ دیکھنے والوں کی نظروں میں یہ ایک مرے ہوئے شخص کا ڈھانچہ ہے مگر تم یقین کرو کہ میں زندہ ہوں...... ہاں میرا علاج اگر تم کرنا چاہو تو ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ علاج مجھے سادھو نے بتایا تھا۔'' بوڑھے بابر خان کی روئیداد عمران کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھی۔ چند لمحات سکوت میں گزر گئے پھر اس سکوت کا پردہ عمران نے ہی چاک کیا۔

''بابا جی! اگر میری وجہ سے آپ کی روح کو جسم مل جاتا ہے تو یہ میرے لیے اعزاز ہو گا۔ میں تیار ہوں ہر وہ کام کرنے کے لیے جو میرے بس میں ہو۔''

''لیکن میرے بیٹے تمہیں اس کے لیے مشکلات کے بھنور سے گزرنا ہو گا۔ آہ! ایک عمل ایسا ہے جس سے میرا وجود میری روح سے منسلک ہو جائے گا لیکن نہایت مشکل ہے۔''

''میں ان مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہوں۔'' عمران نے جواب دیا۔ بابر خان تصویر میں سے عمران کو دیکھنے لگا' عمران محسوس کر رہا تھا کہ تصویر میں موجود چہرے پر وہ تمام تاثرات ابھرتے ہیں جو زندہ سلامت انسان کے چہرے پر ہوتے۔ بابر خان نے کہا......

''تو پھر اس کے لئے مجھے تم سے ایک لمبا کام لینا پڑے گا......''

''میں نے کہا نا میں خلوص دل کے ساتھ تیار ہوں۔'' تصویری بابا جی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولے......

''ٹھیک ہے تو پھر تمہیں بھوانی دیوی کے مندر جانا ہے وہاں وہی پجاری بھیم چند ہے جس کے بارے میں ابھی میں نے تمہیں بتایا تھا۔ وہ ابھی تک زندہ ہے اور اسی مندر کا بڑا پجاری ہے۔ اس پجاری کی وجہ سے میں اس حالت کو پہنچا ہوں اور اس کی موت سے ہی اپنی اصل حالت میں آ سکتا ہوں۔''

''لیکن بابا جی......!'' عمران نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''میں تو اپنی حویلی کے کمرے میں داخل ہوا تھا وہاں سے میں یہاں آپ کے پاس آ گیا ہوں...... یہ کیا چکر ہے؟''

''سارا چکر ہی گھن چکر ہے بیٹا......! تُو یہاں آیا نہیں میں نے تجھے بلایا ہے۔ میری شخصیت کی بحالی میں تیری بھی عافیت ہے۔''

''وہ کیسے......؟'' عمران کو اُمید کی کرن نظر آئی۔

''وہ ایسے کہ میری یہ حالت بھیم چند نے کی اور اس حالت میں مجھے اپنے دوست جن ہزار جان کے حوالے کر دیا۔ ہزار جان کا بسیرا چونکہ تمہاری حویلی میں تھا لہٰذا اس نے مجھے اسی کمرے میں قید کر دیا۔ اس بات کو پتہ نہیں کتنے عشرے بیت چکے ہیں۔ میں اپنے جسم سے جدا تھا لیکن میرا دماغ میری زبان میری روح میرے ساتھ تھی میں اسی حالت میں دن رات عبادت میں مصروف رہا۔ اُس ذات پاک نے آخر تجھے میرے پاس بھیج دیا۔ اب تم بھیم چند کو مار کر مجھے میرا جسم لوٹا دو۔''

''لیکن بابا جی! اگر آپ حویلی کے کمرے میں موجود تھے تو ہزار جان نے مجھے آپ کے پاس آنے سے روکا کیوں نہیں؟''

''اس لیے کہ وہ تمہاری جیون ساتھی کو لے کر بہت دور جا چکا ہے۔ بس تم جلدی سے میرا کام کردو کہیں راز فاش نہ ہو جائے۔''

''بھوانی مندر ہے کہاں؟'' عمران نے پوچھا۔

''اس جھونپڑی سے نکل کر ناک کی سیدھ میں چلنا شروع کر دو۔ اللہ بہتر کرے گا اور ہاں ڈھانچے کے پاس میرا چاقو پڑا ہے اسے ساتھ لے جاؤ اس سے تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔'' عمران جھونپڑی سے باہر نکلا تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا کیوں کہ ابھی جب وہ جھونپڑی میں داخل ہوا تھا تو رات تھی۔ اب باہر نکلا تو تیز دھوپ تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ پتہ نہیں حسینہ کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ اور نہ معلوم اب گھر والوں پر حسینہ کے بعد خود اس کی گمشدگی سے کیا بیت رہی ہوگی۔

انہی سوچوں میں غلطاں ناک کی سیدھ میں چلا جا رہا تھا۔ ہر طرف آگ اُگلتی دُھوپ کا راج تھا۔ آسمان انگارے برسا رہا تھا۔ گرمی سے بے حال لیکن دھن کا پکا عمران بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آخر کار اسے بہت سے خیمے نظر آئے اور ساتھ ہی مندر کے کلس بھی دکھائی دینے لگے۔ نزدیک جا کر دیکھا تو بے شمار یاتری موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ بھوانی میلے کے دن تھے۔ وہ رش میں گھل مل گیا۔ شام تک وہ بھوانی میلے میں گھومتا رہا۔ اس نے اپنا حلیہ ہندوؤں والا بنا لیا تھا۔ ماتھے پر تلک، گلے میں مالائیں، پیروں میں کھڑائیں، یہ سب کچھ اس نے میلے میں سے ہی حاصل کیا تھا۔ اس وقت وہ ایک درخت کے نیچے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ ہندو ہر طرف ناچ گا رہے تھے۔ فضا میں دھوئیں کی عجیب سی بُو رچی تھی۔ وہ ماحول کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔ اسے مندر کے اندر داخل ہونا تھا اور وہ اس بارے غور و خوض کرر ہا تھا۔

آخر کار اسے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ مندر کی عقبی دیوار کے ساتھ اس نے برساتی نالہ دیکھا جو اس وقت بے آب تھا۔ اس نے سوچا یقیناً مندر کی عقبی دیوار سے بارش کا پانی مندر سے بہہ بہہ کر اس نالے میں گرتا ہوگا۔ پانی کے راستے سے ہی مندر میں داخل ہوا جائے۔ یہ سوچ آتے ہی وہ رات کا انتظار کرنے لگا۔ سہ پہر کے بعد لوگ جانا شروع ہو گئے۔ شام اترتے ہی اس نے اپنی سوچ پر عملدرآمد شروع کر دیا اور لوگوں کی نظروں سے بچ

کرنالے میں اُتر گیا اور مندر کی عقبی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ آخرکار اسے گوہر مقصود نظر آ گیا۔ یہ ایک چوڑا سوراخ تھا جو خشک تو تھا لیکن پانی کے نشانات موجود تھے یقیناً یہاں سے بارش کا پانی نالے تک آتا ہوگا۔ عمران اُچک کر اندر پہنچ گیا اور تھوڑی سی تگ و دو کے بعد مندر کے صحن میں پہنچ گیا۔ صحن خالی تھا۔ وہ ایک جگہ رک کر آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں پانی سے بھرا بہت بڑا تالاب ہے۔ جس کے دوسرے کنارے پر کمروں کی قطار ہے۔ وہ آہستگی سے رینگتا ہوا تالاب میں اُتر گیا۔ تیراک وہ بہت اچھا تھا۔ تیرتے تیرتے دوسرے کنارے تک اور تالاب سے نکل کر برآمدے میں جا پہنچا۔

جب اسے اندازہ ہوگیا کہ اس کے آس پاس کوئی نہیں اور اسے کسی نے نہیں دیکھا تو وہ بڑی سرعت سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچ گیا جہاں ایک بڑا دروازہ بنا تھا۔ دروازے کے دوسری طرف ایک کھلی راہداری تھی جس کے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دونوں دیواروں میں مشعلیں نصب تھیں جن کی وجہ سے وہاں اچھی خاصی روشنی تھی۔ عمران احتیاط دامن گیر رکھتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم رکھتا راہ داری میں آگے بڑھ گیا۔ دروازے کے ساتھ دیوار پر دونوں طرف مورتیاں جڑی ہوئی تھیں۔ وہ گربہ پا چلتا ہوا آخرکار ایک جگہ جا کر رُک گیا۔ یہاں دیوار پر چھوٹے چھوٹے جھروکے بنے تھے جن سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ایک جھروکے سے آنکھ لگا کر عمران نے اندر جھانکا تو ایک لمحے کے لئے حیران رہ گیا۔ کمرے کے اندر ایک مکروہ شکل پجاری معصوم شکل لڑکی کے ساتھ دست درازی کر رہا تھا۔

لڑکی زیادہ سے زیادہ سولہ سترہ سال کی ہوگی۔ اس کا چہرہ بہت خوبصورت اور ہونٹوں پر گلاب کی نازک پنکھڑیوں کا گمان گزرتا تھا۔ وہ بُری طرح سہمی ہوئی تھی اس کا لباس بے ترتیب تھا' عمران نے محسوس کیا کہ ہندو پجاری کی آنکھوں میں شیطان ناچ رہا ہے اور لڑکی خوف سے تھر تھر کانپ رہی ہے۔ یہ بات تو طے تھی کہ لڑکی اپنی مرضی سے یہاں نہیں آئی تھی اسے یقینی طور پر اس بوڑھے پجاری کی ہوس کا شکار ہونا تھا۔ لڑکی اپنے بچاؤ کے لیے زور آزمائی کر رہی تھی لیکن بوڑھا پجاری کسی بھیڑیئے کی طرح بار بار اس پر جھپٹ رہا تھا۔

لڑکی کی آواز سنائی دی......

"بھگوان کے لئے...... بھگوان کے لئے......مہاراج مجھے برباد مت کرو' میں

تمہاری بیٹی کے برابر ہوں' میں تمہاری پوتی سمان ہوں...... مجھے برباد نہ کرو...... مجھ پر دیا کرو......مہاراج مجھ پر دیا کرو......''

''کتیا کی بچی' میری نہ کوئی بیٹی ہے اور نہ کوئی پوتی ' تو نہیں جانتی کہ میرے چرنوں میں آ کر تجھے کتنا بڑا مان ملے گا...... کیا سمجھی......امر ہو جائے گی تو......تو نہیں جانتی کہ میں کون ہوں......''

''دیکھو مہاراج دیکھو......مہاراج میری شادی ہونے والی ہے...... میری شادی ہونے والی ہے' میں......میں اپنے پتی......میں اپنے پتی......''

''شادی ہونے والی ہے' سہاگ رات منائے گی تو اپنے پتی کے ساتھ' اپنا شریر اپنے پتی کو دے گی......اری باولی تیرا پتی میرے جیسا ہو سکتا ہے......؟''

''آپ کو دیوتاؤں کا واسطہ' دیکھئے مہاراج مجھے برباد مت کریں......''

''دیوتا آرام سے سو رہے ہوں گے۔ کس چکر میں پڑی ہے چل میرے پاس آ۔''
سادھو پھر لڑکی کی جانب بڑھا۔ عمران کو یہ اندازہ تو نہیں ہو سکا تھا کہ وہ بھیم چند ہے یا کوئی اور لیکن یہ طے تھا کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں۔ عمران نے اِدھر اُدھر دیکھا اسے ایک کھڑکی ایسی نظر آئی جس میں سلاخیں نہیں تھیں وہ اس کی جانب بڑھا اور آہستگی سے کھڑکی کھول کر پھرتی سے اندر کود گیا۔ آہٹ پر پجاری نے گھوم کر دیکھا تو ایک لمحے تک تو وہ حیرانی سے عمران کا چہرہ دیکھتا رہ گیا اور پھر اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا ہو۔

''کون ہے تُو جسے موت یہاں کھینچ لائی ہے۔''

''میں......؟ میں وہی دیوتا ہوں جسے یہ لڑکی پکار رہی تھی......''

''دیوتا۔'' اس نے کہا پھر زور سے ہنس پڑا۔

''مہاتما جی کبھی درپن میں اپنا منہ دیکھا ہے۔ تم دیوتا ہو؟ میں ابھی تمہیں مہا دیوتا بنائے دیتا ہوں یہاں جس راستے سے آئے ہو واپس چلے جاؤ کیا سمجھے؟ ورنہ میرا نام بھیم چند ہے۔ اور بھیم چند چیز کیا ہے اس کا تجھے اندازہ نہیں۔'' سادھو بولا......

''میں اس لڑکی کو لے کر جاؤں گا یہاں سے۔'' عمران کو یک دم حسینہ یاد آ گئی۔ اسے اپنی منزل سامنے نظر آ رہی تھی۔

بھیم چند غصے سے غرایا اور پھر ایک دیوار کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے دیوار میں بنے خانے کا ڈھکن اٹھایا تو آٹھ انچ چوڑے پھن والا ایک کالا ناگ خوں خوار پھنکار کے ساتھ باہر نکل آیا' بھیم چند نے اس ناگ کو گردن کے پاس سے پکڑا اور عمران پر پھینک دیا' عمران فوراً نیچے بیٹھ گیا' ناگ اوپر سے گزر کر دیوار سے ٹکرایا اور زمین پر گرتے ہی کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحے تک تو عمران کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ناگ کا کیا کرے مگر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اس نے ایک طرف دیکھا تو وہاں ایک چھڑی رکھی تھی' عمران نے پھرتی سے چھڑی اٹھائی اور اسے گھما کر سانپ کی جانب کچھ اس طرح نشانہ لگا کر پھینکا کہ ناگ چھڑی کی لپیٹ میں آگیا اور بری طرح زخمی ہو کر دور جا گرا۔ پھر اس نے ایک طرف کا رخ کیا اور غائب ہوگیا تھا۔ بھیم چند اسے خونخوار نظروں سے گھورنے لگا وہ اچھا خاصا تندرست و توانا آدمی تھا اور یقینی طور پر عمران پر بھاری پڑتا۔ اس وقت عمران کے ذہن میں صرف حسینہ کی شبیہہ تھی اور وہ اس لڑکی کو حسینہ ہی سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ وہ تن کر کھڑا ہوگیا' حالانکہ سیدھا سادہ شریف نوجوان تھا۔ زندگی تعلیم کے حصول میں بسر کی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسے کسی جھگڑے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اچانک وہ اپنی جگہ سے چھلانگ لگا کر آگے بڑھا اور موٹے تازے بھیم چند سے لپٹ گیا' اگلے ہی لمحے عمران کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے بھیم چند لوہے کا بنا ہو۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے عمران کو پکڑ لیا۔ عمران کی سانس رُک رہی تھی اسے احساس ہوا کہ اگر مزید وقت گزرا تو اس کی پسلیاں ٹوٹ کر ایک دوسرے میں پیوست ہوجائیں گی۔ ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آئی۔ اس نے دونوں انگلیاں کھڑی کر کے اس کی آنکھوں میں ماریں اور بھیم چند کی گرفت سے نکل گیا ساتھ ہی اس نے پوری قوت سے ایک لات بھیم چند کے پیٹ پر ماری' لیکن بھیم چند نے اس کا پاؤں پکڑ لیا' قبل اس کے کہ بھیم چند عمران کو کوئی نقصان پہنچاتا، لڑکی کو جیسے ہوش آگیا اس نے قریب رکھا ہوا سونے کا بت پوری قوت سے بھیم چند کے سر پر مار دیا' اس کے حلق سے ایک بلبلاہٹ نکلی۔ اس کے سر سے خون جاری ہوگیا تھا' لڑکی پر جیسے دیوانگی طاری ہوگئی۔ وہ اپنی پوری قوت سے پجاری کے سر پر مورتی کو بار بار مارتی رہی' سر' کندھے' پجاری بے شک گوشت کا پہاڑ تھا' لیکن لڑکی پر بھی اپنی عزت بچانے کا بھوت سوار تھا۔ وہ وار پر وار کرتی

رہی۔ پجاری نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے اس کا پہاڑ جیسا منہ کھل گیا۔ عمران نے بابر خان کا دیا ہوا چاقو نکال کر پوری قوت سے بھیم چند کے حلق میں گھسیڑ دیا۔ بھیم چند موت کی پھریریاں لینے لگا۔ وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا اور کمرے کا فرش اس کے سیاہی مائل خون سے رنگین ہوتا جا رہا تھا۔

لڑکی پتھرائی ہوئی نگاہوں سے کبھی بھیم چند اور کبھی عمران کو دیکھنے لگی۔

عمران نے کہا......

''ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔'' پھر عمران نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف لپکا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کیا کرے تاہم وہ دونوں وہاں سے باہر نکل آئے' ایک وسیع وعریض دالان عبور کر کے وہ اوپر پہنچ گئے' ہر طرف اندھیرے اور خاموشی کا راج تھا۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا ہر طرف تاریکی اور سناٹا تھا۔ لڑکی کا ہاتھ پکڑے وہ سیڑھیاں طے کرنے لگا' جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا' اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ آگے کیا ہوگا اسے کچھ علم نہ تھا۔

''لڑکی اب تم کیا چاہتی ہو......؟''

''مم مجھے...... مجھے یہاں سے جانے دیں مہاراج' آپ کی کرپا ہوگی......''

''کہاں جاؤ گی تم......؟''

''مہاراج! میرا گاؤں زیادہ فاصلے پر نہیں ہے میں یہاں یاترا کرنے آئی تھی' باہر خیمے میں اپنے پریوار کے ساتھ ٹھہری ہوں۔ آج خیمے میں اکیلی تھی کہ کچھ لوگ آئے انہوں نے مجھے بے ہوش کرنے والی کوئی چیز سنگھائی اور اس کے بعد باہر نکال لائے۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں اس کمرے میں تھی......''

''ایک بات تو بتاؤ......'' عمران نے چونک کر لڑکی سے پوچھا۔ ''یہ پجاری کون تھا؟'' عمران تصدیق چاہتا تھا کہ کیا وہ جس کام کو آیا تھا وہ ہوگیا یا یہ کوئی اور بھیم چند تھا۔

''یہ...... یہ بھیم چند تھے۔ اس مندر کے مہان پجاری۔ جن کے درشن کو جنتا ترستی ہے لیکن آج پتہ چلا کہ رات کے اندھیرے میں یہ راکھشس بن جاتے ہیں۔''

''اب کہاں جاؤ گی......؟'' عمران نے سکھ کا طویل سانس لیتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ مجھے جلد سے جلد مندر سے باہر لے جائیں.....''اور پھر عمران نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور جس راستے مندر میں آیا تھا اسی راستے سے باہر نکل گیا۔ نالے میں اُترتے ہی وہ دوڑ پڑے اور پھر جانے کب لڑکی کے ہاتھ سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور ٹھوکر لگنے سے گر پڑا۔ اسے کچھ ہوش نہ رہی۔ جب آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو سائیں جیون کے مزار کے باہر بوہڑ کے درخت تلے بنے مٹی کے چبوترے پر پایا۔

وہ ہونقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ صبح کا وقت تھا۔ پو پھٹ رہی تھی۔

☆......☆......☆

پاکستانی وقار عظیم ڈاٹ کام

اُسے اپنے سامنے سائیں جیون کا مزار نظر آ رہا تھا اور وہ مزار کے باہر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا' عمران خود کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا وہ جاننا چاہتا تھا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ سچ ہے یا پھر خواب۔ تھوڑی دیر بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ اس کے دل میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی' جن خوفناک واقعات سے وہ گزرا تھا انہوں نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ اس تذبذب میں تھا کہ کیا کرے' زندگی موت سے دوچار ہونے جا رہی تھی کہ اچانک زندگی کا اعلان ہو گیا......

لیکن پے در پے اتنے واقعات پیش آئے تھے کہ کسی ایک پر بھی یقین نہیں ہوتا تھا۔ کیا سچ ہے کیا جھوٹ' کوئی مجھے بتا دے' ہے کوئی...... ہے کوئی' وہ خوب زور سے چیخا لیکن اسے جلد ہی احساس ہوا کہ اپنی دانست میں وہ خوب زور سے چیخا تھا لیکن......کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔

☆......☆......☆

شہریار سخت پریشان تھا۔ رات کو جانے کب تک وہ اس پُراسرار کمرے کے دروازے کے پاس کھڑا رہا لیکن اندر جانے کی اس میں ہمت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ نواب سراج الدین جاگ گئے تھے۔ بیٹی کی گمشدگی کے بعد اب تک انہیں صحیح طریقے سے نیند نہیں آئی تھی۔ اذان کی آواز سنائی دی تو شہریار وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ خوفزدہ بھی تھا اور افسردہ بھی۔ پتہ نہیں عمران کا کیا بنا ہو گا؟ تھوڑی دیر بعد اسے نواب صاحب نظر آئے' جنہوں نے اسے دیکھ لیا تھا......''

''شہریار کیا کر رہے ہو؟ بیٹا! اس کمرے کے پاس یہاں آنے سے تجھے منع کیا جاتا ہے۔''

''نہیں پاپا! میں ابھی ابھی اٹھ کر باہر آیا تھا' یہاں کچھ ایسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے کوئی اندر بول رہا ہو' میرے دل میں فوراً ہی حسینہ کا خیال آیا اور میں اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکا' اسے دیکھنے چلا آیا......''

''تو پھر کیا تم اندر گئے......''؟

''ابھی ایک منٹ پہلے یہاں آیا ہوں دوبارہ آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا اکیلا اندر نہیں جانا چاہ رہا تھا......''

''آؤ میرے ساتھ چلو۔'' سراج الدین نے کہا' شہریار یہی تو چاہتا تھا باپ کی ہمت پر وہ کمرے میں داخل ہو گیا اسے خوف تھا کہ اگر عمران کمرے میں ہوا تو ابو کیا سوچیں گے لیکن جیسے اس نے ایک ترکیب سوچ کر ابو سے بات کی تھی ویسے ہی دوسری ترکیب بھی سوچ لی...... ویسے ایک جھوٹ چھپانے کے لئے بہت سے جھوٹ تو بولنا ہی پڑتے ہیں' کمرے میں داخل ہو کر اس نے اضطراری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اسی کمرے میں حسینہ غائب ہوئی تھی۔ دل میں خیال تھا کہ آس پاس کہیں عمران کی لاش پڑی نہ ملے۔ کمرے کے فرش پر نگاہ ڈالی' خدا کا شکر ادا کیا کہ وہاں کوئی لاش نہیں تھی' اور نہ ہی کوئی ایسا نشان۔ نواب صاحب بھی چاروں طرف دیکھ رہے تھے پھر انہوں نے مایوسی سے کہا......

''پورا کمرہ خالی پڑا ہے...... بیٹا۔ یہاں کچھ بھی نہیں۔''

''ہاں ایسا ہی نظر آ رہا ہے......''

''پتہ نہیں اللہ کی کیا مرضی ہے کیا ہوگا ہمارا' سچی بات یہ ہے کہ بیٹی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا' مجھے رات کو بالکل نیند نہیں آتی آؤ بیٹا چلیں یہاں سے' کوئی فائدہ نہیں' دیکھ لیا تم نے۔''

شہریار نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اس کے بعد اس نے چھت پر بھی دیکھا' لیکن کمرہ ویرانی کے علاوہ کوئی منظر پیش نہیں کر رہا تھا۔ شہریار باپ کے ساتھ باہر نکل آیا' نواب سراج الدین نے کہا......

''صبح ہو چکی ہے بازار سے ناشتہ لے آؤ......''

''ابو جیسا آپ کا حکم۔'' شہریار نے کہا......

''لو یہ پیسے رکھ لو......''

''پیسے میرے پاس ہیں۔'' شہریار بولا اور بازار سے حلوہ پوری لینے نکل گیا' حلوہ پوری کی دکان سائیں جیون کے مزار کے سامنے سے ہوتے ہوئے پڑتی تھی، سوچوں کے گرداب میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگا۔ اچانک اسے سائیں جیون کے مزار کے پاس والے بوہڑ کے درخت کے نیچے عمران بیٹھا نظر آیا۔ وہ کہیں کھویا ہوا تھا۔ شہریار دوڑ کر اس کے قریب گیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بے چینی سے بولا......

''عمران......! عمران تم......! عمران تم یہاں کیسے......؟'' عمران نے کھوئی کھوئی نگاہوں سے شہریار کو دیکھا اور بڑی نقاہت سے بولا......

''پتہ نہیں......''

''اٹھو......اٹھو یہ کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری؟ کیا ہوا' کیا واقعہ پیش آیا تمہارے ساتھ......''

''پتہ نہیں۔'' عمران پھر کھوئے کھوئے لہجے میں بولا اور شہریار پریشان نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا' وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے' اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ عمران کو اٹھا کر اس کے گھر لے جائے اپنے گھر لے جانا تو خطرناک ہو سکتا تھا۔ پتہ نہیں اس سے کس طرح باز پرس کی جاتی۔ نواب صاحب پہلے ہی سخت پریشان تھے اور مصیبت کھڑی کر دیتے۔

''اٹھو عمران اٹھو۔'' شہریار نے بازو سے پکڑ کر عمران کو اٹھایا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چاروں طرف دیکھنے لگا......

''میرے دوست کیا ہوا......تم تو اس کمرے میں گئے تھے، یہاں کیسے پہنچے؟''

''مجھے کچھ یاد نہیں...... مجھے کچھ پتہ نہیں۔'' عمران کا ایک ہی جواب تھا۔

''آؤ گھر چلو' شہریار راستے میں سوچ رہا تھا کہ عمران کے گھر والوں سے کیا کہے گا' ناہید آنٹی اپنے بیٹے کو بے انتہا چاہتی تھیں اسے اس حال میں دیکھیں گی تو ان کے دل پر کیا گزرے گی۔

عمران کے گھر تک جاتے ہوئے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے آپ کو اس معاملے سے لاعلم ظاہر کرے گا اور کہے گا کہ پتہ نہیں عمران سائیں جیون کے مزار پر کیسے جا بیٹھا تھا۔ یہ

نہیں بتائے گا کہ وہ اس کمرے میں داخل ہوا تھا ورنہ آنٹی سوچیں گی کہ دوسرے کی اولاد کو مصیبت میں جھونک دیا۔ انہی خیالات میں ڈوبا آخر کار وہ عمران کے گھر پہنچ گیا۔ دروازے کی بیل بجی تو مونا دروازہ کھولنے آئی جو رات اپنی مما کے ساتھ رہنے کے لیے آئی تھی۔ دروازے پر شہریار کو دیکھ کر اس کے گالوں سے شفق پھوٹ پڑی جو کانوں کی لوؤں تک چلی گئی۔

''آپ! خیریت تو ہے......؟''

''مونا' وہ میں...... میں سائیں جیون کے مزار کے پاس سے گزر رہا تھا کہ...... کہ عمران...... عمران......''

''ہاں' بھائی سو رہے ہیں ابھی تک' دوبار جگا چکی ہوں اٹھے ہی نہیں' حالانکہ وہ اتنی دیر تک نہیں سوتے......''

''کون......؟'' شہریار نے حیرانی سے پوچھا......

''عمران بھائی کی بات کر رہے ہیں نا آپ......''

''ہاں' مگر عمران' شہریار نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ عمران وہاں نہیں تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تو مونا نے کہا......

''کیا بات ہے شہریار؟ کوئی پریشانی ہے آپ کو؟''

''مونا ابھی یہاں میرے پیچھے...... میرا مطلب ہے......''

''آپ اندر تو آیئے۔'' مونا نے شہریار کا ہاتھ پکڑ لیا اور شہریار احمقوں کی طرح منہ اٹھائے اندر چلا گیا اس نے لرزتی آواز میں پوچھا......

''عمران کہاں سو رہا ہے؟''

''اپنے بیڈ روم میں۔'' مونا نے جواب دیا۔

عمران بیڈ پر چادر اوڑھے سو رہا تھا اس کا چہرہ کھلا تھا اور صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ گہری نیند سویا ہوا ہے' ہلکے ہلکے خراٹے بھی اس کے منہ سے خارج ہو رہے تھے۔ شہریار کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ وہ کون تھا جو عمران کے روپ میں رات پراسرار کمرے میں داخل ہوا اور اب اس کے ساتھ دروازے تک آیا اور پھر غائب ہو گیا۔ آہ یہ کیا قصہ ہے ان لوگوں کو اس بارے میں بتا دوں یا خاموش رہوں۔ اس نے سوچا کہ میں نے یہ

بات بتا دی تو یہ میری باتوں پر یقین نہیں کریں گے کیونکہ عمران تو یہاں سو رہا ہے یا پھر خوفزدہ ہو جائیں گے۔ اس نے خاموشی کو مناسب جانا۔ مونا کہنے لگی......

''جگا دوں بھائی کو......''

''نہیں میں ایسے ہی اسے دیکھنے آ گیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے خیال آیا تھا کہ عمران کی طبیعت خدانخواستہ خراب ہے۔''

اتنے میں آنٹی بھی آ گئیں اور حال احوال پوچھا۔

''آنٹی بس آپ دعا کریں اب تو ہمارے پاس کرنے کے لئے اس کے سوا کچھ بھی نہیں رہ گیا۔ ابو نے ناشتہ منگوایا تھا۔ باہر نکلا تو پتہ نہیں کیوں عمران کا خیال آیا تو اسے دیکھنے آ گیا......''

''دیکھو بیٹا! کیسی گہری نیند سو رہا ہے میرا خیال ہے کہ میں اسے جگا دوں......''

''نہیں آنٹی سونے دیجئے' پلیز' میں چلتا ہوں......''

''بیٹھو بیٹا! چائے پی کر جانا۔''

''نہیں آنٹی' گھر جا کر ناشتہ کروں گا۔'' شہریار نے کہا اور حواس باختہ سا باہر نکل آیا۔ حلوہ پوری خرید کر گھر کی طرف چل دیا۔

☆......☆......☆

حسینہ کی گمشدگی کے بعد زندگی سسک سسک کر گزر رہی تھی۔ کسی کے دل میں کوئی امنگ نہیں تھی۔ حسرت اور یاس چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔ در و دیوار بھی خاموش نظر آتے تھے' وہ منحوس کمرہ حسینہ کو نگل گیا تھا۔ لیکن شہریار کو عمران کے سلسلے میں بڑی پریشانی تھی۔ شہریار آج بھی کالج نہیں گیا تھا۔ ناشتے کے بعد اُس نے ارادہ کیا کہ جا کر ذرا عمران کی خبر لوں' لیکن عمران خود ہی ان کے گھر پہنچ گیا......شہریار نے دروازہ کھولا تو دونوں وارفتگی سے بغل گیر ہو گئے۔ شہریار نے کہا۔

''عمران آؤ اندر......''

''نہیں یار...... یہاں بیٹھ کر باتیں کرنے کی بجائے کہیں اور چلتے ہیں۔''

''چلو پھر کسی ہوٹل میں بیٹھ کر بات کریں گے'' اور دونوں بستی کے ایک چائے

خانے پر پہنچ گئے۔

''اب بتاؤ عمران! اس کمرے میں داخل ہونے کے بعد تم پر کیا گزری؟ میں تو عجیب وغریب الجھنوں میں پھنس گیا ہوں۔ شاید تم یقین نہ کرو کہ میں نے صبح تمہیں سائیں جیون کے مزار پر بیٹھے دیکھا۔ میں وہاں سے تمہیں ساتھ لے کر تمہارے گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ تم تو اندر سو رہے ہو۔ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو تمہارا نام و نشان نہیں تھا...... ان واقعات نے مجھ پر جو اثر کیا ہے تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اب تم بتاؤ جب تم رات کمرے میں داخل ہوئے تو کیا ہوا تھا؟'' عمران گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے تمام واقعات تسلسل کے ساتھ من وعن شہریار کے گوش گزار کر دیئے اور آخر میں کہا ''پہلے مجھے ہوش آیا تو سائیں جیون کے مزار پر ہی تھا لیکن پھر مجھ پر دوبارہ غنودگی چھا گئی اور جب آنکھ کھلی تو میں اپنے بستر پر تھا۔

''حیرت انگیز...... ناقابلِ یقین۔'' شہریار کی زبان سے نکلا۔

''دیکھو شہریار!'' عمران بہ دستور سنجیدہ تھا۔ حسینہ کسی مشکل کا شکار ہوگئی ہے۔ وہ میری بیوی اور تمہاری بہن ہے۔'' شہریار نے عمران کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا......

''مجھے معلوم ہے اور مجھے فخر ہے کہ تم جیسا بہادر دوست میرا بہنوئی ہے۔ ہم دونوں بہنوئی ہیں ایک دوسرے کے۔

دونوں دوست دل کی بھڑاس نکالتے رہے۔ گھر والوں کی حالت الگ خراب تھی۔ وہ لوگ سوچتے رہے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔ کوئی ایسی بات ہو جو اس مشکل میں کارآمد ہو سکے۔''

☆......☆......☆

''صورت حال پھر جوں کی توں ہوگئی۔ ہر طرف جمود سا طاری تھا۔ حسینہ ہنوز ا پتہ...... گھر پر وہی ماتمی فضا...... امی جان رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں۔ سارا دن سائیں جیون کے مزار کی جالیاں پکڑ کر بیٹھی رہتی ہیں۔

دادی اماں تو مصلّے سے ہی لگ گئیں۔ تسبیح کے دانے اور شبنمی قطرے گراتی رہتی۔

نواب سراج الدین ایک مضبوط، متمول، بہادر شخصیت کے دبنگِ آدمی تھے لیکن ٹی کی جدائی میں ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے اُبھر آئے تھے۔ ہاتھوں میں

رعشہ آنے لگا تھا۔ شہریار اور مونا کا ہنی مون سسکیوں اور آہوں میں گزر رہا تھا۔ پروفیسر ناہید بہو کی گم شدگی اور بیٹے کی حالت دیکھ کر اپ سیٹ رہنے لگیں تھیں لیکن کوئی کر بھی کیا سکتا تھا۔ کسی کے بس میں تھا ہی کیا۔

عمران اُٹھتے بیٹھتے حسینہ کے خواب دیکھتا رہتا۔ اکثر راتوں کو ہڑبڑا کر اُٹھ جاتا اور حسینہ...... حسینہ پکارنے لگتا۔ ایک رات اس نے خواب دیکھا...... کہ...... وہ ایک وادی میں کھڑا ہے جہاں ہر طرف اُونچے اُونچے پہاڑ ہیں سر اُٹھا کر جو دیکھا تو پرندوں کی لمبی لمبی قطاریں، یخ بستہ رواں چشمہ اور خوش الحان طیور کی چہچہاہٹ تھی۔ منظر تبدیل ہوتا ہے۔ اب عمران کو ایک سنہری محل نظر آتا ہے جو آشیانہ سے مشابہ ہے۔ پھر عمران اپنے آپ کو اس محل کے اندر موجود پاتا جہاں ہر طرف نوعمر کنیزیں گھوم رہی ہیں۔ حسن کی ارزانی وفراوانی ہے۔ درجنوں کے حساب سے لڑکیوں کے غول تتلیوں کی مانند پھر رپھر کر رہے ہیں۔

یہاں اس نے دیکھا کہ حسینہ ایک ہیروں سے بنے سنگھاسن پر بیٹھی ہے اس کے اردگرد بے شمار باندیاں زرق برق لباسوں میں ملبوس پھر رہی ہیں اور حسینہ کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں عمران کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ حسینہ زارو قطار رو رہی ہے۔ وہ حسرت بھری نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہے اور کچھ کہہ رہی ہے۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے، لیکن کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ عمران کی آنکھ کھل گئی تو اس کے بعد وہ جس بے چینی سے تڑپا وہ ناقابلِ دید تھی۔ بمشکل تمام رات گزار کر وہ علی الصبح شہریار کی حویلی پہنچا تو سب لوگ ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب سراج الدین حیرت سے منہ کھولے شہریار کی باتیں سن رہے تھے اور شہریار کہہ رہا تھا۔

''خدا کی قسم امی! وہاں ایسی برف پھیلی ہوئی تھی کہ دیکھنے والوں کو زمین و آسمان میں کوئی فرق نظر نہ آئے، یوں لگتا تھا جیسے زمین سے آسمان تک برف کی چادر تنی ہو پھر میں نے اس منظر میں ایک سنہرے رنگ کا محل دیکھا جس کے اوپری حصے پر نیلے اور سنہرے رنگ کے کلس نظر آ رہے تھے۔

''ہاں! وہ خوبصورت محل اس برف کے علاقے میں موجود تھا مجھے یوں لگا جیسے......''

''تمہارا وجود ایک ہوا کی طرح اس محل کے اندر داخل ہوا ہو اور وہاں تم نے حسینہ کو

دیکھا ہوگا جو ہیروں سے بنے سنگھاسن پر بیٹھی زاروقطار رو رہی تھی۔'' عمران نے شہریار کی بات کاٹ کر جملہ مکمل کیا تو سب ہی چونک اُٹھے۔

''ہیں......! عمران تم یہ کیا سنا رہے ہو......؟ خواب تو شہریار نے دیکھا ہے......''
جہاں آرا نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

''نہیں آنٹی! یہ خواب میں نے بھی دیکھا ہے......''

''تم نے بھی......؟''

''جی ہاں میں نے بھی......''

''رات کو......؟''

''جی ہاں رات ہی کو......''

''بتاؤ کیا دیکھا......؟''

''میں نے دیکھا' ایک وسیع و عریض برفانی علاقہ ہے، چاروں طرف برفانی چادر تنی ہے۔ پھر میں نے وہاں سنہرے رنگ کے محل کو دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے میرا وجود ہوا میں اڑ رہا ہو۔ میں اس محل میں داخل ہوا تو میں نے حسینہ کو دیکھا جو ایک خوبصورت اور دیدہ زیب تخت پر بیٹھی ہوئی تھی' باندیاں خدمت کر رہی تھیں' لیکن حسینہ زاروقطار رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حسرت و یاس کے ڈیرے تھے جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ آہ! مجھے یہاں سے نکال کر لے چلو۔ مجھے نکال کر لے چلو......''

شہریار اور باقی گھر والے حیران پریشان ہو کر رہ گئے۔ شہریار نے بے اختیار کہا......
''خدا کی قسم یہی خواب میں نے دیکھا ہے امی جان یہ کیسے ہو سکتا ہے......''

اور پھر سب اِک دوجے کو خالی خالی نظروں سے تکنے لگے۔ پریشانیاں اور حیرانیاں سب ہی کے چہروں سے ہویدا تھیں۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ عمران اپنے کمرے میں گم صم، سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔ آہٹ پا کر سر اُٹھایا تو اسے شہریار نظر آیا۔ جو ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتے ہوئے اس کے پاس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا دونوں نے بے دلی سے ہاتھ ملایا اور خالی خالی نظروں سے اِک دوجے کو تکنے لگے۔

''عمران!'' شہریار نے آہستگی سے کہا۔

''ہوں۔'' عمران نے نظریں اُٹھائیں۔

''آج میں نے پھر اسی قسم کا خواب دیکھا ہے۔''

''ہیں......'' عمران یکبارگی چونکا اور پھر کہنے لگا۔''ارے اتفاق کی بات ہے کہ میں نے بھی وہی خواب پھر دیکھا ہے لیکن......'' عمران نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''شہریار میں نہیں مانتا کہ یہ اتفاق ہے۔''

''پھر......؟''شہریار نے سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔

''میرا خیال ہے قدرت کی طرف سے ہمیں اشارے مل رہے ہیں۔خواب بے مقصد نہیں ہوتے۔''

''ان خوابوں میں کیا مقصدیت ہے؟''شہریار کا لہجہ اُلجھا ہوا تھا۔

''شہریار! ہم یہاں بہت کچھ کر چکے' کہا جاتا ہے کہ سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے کسی بات کی خواہش اگر انسان کرے تو اللہ اس کی مدد ضرور کرتا ہے۔میری رائے تو یہ ہے کہ ہم دونوں اس محل کی تلاش میں نکلتے ہیں......''

''کیا یہ بے وقوفی نہیں ہوگی......؟ اکیسویں صدی میں سنہری محل کی تلاش۔'' شہریار پھیکی سی ہنسی ہنسا۔

''یار انسان زندگی میں بے شمار بے وقوفیاں کرتا ہے۔ایک یہ بھی سہی۔''

''لیکن بے وقوفی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔''شہریار نے کہا۔

''حد عقل کی ہوتی ہے۔بے وقوفی اور عشق کی کوئی حد نہیں ہوتی۔'' عمران نے مدلل جواب دیا۔

''یار مگر......میرا دل ایسی لایعنی باتوں کو نہیں مانتا۔''شہریار جیسے اپنی بات پر ڈٹ گیا۔

''لیکن اُس پر آسیب کمرے میں جا کر حسینہ کا غائب ہو جانا، اور خود میرا اس کمرے میں گھسنے کے بعد پہلے سائیں جیون کے مزار کے باہر ظاہر ہونا اور پھر اپنے بستر پر آ جانا۔کیا ان سے زیادہ بھی کوئی لایعنی باتیں ہوسکتی ہیں جن کے گواہ ہم تم دونوں ہیں۔عمران نے منطق لڑائی۔

''لیکن...... پھر بھی عمران ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم......''

''نہیں دوست'' اگر مگر کی بات چھوڑو' دیکھوتم سے صاف صاف دل کی ساری باتیں کہہ چکا ہوں' خدا کے لئے کچھ سوچو' غور کرو' اگر میرا ساتھ دوتو اس سے بڑی اور کوئی بات نہیں ہے......اور اگر نہیں دو گے تو بھی میں کسی دن چپکے سے نکل جاؤں گا۔'' عمران نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''کیسی بات کرتے ہو دوست! حسینہ تمہاری بیوی ہے مگر میری بھی تو بہن ہے میں اس کی تلاش میں زندگی بھی ہار سکتا ہوں......خدا کے لیے ہمیں چھوڑ کر کہیں نہ جانا اور پھر جاؤ گے بھی کہاں؟''

''لیکن یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بھی کب تک بیٹھے رہیں؟''

''تو پھر کیا کیا جائے......؟

''میرا خیال ہے گھر والوں سے کوئی بہانہ کر کے چلتے ہیں......''

''کیا بہانہ کرو گے......؟

''سنو شہریار!'' عمران کے چہرے پر گھمبیرتا کا راج تھا۔''قدرت ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔ ہم دونوں کا ایک ہی خواب دیکھنا اور ایک سے زیادہ بار دیکھنا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ حسینہ کے سلسلے میں ہم دونوں کو ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ حسینہ جس مشکل کا شکار ہے اس سے اسے ہم ہی نکال سکتے ہیں۔''

لیکن ہم کیا کریں گے؟'' شہریار کے چہرے پر مایوسی اور لہجے میں بے بسی نمایاں تھی۔

''ہم سفر کریں گے کیوں کہ سفر وسیلہء ظفر ہوتا ہے۔'' عمران مضبوط ارادے سے بولا۔

''مگر جائیں گے کہاں؟'' شہریار کی سمجھ گھبراہٹ کا شکار تھی۔

''برف زاروں کی طرف۔'' عمران جیسے کہیں دور سے بول رہا ہو۔

''برف زاروں میں۔''

''ہاں! آشیانہ نما سنہرا محل ہمیں وہیں ملے گا۔ ہمارا مشترکہ خواب یہی کہتا ہے۔ یقیناً حسینہ سے ملاقات ادھر ہی ہوسکتی ہے۔''

''لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ جس سمت ہم چلیں سنہرے محل کا پتہ وہیں سے ملے؟''

شہریار ہر بات صاف کرنا چاہتا تھا۔

''کچھ باتیں تقدیر پر چھوڑ دینی چاہئیں۔'' عمران نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''آئیڈیا......!'' شہریار یکدم ہی پرجوش ہوگیا۔

''کیا......؟'' عمران نے سوالیہ نظریں شہریار پر گاڑ دیں۔

''خوابوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہم برف زاروں کے اوپر جا رہے ہیں جبکہ پرندے ہمارے مخالف سفر کر رہے ہوتے ہیں۔''

''یعنی......؟'' عمران نے پوچھا۔

''یعنی یہ کہ پرندے ہمیشہ شمال مغرب سے آتے ہیں لہٰذا ہمیں اپنی منزل کا کھوج بھی شمال مغرب میں ہی ملے گا۔''

''زبردست ہے یہ آئیڈیا۔'' عمران نے تحسین بھری نظروں سے شہریار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے تو پھر ہم تیاری شروع کرتے ہیں۔'' شہریار بھی اب مصمم ارادہ باندھ چکا تھا۔

''لیکن......'' وہ بولتے بولتے رک گیا۔

''گھر والوں کو کیا بتائیں گے؟''

''یہی کہ کسی دوسرے شہر میں ہمیں کسی عامل کا پتہ ملا ہے جو ہر طرح کے روحانی علوم کا ماہر ہے۔ ہم اس کے پاس جا رہے ہیں۔'' عمران نے شہریار کی تشویش کو زائل کر دیا۔

☆......☆......☆

تیز ہوا کے تھپیڑوں سے حسینہ کی آنکھ کھل گئی تو اچانک وہ چیخنے لگی۔ کیونکہ ہزار جان جن کی اصلی شکل اس کے چہرے کے عین سامنے تھی۔ کالا بھجنگ کم از کم دس فٹ چوڑا چہرہ موٹے کالے بھدے ہونٹ چھوٹے چھوٹے گھنگھریالے بال، کانوں میں لوہے کے بالے، ناک سے دھواں نکل رہا تھا اور سر پر دو بڑے بڑے سینگ۔ حسینہ نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ ہزار جان جیسے دیوہیکل جن کی ہتھیلی پر لیٹی تھی اور ہزار جان ہزاروں فٹ کی بلندی پر اڑتا جا رہا تھا۔ نیچے دور دور تک حسینہ کو برف ہی برف نظر آ رہی تھی۔ چاروں

طرف فلک بوس برفیلے پہاڑ تھے اور ان برفانی پہاڑوں پر ہزار جان اُڑا چلا جا رہا تھا۔

حسینہ مارے خوف کے چیخنے لگی۔ ہزار جان نے اس کی چیخیں سن کر اپنی چوکور لال آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور شیطنیت سے بھرپور مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھرنے لگی۔ اس کے پیلے زرد گندے دانت اسے نظر آئے تو ابکائی سے اس کا دل خراب ہونے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے نوکیلی چھریاں ہوں۔ کچھ دیر حسینہ گم سم پڑی رہی پھر اس نے ڈرتے ڈرتے دائیں بائیں اوپر نیچے دیکھا تو رونے لگی کیونکہ ہزار جان اس وقت اپنی اصل حالت میں تھا۔ اس کا بھدا اور بے ڈھنگا بھاری بھرکم وجود ایک عام انسان سے کم سے کم پچاس گنا زیادہ تھا اور وہ طوفانی رفتار سے انتہائی اونچائی پر اُڑ رہا تھا۔ اس کی ہتھیلی جس پر حسینہ لیٹی ہوئی تھی اور پھر بیٹھ گئی تھی اتنی بڑی تھی جس سے نیچے گرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ جانے یہ ہزار جان کے جادو کا کرشمہ تھا یا اس کی کوئی اور وجہ تھی۔

اور پھر اچانک ہزار جان کی رفتار اور بلندی کم ہونے لگی اور وہ نیچے اترتے لگا۔ نیچے ہر طرف برف کی چادر تنی تھی۔ معاً حسینہ کو برفانستان کے بیچوں بیچ آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ اب ہزار جان نیچے اترنے کے لیے انتہائی نیچی پرواز کر رہا تھا تو حسینہ کو انتہائی خوبصورت قسم کے گھر نظر آئے جو عام قسم کے مکانات سے قطعی مختلف اور منفرد نظر آ رہے تھے۔ انتہائی آراستہ پیراستہ پرتعیش قسم کے گھر بلکہ گھر نہیں انہیں چھوٹے چھوٹے محلات کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اور پھر ہزار جان حسینہ کو اپنی ہتھیلی پر بٹھائے اس جنت نظیر وادی میں اتر گیا، لیکن رکا نہیں بلکہ زمین سے چند فٹ بلند رہ کر تیرنے کے انداز میں چلتا چلا گیا۔ حسینہ پٹ پٹاتی آنکھوں سے ہر طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے جا بجا خوبصورت لڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ صاف شفاف سڑکوں پر کسی قسم کی گاڑی نہ تھی اور نہ کسی طرح کا شور بلکہ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ سڑکوں پر خوبصورت بگھیاں تھیں جن کے آگے ہرن اور بارہ سنگھے جتے تھے۔ لیکن وہ بھی چلتے وقت بے آواز تھے۔ اور پھر ایک بہت بڑا محل نظر آیا۔ سفید سنگ مرمر سے بنا ہوا۔ ہزار جان جن اس کے مرکزی دروازے کے اوپر سے ہوتے ہوئے اس کے اندر داخل ہو گیا اور پھر مختلف راہداریوں اور برآمدوں سے ہوتا ہوا شاہی ایوان تک آ گیا جہاں ہر طرف سنہرے

ستون تھے جن کے اوپر بیضوی شکل کی بہت بڑی چھت تھی جس پر سینکڑوں فانوس لٹک رہے تھے۔ ہال کے بیچوں بیچ دربار لگا تھا۔ ایک طرف چبوترے پر ملکہ نما لڑکی خوبصورت و بیش قیمت پوشاک زیب تن کیئے تخت پر بیٹھی تھی۔ اس کے گرداگرد سینکڑوں حسیناؤں کا جھرمٹ تھا۔ ہزار جان کے فرش پر اترتے ہی جیسے کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ یوں لگتا تھا فرش پر اترنے سے قبل ہزار جان اور حسینہ کسی کو نظر نہیں آ رہے تھے کیونکہ فرش پر ان کے اترتے ہی ہر طرف بھنبھناہٹ ہونے لگی۔ ملکہ نما دوشیزہ بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لڑکیوں کا غول کشاں کشاں ان کے گرد سمٹنے لگا۔ سب ہی لڑکیاں حسینہ کو پُرشوق نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ حسینہ جو دلہن کے سرخ لباس میں ملبوس تھی، اس سارے منظر کو حیرانی اور پریشانی سے دیکھ رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔ وہ تو دلہن بن کر سیج پر بیٹھی اپنے عمران کے انتظار میں تھی اور پھر اچانک ہی اسے غنودگی آ گئی تھی اور...... اور...... پھر جب آنکھ کھلی تو ہزار جان اسے ہتھیلی پر بٹھائے اُڑا چلا جا رہا تھا۔ اور اب...... یہ...... سب کچھ...... اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔

اور پھر حسینہ کی چیخ نکل گئی...... جب اس کی نظروں کے سامنے ہزار جان جن سمٹنے اور چھوٹا ہونے لگا۔ سمٹتے سمٹتے ہزار جان کا وجود ایک عام انسان کی مانند نظر آنے لگا اور پھر اس کی جسمانی ہیئت میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ اس کی ڈراؤنی شکل صاف اور خوبصورت ہونے لگی۔ چہرے بازوؤں، ہاتھوں اور جسم کے دیگر جگہوں سے بال ختم ہونے لگے اور کچھ ہی دیر میں ہزار جان ایک سرخ و سپید سمارٹ نوجوان کی شکل میں آ گیا۔ ایک انتہائی خوبصورت نوجوان...... پتلا بانکا...... سجیلا...... شہزادوں کا سا لبادہ کمر میں پٹکا، پٹکے میں تلوار، سنہرے جوتے، سنہری پگڑی جس میں موتی جڑے تھے۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، چوڑا ماتھا، مغل شہزادہ۔

حسینہ سب کچھ بھول بھال کر اپنی آنکھیں پٹ پٹانے لگی۔

''کون ہو تم؟'' اس کی زبان سے اضطراری طور پر نکلا۔

''پہلے بھی بتایا تھا کہ تمہارا عاشق ہوں...... تم میری پسند میری گلشار ہو......''

''میں گلشار نہیں حسینہ ہوں۔''

''نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' مغل شہزادہ مسکرایا۔ ''میں تمہیں گلشار ہی سمجھتا ہوں۔ اور اب تم سے شادی کروں گا۔ اور تم میری اس سلطنت کی ملکہ بنو گی۔''

''لیکن میں تمہاری ملکہ بننا نہیں چاہتی۔'' حسینہ جھنجلا کر رونے کے سے انداز سے بولی۔

''تمہارے چاہنے یا نہ چاہنے کی کوئی اہمیت نہیں ہوگا وہی جو ہزار جان چاہے گا۔''

اور پھر ہزار جان کے حکم سے دو لڑکیوں نے حسینہ کو تھام لیا اور ایک سجے سجائے کمرے میں لے آئیں۔ جہاں قیمتی مسہری بچھی ہوئی تھی۔ حسینہ کو آہستگی سے لٹا دیا گیا اور پھر اسے پینے کے لئے کوئی مشروب پیش کیا گیا۔ مشروب پیتے ہی حسینہ کا سر بھاری ہونے لگا اور وہ تکیے پر سر رکھ کر سو گئی۔

☆......☆......☆

حسینہ کی آنکھ کھلی تو چند ساعتوں تک وہ بے حس و حرکت رہی اور پھر ایک جھٹکے سے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ ارد گرد نظریں ڈالیں تو ہکا بکا رہ گئی۔ وہ ایک ایسے کمرے میں موجود تھی جس کی لمبائی چوڑائی حیران کن تھی۔ روشنیاں اس قدر تھیں کہ آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں۔ سجاوٹ ایسی کہ کسی محل کا گمان ہوتا تھا۔ وہ جس مسہری پر موجود تھی وہ دس پندرہ فٹ لمبائی چوڑائی کے ساتھ اطلس و کمخواب کے بستر سے مزین تھی۔ انتہائی قیمتی نفیس سفید رنگ کا دبیز اور نرم بستر۔ اور پھر اس کی نظریں اپنے لباس پر پڑیں تو حیرت سوا ہو گئی۔ پرانے زمانے کی شہزادیوں والی پوشاک تھی۔ حسینہ کی حرکات سے اس کے جسم پر موجود زیورات کھنکھنا اُٹھے۔ اب جو اس نے دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کی دونوں کلائیوں میں ٹھوس سونے کے درجنوں کنگن تھے۔ ہر انگلی میں ہیرے جڑی انگوٹھیاں، سر، گردن، پاؤں غرضیکہ محاورتاً نہیں حقیقتاً وہ زیورات سے لدی پھندی تھی جو اس کی معمولی حرکت سے چھن چھن کرنے لگتے۔ وہ بوکھلا کر فرش پر کھڑی ہو گئی۔ معاً اس کی نگاہیں اٹھی تو درجن بھر حسین و جمیل لڑکیاں خادماؤں کے انداز میں ہاتھ باندھے اسے جا بجا کھڑی نظر آئیں جبکہ ہر لڑکی حسن و جمال میں یکتا تھی۔

اس کے کھڑے ہوتے ہی دو لڑکیاں تیزی سے اس کے قدموں تک آ جھکیں اور قریب پڑی اونچی ہیل والی سینڈل اس کے پاؤں میں پہنانے لگیں۔

حسینہ کی سمجھ دانی پٹ پٹا چکی تھی۔ جوتے پہنا کر دونوں حسینا ئیں کھڑی ہو کر حسینہ کے گرد ہاتھ باندھ کر مؤدبانہ لیکن سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

مم......میں کہاں ہوں؟ حسینہ کے ہونٹوں سے سوال اُبھرا۔

دونوں لڑکیوں کی نگاہیں آپس میں ٹکرائیں اور پھر ایک بولی۔

''آپ عالم پناہ! شاہ جنات ہزار جان کے عروس البلاد کے شاہی محل میں ہیں۔

جواب سن کر حسینہ کو سب کچھ یاد آ گیا۔ اور پھر وہ بے بسی سے اپنے ہونٹ اپنے دانتوں سے کاٹنے لگے۔

''تم کون ہو؟'' وہ غصے سے ان سے مخاطب ہوئی۔

''ہم آپ کی خادمائیں ہیں۔''

''وہ کہاں ہے؟'' وہ چیخی۔

''ہم نہیں جانتیں!'' خادمائیں نظریں جھکا کر دھیمی اور پُرادب آواز میں بول رہی تھیں۔

''تو پھر کون جانتا ہے مجھے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔'' وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی اور پھر دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر زور زور سے رونے لگی۔

☆......☆......☆

دونوں چپکے چپکے تیاریاں کرنے لگے اور گھر والوں کے کانوں میں یہ بات بار بار انڈیلنے لگے کہ ہم حسینہ کا پتہ چلانے کے لیے فلاں شہر کے فلاں عامل کے پاس جا رہے ہیں۔ چاروں طرف سے نا اُمیدی کی دھند میں گھرے گھر والوں نے طوعاً و کرہاً انہیں جانے کی اجازت دے دی تو ان کی تیاریوں میں تیزی آ گئی اور بالآخر وہ دن آ پہنچا جس روز انہوں نے برفانی علاقوں کی طرف اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے کوچ کرنا تھا۔

بستی شہر سے دور ایک نیم پہاڑی علاقہ تھا جس سے شمال کی سمت تقریباً دو سو کلومیٹر بعد باقاعدہ پہاڑی سلسلے شروع ہو جاتے تھے۔ دونوں نے بستی سے قریبی قصبے تک چنگ چی سے سفر کیا۔ قصبے سے انہوں نے رینٹ اے کار سے گاڑی بمعہ ڈرائیور حاصل کی اور اسے ایک ایسے شہر کا نام بتایا جہاں سے آگے برفانی علاقہ شروع ہو جاتا تھا اور گاڑیاں بھی وہیں تک جاتی تھیں۔ گاڑی نے شام تک انہیں مطلوبہ شہر تک پہنچا دیا۔ گرمیوں کا موسم ہونے کے باوجود یہاں اچھی خاصی خنکی تھی۔ انہوں نے ایک اچھے ہوٹل میں قیام کیا۔ ان کا پروگرام تھا کہ تقریباً تین چار دن یہاں ٹھہر کر کوہ نوردی کے متعلق معلومات حاصل کریں گے اور کوہ پیمائی سے متعلق ضروری سامان خریدیں گے اور اللہ کا نام لے کر خوابوں اور سرابوں کے نقشے کے مطابق سفر شروع کر دیں گے۔

آخری شمالی شہر میں دونوں دوست کئی دنوں تک رہے اور سامان کی تلاش جاری رکھی۔ یہاں کے بازاروں میں کوہ نوردی اور کوہ پیمائی کا سامان آسانی سے مل جاتا تھا۔ ذاتی استعمال کے لیے کپڑے، سلیپنگ بیگ، رک سیک، پیراشوٹ کا خیمہ، ٹریکنگ شوز، ٹریکنگ سٹک، قطب نما، بند ڈبوں میں خشک غذائیں، چاقو، رسہ، برفانی کلہاڑا، جیکٹ، گھٹنوں کا حفاظتی غلاف، فرسٹ ایڈ باکس، سیونگ کٹ اور شیونگ کٹ۔ نائیلون کی ڈوری، شولڈر

بیگ، پانی کی بوتلیں، ماچس، لائٹر، موم بتیاں، بلندی ماپنے کا آلہ، علاقے کا نقشہ جس میں بلند چوٹیوں کے نام اور ان کے متعلق معلومات تھیں غرضیکہ ہر وہ چیز جو برفانی سفر میں ان کے کام آسکتی تھی، خرید لی گئی۔

خریدا گیا سامان چونکہ زیادہ تھا لہٰذا دو پورٹرز کا بندوبست کیا گیا اور ایک گائیڈ جس کا نام شہباز تھا، کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔

جمعہ کی خوشگوار اور چمکیلی دھوپ والی صبح کو اللہ کا نام لے کر وہ ایک کرائے کی جیپ میں ہوٹل سے نکلے اور سفر شروع کر دیا۔ ان کی جیپ ایک اونچی نیچی شاہراہ پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ اب ان کے دائیں طرف چوبیس ہزار تین سوفٹ بلند چوٹی تھی۔ ڈرائیور مقامی اور راستوں سے بخوبی آشنا تھا۔ اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت مضبوط اور چابکدستی دیدنی تھی۔ دو گھنٹے بعد وہ ایسے برفانی علاقے میں داخل ہو گئے جہاں راستے کے اطراف برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ سردی شدید ترین ہو چکی تھی۔ جیپ میں کل چھ افراد تھے ان دونوں کے علاوہ ایک گائیڈ دو پورٹر اور ایک ڈرائیور۔

اب تک کا سفر انتہائی خوشگوار گزرا تھا۔ ایسے مناظر انہوں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ کبھی وہ دور نظر آتی بلند و بالا سفید چوٹیوں میں کھو جاتے تو کبھی اردگرد تنی برف کی چادر کو تکنے لگتے۔ راستہ انتہائی پُرخطر اور شکستہ ہو چکا تھا۔

سہ پہر کو وہ ایک دریا کے پل پر سے گزر رہے تھے۔ پل کے پار پہنچ کر ڈرائیور نے جیپ کا رُخ موڑ دیا۔ اور مرکزی شاہراہ سے اتر کر ایک اور راستے پر آگے بڑھنے لگا۔ یہ سڑک زیادہ اچھی نہ تھی بلکہ کچی پکی تھی جو بلند سے بلند ہونے کے ساتھ چٹانوں کے اندر ہی اندر کہیں گم ہو رہی تھی۔ انہیں ان چٹانوں کے دوسری طرف پہنچنا تھا۔ پھر جیپ جناتی سلسلوں سے نکل کر ڈھلوان پر آ گئی۔

انہیں دور کسی آبادی کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی جیپ وہاں پہنچ کر رُک گئی۔

اس سے آگے جیپ نہیں جاسکتی...... ڈرائیور نے اعلان کر دیا تو عمران اور شہریار ایک دوسرے کو مشورہ طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔ آخر کار وہ جیپ سے اتر گئے۔ پورٹر اور

گائیڈ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" شہریار کے استفسار پر گائیڈ نے بتایا یہ بستی بستور ہے۔اس سے آگے گاڑی نہیں جاسکتی۔مزید سفر خچروں پر طے کیا جائے گا۔اور خچر اس بستی سے کرائے پر باآسانی دستیاب ہوجائیں گے۔"

"لیکن اب تو شام ہونے والی ہے۔" عمران نے کہا۔

"ہاں! سفر تو اب صبح ہی شروع ہوگا۔یہاں ریسٹ ہاؤس موجود ہے۔"

☆......☆......☆

"رات ریسٹ ہاؤس میں گزارنے کے بعد اگلے دن نئے سفر کے لیے وہ صبح سویرے ہی اُٹھ گئے۔سر بہ فلک چوٹیاں ان کی نگاہوں کے سامنے تھیں۔آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا طلوع آفتاب کا منظر بڑا ہی دل فریب تھا۔چمکیلی دھوپ کی روپہلی کرنیں برف پر چمکارے مار رہی تھیں۔منعکس ہوتی روشنی پر نظر جمانا دوبھر تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوکر چلنے کا عندیہ دیا گیا۔سفر کے اس حصے کے لیے خچر حاصل کرلیے گئے تھے۔ان کا گائیڈ شہباز خان اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا،اس نے نایا کہ راستے میں ان کا واسطہ برفانی ریچھوں سے بھی پڑسکتا ہے۔

خچروں کی کل تعداد چھ تھی۔دو پورٹر،ایک گائیڈ اور دو یہ خود تھے۔فالتو خچر پر امان لدا ہوا تھا۔پھر یہ مختصر قافلہ اونچی نیچی برفانی راہوں پر چل پڑا۔پورٹر اور گائیڈ یہی سمجھ ہے تھے کہ یہ دونو جوان کوہ نوردی یا کوہ پیمائی کے لیے آئے ہیں لیکن اصل بات کا علم صرف ران اور شہریار کو تھا جو سرابوں کے تعاقب میں گرم بستروں کو چھوڑ کر اس ٹھٹھرتے ماحول ں انجانی منزل کی تلاش میں سر پھٹول کرنے آئے تھے۔

کل تک تو گاڑیوں کا سفر تھا لیکن آج اصل مہم کا پہلا روز تھا۔

پہاڑیوں کے دامن میں تنگ پگڈنڈیوں پر خچر خراماں خراماں رواں دواں رہے۔

☆......☆......☆

عمران اور شہریار کا خچروں پر یہ پہلا سفر تھا لہٰذا تھوڑے سے سفر سے ہی دونوں کو ں میں اینٹھن سی ہونے لگی تھی۔پسلیاں جلترنگ بجانے لگیں۔دوپہر تک وہ اچھی خاصی

تھکاوٹ محسوس کرنے لگے لیکن برداشت کرتے رہے۔ وہ سب کے سامنے کم ہمتی کا ثبوت نہ دینا چاہتے تھے۔ تاہم سہ پہر تک ان کے اعصاب جواب دینے لگے تو وہ مہم کے گائیڈ شہباز سے استفسار کرنے لگے کہ پہلا پڑاؤ کب ہوگا۔ آخرکار چار بجے کے لگ بھگ شہباز نے اپنا خچر روک کر سب کو اُترنے کا اشارہ کیا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' عمران نے شہباز کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

''یہاں سے آگے راستہ دشوار ہے۔ عموماً اس طرف آنے والی پارٹیاں پہلی رات کا پڑاؤ یہیں کرتی ہیں۔'' شہباز نے عمران کے سوال نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے سگریٹ سلگائی اور پھر پورٹر کو اشارہ کیا تو وہ خچروں سے سامان کھولنے لگے۔ سامان کھول کر انہوں نے خیمے لگانے شروع کر دیئے۔

عمران اور شہریار ذرا ہٹ کر اردگرد کا نظارہ کرنے لگے۔

سرمئی پتھروں پر مشتمل مسطح میدان تھا جبکہ دور برف سے ڈھکی چوٹیاں دلکش منظر پیش کر رہی تھیں۔ سورج پہاڑوں کے دامن میں منہ چھپانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ چاروں طرف موجود پہاڑوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ شام تیزی سے اُتر رہی تھی کہ پہاڑوں پر شام اُترتی واضح طور پر نظر آتی ہے۔

خیمے ایستادہ ہو چکے تھے۔ رات کے اترتے ہی سردی میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا۔ شہباز نے اسٹوو جلایا۔ پورٹر کھانا بنانے میں مصروف ہو گئے۔ شہریار اور عمران نے سگریٹ سلگا لیے اور گپیں ہانکنے لگے۔ ایسا خواب ناک منظر وہ زندگی میں پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ دور پہاڑوں کی فلک بوس سفید چوٹیاں شام کے ملگجے میں دیوؤں کی طرح سر اُٹھائے آکاش کی وسعتوں میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

کھانا کھانے کے بعد وہ سلیپنگ بیگز میں گھس گئے۔ گائیڈ اور دونوں پورٹر نے تین تین گھنٹے جاگ کر ڈیوٹی دینی تھی جبکہ صبح پانچ بجے سب نے اُٹھنا تھا۔ کوہ نوردی میں سورج نکلنے سے قبل ہی سفر شروع کرنا پڑتا ہے جبکہ عصر کے وقت پڑاؤ ڈال لیا جاتا ہے۔

☆......☆......☆

دوسرا دن بھی خیریت سے گزر گیا تاہم عمران اور شہریار خچروں کے سفر سے تھک

جاتے تھے۔ عصر کے وقت وہ ایک آبادی میں پہنچ گئے۔ شہباز گائیڈ نے انہیں بتایا کہ یہ آخری انسانی آبادی ہے اس کے بعد کوئی آبادی نہیں بلکہ برفستان ہے۔ جہاں جانے والوں میں سے کچھ تو واپس ہی نہیں آتے۔ ''کچھ'' میں ہم بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ سوچتے ہی عمران زیرلب مسکرانے لگا۔

''کیا ہوا کیا سوچ رہے ہو؟'' شہریار نے اس کی مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔

''سوچ رہا ہوں یا تو اس برفانستان میں منزل پالیں گے یا کبھی......شاید......پھر برف میں برف بن کر برف ہی میں دفن ہو جائیں گے۔''

''السلام علیکم'' ایک بھاری بھرکم آواز نے انہیں چونکا دیا۔ ایک گٹھے ہوئے جسم کا انسان مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھا رہا تھا۔

''وعلیکم السلام'' شہریار نے ہاتھ ملایا۔

''میرا نام شمشیر خان ہے۔ میں اس علاقے کے ایک ایک چہرے کو پہچانتا ہوں۔ اجنبی چہرے دیکھتے ہی سمجھ گیا ہوں کہ آپ کوہ نورد ہیں۔ سوچا مہمان نوازی کا اعزاز حاصل کرلوں۔''

''بہت شکریہ آپ کا۔ کیا یہاں کوئی ریسٹ ہاؤس ہے؟'' عمران نے سوال کیا۔

لیکن شمشیر خان کے جواب دینے سے پہلے ہی گائیڈ کی آواز آئی۔

''ریسٹ ہاؤس نہیں صاحب! شمشیر خان کی حویلی کس لیے ہے۔'' آواز سنتے ہی شمشیر خان بولا۔

''اوہو شہباز بھی آیا ہے۔'' اور پھر دونوں ہنستے ہوئے بغلگیر ہو گئے۔

☆......☆......☆

شمشیر خان علاقے کی معتبر شخصیت تھی۔ آبادی سے قدرے ہٹ کر اس کی حویلی تھی۔ پورٹر تمام سامان حویلی میں لے آئے۔ رات کے کھانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ عمران اور شہریار شمشیر اور شہباز سے اگلے سفر کی بابت سوالات کرنے لگے۔ شمشیر خان نے انہیں بتایا ''زندگی کی کچھ سہولتیں اگر ہیں تو اس بستی میں ہیں۔ اس بستی کے بعد آپ کو شاید ہی کوئی انسان ملے۔ لہٰذا اپنے انتظامات پر ایک نظر اور دوڑا لیں۔ آگے تو بس جو سامان آپ

کے پاس ہے اس سے ہی کام چلانا ہوگا۔“

”خیر ضرورت کی تقریباً ہر چیز ہی ہم نے رکھ لی ہے۔ فرسٹ ایڈ باکس بھی موجود ہے۔“

”پھر بھی حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ برف کی وادی ہے۔ اس کی چوڑائی تو بتائی جا سکتی ہے۔ لمبائی کی کوئی حد نہیں...... قطب نما نہ ہونے کی وجہ سے اگر آپ راستہ بھٹک گئے تو مشکل ہو جائے گی۔ آپ یوں سمجھیں کہ کسی جادوئی سلطنت میں اپنے آپ کو پائیں گے جہاں اوپر سے نیچے...... آگے سے پیچھے دائیں سے بائیں اپنے آپ کو برفیلے جہنم میں پائیں گے۔ قدم قدم پر خطرات منہ کھولے کھڑے ہوں گے۔ برفانی ریچھ اور دیگر جانور بھی آپ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

باتیں جاری تھیں کہ کھانا تیار ہونے کی خبر آئی۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔

☆......☆......☆

منہ اندھیرے خچروں پر سوار یہ قافلہ انجانی راہوں پر روانہ ہو گیا۔ موسم گرما آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ تاہم اس علاقے میں سردی ابھی سے اچھی خاصی تھی۔ پو پھٹتے پھٹتے وہ آخری آبادی سے دور نکل آئے تھے۔ برف جو کل تک پہاڑوں کی چوٹیوں پر چمکتی دکھائی دیتی تھی اب پہاڑوں کے دامن سے لپٹی نظر آ رہی تھی۔ موسم صاف اور چمکتے شفاف آسمان کے شامیانے تلے بادلوں کے چند ٹکڑے روئی کے گالوں کی مانند اڑتے پھر رہے تھے۔ دُور پہاڑوں کے قدموں میں دریا پھسل رہا تھا۔ سورج منظرِ عام پر آنے کی تگ و دو میں تھا۔ جوں جوں یہ قافلہ آگے بڑھتا جا رہا تھا توں توں ویرانیاں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ پھر وہ ایک تنگ سے درے میں داخل ہو گئے۔ شہباز ان راستوں سے آشنا لگتا تھا۔ اسی لیے سالار کی حیثیت سے سب سے آگے والے خچر پہ اطمینان سے محوسفر تھا۔ باقی تمام لوگ اپنے اپنے خچروں پر اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے قافلہ اب آڑھی ترچھی تنگ گھاٹیوں سے گزر رہا تھا۔

یہ ایک پُرخطر مقام تھا جس کے دونوں اطراف بلند پہاڑ تھے۔ ملگجا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تنگ راستے پر چلتے چلتے جیسے ہی انہوں نے ایک اندھا موڑ کاٹا دریا ان کے سامنے آ گیا۔ پہاڑی تنگ درے پر چھوٹے پاٹ کے گہرے دریا کا پانی پتھروں سے سر پھٹول کرتے ہوئے خاصا شور مچا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بہت سے بھوتوں نے ہڑبونگ مچا

رکھی ہو۔ دریا کی چوڑائی اس مقام پر بہت کم تھی۔ دریا پر جھولتا ہوا، رسوں اور لکڑی کے پھٹوں کا پل بنا ہوا تھا۔ یہاں خچر روک کر سب نیچے اتر گئے اور پھر ایک ایک کر کے سب نے دریا پار کیا۔ دوسرے کنارے پر قدم رکھتے ہی انہیں پھر ویسا ہی آڑھا ترچھا راستہ نظر آ گیا۔ شہباز کی رہنمائی میں وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ پچھلے دو دنوں کی نسبت آج کا سفر زیادہ مشکل اور تھکا دینے والا تھا۔ سردی کا احساس بھی بڑھ گیا تھا۔ دوپہر کے بعد وہ پہاڑی درے سے باہر نکل آئے۔ اب ان کے سامنے ایک چھوٹی سی وادی تھی جہاں زمین پتھریلی تھی۔ پوری وادی چھوٹے بڑے پتھروں سے اَٹی ہوئی تھی۔ اس میدان کے آخری سرے پر ایک عمودی لیکن واضح طور پر دو ٹکڑوں پر مشتمل پہاڑی سینہ تانے کھڑی تھی۔ قافلہ چلتا رہا۔ اب وہ نسبتاً زیادہ بلندی پر تھے۔ تقریباً دو کلومیٹر چلنے کے بعد یہ میدان ختم ہو گیا اور وہ پہاڑی کے درمیان بنے راستے میں داخل ہو گئے۔ یہ درہ جو پہلے کی نسبت آسان بھی تھا اور قدرے کشادہ بھی۔ جلد ہی ختم ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر ایک کھلی وادی میں کھڑے تھے۔ سورج کا جھکاؤ مغرب کی جانب ہونے لگا تھا۔ تھوڑا سا مزید چلنے کے بعد شہباز رک گیا اور پلٹ کر کہنے لگا۔

''عمران صاحب! میرا خیال ہے کہ یہیں خیمے لگا لیتے ہیں۔ اس سے آگے راستہ دشوار ہے۔ یہ نہ ہو کہ پہاڑ کو عبور کرتے ہوئے رات آ جائے پھر مشکل ہو جائے گی۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' عمران اپنے خچر سے اُتر آیا...... اس کے ساتھ ہی شہریار نے بھی اپنی سواری سے چھلانگ لگائی۔

یہاں ایک بڑی چٹان بھی قریب ہی تھی۔ شہباز نے پورٹر کو ہدایت کی کہ خیمے اس چٹان کے پہلو میں لگائے جائیں۔

اتنے میں شہریار چونکا۔

''یہ کیسی آواز ہے......؟''

''کون سی آواز؟'' عمران اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہاں قریب ہی پانی کا چشمہ ہے۔'' شہباز سگریٹ سلگاتے ہوئے مخاطب ہوا۔

''یہ آواز اسی چشمے کے پانی کی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ چشمے کی طرف چل دیا۔ عمران اور شہریار بھی اس کے ساتھ حرکت میں آئے۔

قریب ہی ایک نشیبی چٹان کے پیچھے انہیں ایک چھوٹا سا خوبصورت منظر نظر آیا۔ شہباز کے کہنے کے عین مطابق وہاں پتھروں سے پھوٹنے والا شفاف پانی کا چشمہ تھا جو پانچ سات مربع فٹ جھیل کی شکل اختیار کرنے کے بعد آگے ڈھلان سے ندی بن کر بہہ رہا تھا۔ پانی انتہائی شفاف تھا کہ اس کی تہہ میں پڑے چھوٹے چھوٹے پتھر صاف نظر آ رہے تھے۔ چشمے کے پاس پاس چند جھاڑیاں اور دو درخت تھے۔ جن کی وجہ سے ایک خوبصورت منظر تخلیق ہو گیا تھا۔ دونوں نے ہاتھوں کے کٹوروں سے پانی پیا۔ پانی میٹھا اور مفرح تھا۔ پانی اور منظر کے مزے لینے کے بعد وہ واپس آ گئے۔ پیراشوٹ کے شوخ رنگ کے خیمے تن چکے تھے جن کا وزن برائے نام تھا۔ شام کے سائے طویل ہونے لگے تو کھانے کی تیاری شروع کر دی گئی۔ گوشت ان کے پاس موجود تھا۔ آٹا بھی وہ لے کر چلے تھے۔ دونوں پوٹر سٹوو جلا کر کھانا بنانے میں لگ گئے۔ شہباز کاربائیٹ لیمپ جلانے کی تیاری کرنے لگا۔ اندھیرے کی ابتداء ہوتے ہوتے کھانا تیار ہو چکا تھا۔ سب نے اکٹھے کھانا کھایا پھر چائے بنا کر پی گئی۔ یخ ماحول میں گرم چائے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ آج سردی کچھ زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ برفانی علاقے میں آ پہنچے تھے اور سطح سمندر سے ان کی بلندی بھی بڑھ چکی تھی۔

کھانے پینے سے فارغ ہوتے ہی وہ خیموں کے اندر سلیپنگ بیگز میں گھس گئے اور جلد ہی سو گئے۔ ایک پورٹر سگریٹ سلگائے پہرے پر بیٹھا رہ گیا۔

رات کا آخری پہر تھا کہ گھن گرج سے سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ بجلی چمکنے اور بادلوں کے کڑکڑانے کی آواز سے ماحول خوفناک ہو گیا تھا۔ بادلوں کے غول فیل بدمست کی طرح آسمان کے سینے پر دندناتے پھر رہے تھے۔ تیز ہوا سے خیمے اپنا وجود برقرار رکھنے کی کوشش میں سر پٹک رہے تھے۔

لیمپ بجھ چکا تھا جس سے اندھیرا مزید گہرا ہو گیا۔ خچر رسیاں تڑانے کی کوشش میں اچھل کود کر رہے تھے۔ عمران اور شہریار بھی سلیپنگ بیگ چھوڑ کر باہر آ گئے۔ خیمے زیادہ دیر تیز ہواؤں کے سامنے سینہ سپر نہ رہ سکے اور گر گئے اور پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اندھیرا، بارش، طوفان......سب کچھ ہی تلپٹ ہو گیا۔ عمران اور شہریار اپنے بیگ مضبوطی سے پکڑے

چٹان کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد پو پھٹی۔ بارش رک گئی۔ عجب ہی سماں تھا۔ خیمے غائب تھے، سامان پوری وادی میں بکھرا پڑا تھا، اکثر چیزوں کی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی۔ بس جن بیگوں کو دونوں نے تھاما ہوا تھا وہ ان کے پاس تھے۔ لیکن پانی میں نچڑ چکے تھے۔ سبھی کی بتیسی بج رہی تھی۔ خچروں کا کچھ پتہ نہ تھا۔ صرف ایک خچر جو رسی نہ تڑا سکا تھا نیم مردہ حالت میں پڑا تھا۔ مطلع صاف ہوا تو سب نے کپڑے جو بیگوں میں پڑے تھے نکال کر لباس تبدیل کیے لیکن ان کی حالت بھی بہتر نہ تھی۔

تھوڑی دیر میں دُھوپ نکل آئی۔ دُھوپ چمکدار تھی لیکن اس کی حدت زیادہ نہ تھی۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سفر جاری رکھتا۔ دھوپ لگنے سے حالت ذرا سنبھلی تو سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اِدھر اُدھر بکھرا ہوا سامان سمیٹا۔ خشک خوراک سے پیٹ پوجا کی۔

شہباز کاربائیٹ لیمپ ٹھیک کرنے میں مصروف ہو گیا۔ عمران اور شہریار ایک چٹان پر چمکیلی دھوپ سینکنے کے ساتھ ساتھ باتیں کرنے لگے۔ صورت حال دِگرگوں ہو چکی تھی۔ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ خیموں کے بغیر راتیں اس برف خانے میں کیسے بسر ہوں گی۔

عمران اور شہریار کا موضوع گفتگو صرف یہی تھا۔ جانے باتوں میں کتنی دیر گزر گئی اچانک انہیں احساس ہوا کہ دونوں پورٹر اور گائیڈ شہباز آپس میں سر جوڑے ان سے کافی دور سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ زیادہ دیر نہ گزری کہ وہ تینوں ان کے پاس آ گئے جیسے کوئی خاص بات کرنا چاہتے ہوں۔ دونوں انہیں سوالیہ نظروں سے تکنے لگے تو شہباز کہنے لگا۔ ''ہم آپ کو یہ کہنے آئے ہیں کہ اب ممکن نہیں رہا کہ کوہ نوردی جاری رہ سکے۔''

''کیا مطلب......؟'' عمران تیزی سے بولا۔

''مطلب یہ کہ اب ہم لوگوں کو واپس چلنا چاہیے۔ آگے سفر جاری رکھنے کا مطلب ہے موت کے منہ میں جانا۔''

''لیکن ہم واپسی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔''

''آپ کے مضبوط ارادوں کا مجھے علم ہے مگر مشکل یہ ہے عمران صاحب کہ آگے برفانی دوزخ ہے اور اس سرد جہنم میں بغیر معقول بندوبست کے جانا کسی طرح بھی عقل مندی کے زمرے میں نہیں آتا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ لوگ واپسی کا مصمم ارادہ باندھ چکے ہیں۔''

''ہم تو آپ کو بھی یہی کہیں گے کہ ہمارے ساتھ واپس چلیں۔''

''یہ تو ناممکن ہے کہ ہم جس کام کو نکلے ہیں اس کو مکمل کیے بغیر واپسی کا سوچیں بھی۔''

''تو پھر ہمیں اجازت دیجیے۔''

''مگر آپ لوگ کیسے واپس جائیں گے۔ خچر بھی موجود نہیں جن پر تین چار دنوں میں ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ بغیر سواری کے تو آپ کو واپسی کے لیے دس دن لگیں گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر عمران صاحب! واپسی کا ہر قدم ہمیں آبادی سے قریب ضرور کرے گا' جبکہ آگے بڑھنے والے ہر قدم کے ساتھ ہم زندگی سے دور اور موت کے قریب ہوتے چلے جائیں گے۔

''ٹھیک ہے دوستو......! یہاں سے ہمارے تمہارے راستے الگ ہو جاتے ہیں۔'' شہریار نے فیصلہ کن انداز میں ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھاتے ہوئے کہا۔

اور یوں انہوں نے ان کو بچے کھچے سامان میں سے کھانے پینے کا آدھا سامان دے دیا اور کچھ مزید چیزیں بھی۔ اور حساب بے باک کر دیا۔ تو وہ تینوں آہستگی سے واپس چل پڑے۔ لیکن جانے سے پہلے انہیں ساتھ چلنے کی آخری دفعہ دعوت دینا نہیں بھولے۔ لیکن ان دونوں نے سختی سے ان کا یہ مشورہ رد کر دیا اور مسکرا کر انہیں الوداع کر دیا۔

☆......☆......☆

اب وہ دونوں اس سرد وادی میں تنہا رہ گئے۔ دونوں کافی دیر کسی سوچ میں گم رہے اور پھر ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑے جیسے ٹینشن ریلیز کر رہے ہوں۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کی جانب بڑھنے لگا تھا۔ بادلوں کے غول دھوپ سے آنکھ مچولی کرنے لگے تو دونوں کو فکر ہوئی کہ رات کو کیا کریں گے۔ خیمے تو ہیں نہیں بس سلیپنگ بیگ تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی بکھرے ہوئے سامان سے انتہائی ضروری چیزیں سلیکٹ کیں اور اپنے اپنے شولڈر بیگ میں ڈال کر رات گزارنے کے لیے جائے پناہ کی تلاش میں آگے بڑھنے لگے۔ دونوں مضبوطی اور استقلال کے ساتھ قدم بڑھا رہے تھے۔

اندھی راہوں کے دونوں مسافر قدم سے قدم ملا کر ایک انجانی منزل کی طرف چلتے ہی جا رہے تھے۔ ان کے قدموں تلے ایک وسیع وادی تھی۔ ان کے سامنے پُر ہیبت برف پوش پہاڑ تھے۔ وہ راستوں سے نابلد تھے کچھ نہ جانتے تھے کہ آنے والے دن اور راستے کس قدر دشوار گزار ہوں گے۔ وہ تو منزل سے بیگانہ خوابوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وہ تو سرابوں کے تعاقب میں تھے۔

شام کے سائے طویل ہونے لگے تو ہوا میں خنکی کا تناسب خاصا بڑھ گیا۔ وادی ختم نہ ہوئی تھی۔ سامنے دور پہاڑ صبح سے نظر آ رہے تھے ایسا لگتا تھا کہ وہ جوں جوں قدم آگے بڑھاتے ہیں پہاڑ توں توں پیچھے بھاگتے ہیں۔ تھک ہار کر وہ رک گئے کیونکہ آفتاب بھی اب جائے پناہ ڈھونڈتا نظر آنے لگا تھا۔ وہ تیزی سے اِدھر اُدھر نگاہوں کی کمندیں پھینکنے لگے۔ آخر کار انہیں ایک جگہ بڑے بڑے چٹانی پتھر نظر آئے۔ وہ کچھ اس زاویے سے پڑے تھے کہ ان کے درمیان ان کے لیٹنے کی جگہ موجود تھی۔ انہوں نے وہیں شب بسری کا قصد کر لیا اور کندھوں سے وزنی بیگ اُتار پھینکے اور خشک راشن سے پیٹ پوجا شروع کر دی۔ پانی کی

بوتلوں سے منہ لگا کر پیاس بجھائی اور سگریٹ سلگا لیے۔ کچھ دیر بعد رات اُتر آئی۔ ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ آسمان قدرے صاف تھا۔ تاروں کے جھرمٹ میں چاند یوں اِترا کر چل رہا تھا جیسے راجہ اِندر اپسراؤں کے جلو میں چہل قدمی کرتا ہے۔ دونوں ان چٹانی پتھروں پر کھڑے ہو کر ارد گرد کا نظارہ کرنے لگے۔ تاحد نظر وادی میں چاندنی چٹک رہی تھی۔ ہر طرف دودھیا چادر تنی تھی۔ حد درجہ خاموشی میں ان دونوں کو ایک دوسرے کی آوازیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ رات گزرتی رہی نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ شہباز اور پورٹر کی جدائی کا دکھ انہیں ضرور تھا لیکن ان کے عزم میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ان کے پاس اتنا سامان تھا کہ وہ مہینہ بھر کھا پی سکتے تھے۔ وہ اطمینان سے بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔ شہریار نے اسٹوو نکال کر جلایا اور چائے بنانے لگا۔

اس دُور اُفتادہ برفانی علاقے کی اونچائی پر موجود اس نامعلوم وادی کے سینے پر چٹانوں کے اوپر آدھی رات کو چاندنی کے جلو اور تاروں کی لَو میں چائے اور سگریٹ کا کچھ ایسا لطف آیا کہ وہ مست ہونے لگے۔ ہوا کی سرسراہٹ سے محسوس ہو رہا تھا جیسے ہزاروں روحیں مل کر بین کر رہی ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ نیند سے ان کے پپوٹے بھرنے لگے اور وہ بے سدھ ہو گئے۔ آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ سورج البتہ ابھی نہ نکلا تھا۔ ہر طرف ملکوتی حسن کی بارش تھی۔ دونوں اس پاکیزہ صبح کا نشہ سمیٹنے لگے۔ دور بہت دور زرد رو چاند کوچ کی تیاریوں میں تھا۔ وہ اللہ کا نام لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نماز پڑھی، پیٹ پوجا کی اور چل پڑے۔ وادی شیطان کی آنت کی طرح طویل تھی لیکن وہ چلتے رہے...... چلتے ہی رہے......

دوپہر کے بعد وہ وادی کے آخری سرے پر جا پہنچے۔ اب ان کے سامنے دیوقامت پہاڑ کھڑے فلک سے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ پہاڑوں کے بیچ سے ایک تنگ گزرگاہ تھی۔ جس کے دونوں اطراف چوٹیاں تھیں۔ دونوں نے شام سے پہلے ہی وہ درہ عبور کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دونوں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ پہاڑوں کی پُرشکوہ اور ہیبت ناک بلندی ان کے دل دہلا رہی تھی۔ ایسا سفر ایسی پُرخطر راہ ایسی صورت حال کا سامنا کرنے کا ان کا کوئی تجربہ نہ تھا اور پھر انہیں یہ بھی تو پتہ نہ تھا کہ یہ درہ کتنا طویل ہے راستہ کیسا ہے اور یہ کہ اس کے بعد کیا ہے؟ وہ ایک گھنٹہ چلتے

رہے، راستہ مزید تنگ ہو رہا تھا۔ جب کئی گھنٹے گزر گئے اور پیچ در پیچ تنگ درہ ختم نہ ہوا تو لاشعوری طور پر دونوں پر گھبراہٹ طاری ہونا شروع ہو گئی۔ وہ مزید تیز چلنے کی کوشش کرنے لگے لیکن چونکہ راستہ برف زار اور پُرخطر تھا اور سامان بھی زیادہ تھا لہٰذا تیز چلنے میں دشواری کا سامنا تھا۔ گھڑی دیکھی تو شام کے پانچ بجنے والے تھے۔

''اگر مزید تھوڑی دیر میں یہ درہ ختم نہ ہوا تو ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں ماریں گے۔'' شہریار نے عمران کو کہا......

''اُمید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے میرے خیال کے مطابق پہلے کی نسبت اب راستہ کشادہ بھی ہو چکا ہے اور ہوا بھی زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ اس سے یہی مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ درہ ختم ہونے والا ہے۔'' اور عمران کا قیاس درست ثابت ہوا۔ تقریباً تیس منٹ کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو پہاڑوں کی کھوہ سے باہر کھلی فضا میں پایا۔ لیکن یہاں ہموار وادی نہ تھی۔ بلکہ سطح مرتفع جیسی حالت میں سفید زمین نظر آ رہی تھی۔ شام کا ملگجا چاروں طرف پھیلنے لگا تھا تاہم سامنے اُونچی چوٹیوں کے سِرے سنہری دُھوپ سے چمک رہے تھے۔ وہ چلتے رہے...... یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں انسانی قدم کبھی پہنچے ہی نہ ہوں۔ انہیں کہیں پگڈنڈی یا راستہ بنا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف بے ترتیب خودرَو جھاڑیاں تھیں۔ جو برف سے ڈھکی نظر آ رہی تھیں۔

''ہمیں جلدی سے شب بسری کے لیے مناسب جگہ تلاش کرنا ہو گی ورنہ کسی خطرے سے دوچار ہو سکتے ہیں۔'' شہریار نے عمران کو توجہ دلائی۔ دونوں دائیں بائیں نظریں دوڑانے لگے تاکہ مناسب جگہ تلاش کی جا سکے۔ اسی اثنا میں ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ دونوں نے آسمان کی طرف نگاہ کی تو بادلوں کے آوارہ غول منڈلاتے دکھائی دیئے۔ بادل گہرے نہ تھے مگر پہاڑی موسم اور معشوق کے وعدے کا کیا اعتبار؟

یہ نہ ہو کہ رات کی گہری تاریکی میں بارش شب خون مار دے لہٰذا شام کے اس ملگجے میں ہی مناسب جگہ تلاش کرنا ضروری تھا اور مناسب جگہ مل نہیں رہی تھی۔ غروب آفتاب کے بعد سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ کافی دیر جگہ کی تلاش میں سرگرداں رہے مگر...... وائے ری قسمت...... اس مقصد میں انہیں ناکامی ہوئی...... عجیب سی

جگہ تھی......نسبتاً یہ پہاڑ کی ڈھلوان تھی۔ اکثر جگہوں پر برف چمک رہی تھی یا پھر ہر طرف کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ کہیں کوئی غار یا کھوہ نظر نہیں آ رہی تھی جو ان کے لیے موسم اور جنگلی جانوروں سے بچاؤ کا ذریعہ بن سکتی جبکہ ہر طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ آخر کار انہیں ایک ایسی جگہ نظر آئی کہ پہاڑ سے ایک چھوٹی چٹان نوکیلے انداز میں باہر نکلی ہوئی تھی۔ جس سے شیڈ سا بن گیا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لہٰذا طوعاً و کرہاً دونوں کو اسی جگہ پر اکتفا کرنا پڑا......اور اپنے اپنے شولڈر بیگ جو خاصے وزنی تھے اتار کر رکھ دیئے اور ہاتھ پاؤں مار کر جگہ صاف کر کے وہیں بیٹھ گئے۔ آج وہ بہت زیادہ تھکن محسوس کر رہے تھے۔

''میں تو سگریٹ سلگانے لگا ہوں۔'' شہریار نے اپنے بیگ پہ کمر ٹیکتے ہوئے کہا۔

اور پھر دونوں ہی سگریٹ کے مرغولے اُڑانے لگے۔ سارا دن پیدل چلنے سے وہ بُری طرح تھک چکے تھے۔ انہوں نے جلدی سے سلیپنگ بیگ نکالے اور ان میں گھس گئے اور باتیں کرتے کرتے جانے کب نیند کی آغوش میں اُتر گئے۔ تیز بارش کے چھینٹے پڑنے پر شہریار کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ پانی اس طرح برس رہا تھا جیسے آسمان کے سوتے کھل گئے ہوں۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ جس جگہ تھے وہ قدرے بہتر تھی۔ چٹان کے شیڈ کی وجہ سے فی الحال وہ محفوظ تھے لیکن بارش خاصی تیز تھی۔ یوں تو اندھیرے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ بجلی چمکتی تو یکبارگی سارا علاقہ روشن ہو جاتا۔ اپنا بیگ کھول کر اس نے سیلوں والی ٹارچ نکالی اور اِدھر اُدھر اس کی روشنی پھینکنے لگا۔ پانی پہاڑوں سے نالوں کی صورت میں قطاریں بنائے گرتا ہوا نیچے جا کر غائب ہو رہا تھا۔ وہ جس جگہ بیٹھے تھے وہ تقریباً دس مربع فٹ جگہ تھی جو زیادہ تیز بارش ہونے کی صورت میں ان کے لیے غیر محفوظ تھی۔ اس نے عمران کو جگانا مناسب نہ جانا لیکن خود جاگتا رہا۔ بارش ہر لحظہ تیز ہو رہی تھی اور ہوا کی رفتار بھی بڑھ رہی تھی۔ شہریار بار بار ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر پھینک رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے سگریٹ بھی سلگا لیا۔ اس نے سوچا پریشانی کے بجائے اس ماحول سے لُطف اندوز ہونا چاہیے۔ لیکن سردی کی شدت میں اضافے سے پریشانی بڑھ رہی تھی۔ اور پھر وہ جس چٹان کی آڑ میں بیٹھے تھے اس نے روشنی اپنے پیچھے چٹان کی نچلی سطح پر پھینکی تو وہ چونکا۔ اپنا شک دور کرنے کے لیے ایک بار اس نے روشنی اس

جگہ کا جائزہ لیا یقیناً اس جگہ ایک شگاف سا تھا۔ اب اس نے گہری نظر سے اس جگہ کا جائزہ لیا تو اسے وہاں کسی غار کا دہانہ محسوس ہوا۔ اس نے قریب جا کر دیکھا تو تقریباً چار مربع فٹ کا دہانہ تھا جو روشنی کے بغیر دکھائی نہ دیتا تھا۔ شہریار سنجیدگی سے صورت حال کا جائزہ لینے لگا تو اس پر انکشاف ہوا کہ غار اندر سے کشادہ ہے اور وہ لوگ اس میں پناہ لے سکتے ہیں۔ اس نے دوبارہ روشنی کی آڑ میں غار کا جائزہ لیا تو اسے اندر بے شمار جالے نظر آئے یعنی یہ غار کسی بیوہ کی مانگ کی طرح ویران تھی۔ اس نے شام سے اکٹھی کی گئی خشک جھاڑیاں غار کے اندر پھینک دیں اور مٹی کے تیل کی بوتل نکال کر اس پر تھوڑا سا تیل چھڑکا اور ماچس سے تیلی جلا کر اندر پھینک دی تو ہلکی سی پھک سے تیل نے آگ پکڑ لی۔ تھوڑی دیر بعد خشک جھاڑیاں جلنے لگیں اور غار میں دُھواں پھیلنے لگا۔ جس سے بے شمار حشرات الارض غار سے نکل کر بھاگتے دکھائی دیئے۔ آگ تھوڑی دیر جلنے کے بعد مدھم پڑگئی۔ بارش کا زور بھی ٹوٹ چکا تھا لیکن سردی قیامت خیز ہو چکی تھی۔ شہریار نے ایک نظر خواب خرگوش کے مزے لیتے عمران کو دیکھا اور پھر اللہ کا نام لے کر غار کے اندر چلا گیا۔ اس کی چھت کم از کم چھ فٹ اور گہرائی دس فٹ کے لگ بھگ تھی وہ اپنی سٹک کی مدد سے بیٹھے بیٹھے جالے صاف کرنے لگا۔ اسی اثنا میں اس نے محسوس کیا کہ آگ کے شعلے تو ختم ہو چکے تھے مگر انگارے دہکنے لگے ہیں۔ اب جو اس نے غور کیا تو اندر خشک گوبر کا ڈھیر موجود تھا جس نے آگ پکڑ لی تھی۔ ضرور کسی جانور کی متروک قیام گاہ ہے۔ اس بات سے جہاں شہریار خوش ہوا وہاں اس کو یہ فکر بھی دامن گیر ہوئی کہ کہیں وہ جانور دوبارہ نہ آ جائے۔ جنگل بیاباں اور برفانی علاقہ۔ پتہ نہیں برفانی ریچھ ہو یا برفانی چیتا...... پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے خوف کو جھٹک دیا۔ البتہ احتیاطاً برف کاٹنے والا کلہاڑا نکال کر سامنے رکھ لیا جبکہ سٹک پہلے سے اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔ وہ غار سے باہر نکل آیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ عمران ابھی تک مست ہو کر سو رہا ہے۔ بارش تھم چکی تھی اور پانی بھی جانے کن تہوں میں روپوش ہو گیا تھا۔ البتہ درجہ حرارت نقطہ انجماد سے نیچے جا چکا تھا۔ شہریار کی بتیسی بجنے لگی۔ اس نے عمران کو جگایا تو وہ اُٹھ بیٹھا۔ جیسے ہی صورت حال اس کی سمجھ میں آئی خوش ہو گیا اور پھر دونوں غار کے اندر منتقل ہو گئے۔ لیکن سامان انہوں نے غار کے دہانے پر اس طرح رکھ دیا کہ اگر یہ کسی درندے کی کھوہ ہو اور وہ اچانک آ جائے تو سامنے

رکھے سامان کی وجہ سے فوری طور پر حملہ آور نہ ہونے پائے۔ پھر دونوں اطمینان سے یوں گھوڑے بیچ کر سوئے کہ جب اُٹھے تو دن اچھا خاصا نکلا ہوا تھا۔ گھڑی دیکھی تو صبح کے نو بج رہے تھے۔ سامان ہٹا کر غار سے باہر نکلے تو چمکیلی دھوپ ان کی راہ میں آنکھیں بچھا رہی تھی۔ ہر چیز بارش کی وجہ سے دھل کر نکھری، نتھری اور صاف و شفاف معلوم ہو رہی تھی۔ تیز بارش کی وجہ سے پودوں، جھاڑیوں پر جمی برف کی کمزور تہیں بھی جھڑ چکی تھیں تاہم پہاڑ تا حال سفید چادریں اوڑھے ہوئے تھے۔

دونوں دھوپ میں کھڑے ہو کر انگڑائیاں لینے لگے۔ موسم کی خوشگواریت اور دھوپ کے شفاف ہونے سے دونوں پر طاری کسلمندی دور ہو گئی اور ان کی خوش مزاجی عود کر آئی۔

''سبحان اللہ...... واہ واہ...... کتنا خوب صورت منظر ہے۔'' عمران کی زبان سے نکلا۔

''اور اس خوبصورت منظر کو چھوڑ کر آج ہم آگے نہیں جا سکیں گے بلکہ یہیں رہ کر اپنی توانائیاں بحال کریں گے۔'' شہریار نے کہا۔

''بالکل ٹھیک۔'' عمران نے تائید کی اور پھر اگلے دن ایک نئے جذبے، نئے ولولے اور نئی پلاننگ کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کریں گے۔ دونوں نے سفری بیگ کھول دیئے۔ سارا سامان پھیلا دیا اور نئی ترتیب سے بیگ بھرنے لگے۔ فالتو سامان سے چھٹکارا پایا۔ خشک خوراک سے پیٹ پوجا کی اور پھر بیٹھ کر ایک دوسرے کے پیچھے سے سر نکال کر جھانکنے والی چوٹیوں کو دیکھ دیکھ کر باتیں کرنے لگے۔ وہ اندازہ لگا رہے تھے کہ ان کے قدموں سے شروع ہونے والی اونچی نیچی گھاٹیوں والا یہ مشکل راستہ کتنا طویل ہو سکتا ہے۔ کافی دیر تک وہ گپ شپ لگاتے اور اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ اپنے سوا انہیں یہاں کوئی انسان نظر نہ آیا۔ انہی خوش فعلیوں میں سورج اپنی کرنیں سمیٹنے لگا۔ رات ہوئی تو انہوں نے غار کے عین سامنے آگ کا الاؤ روشن کر دیا۔ جس کی وجہ سے غار میں بھی سردی کی شدت کم ہو گئی۔ انہوں نے رات اطمینان سے بسر کی اور پھر صبح سویرے اُٹھ بیٹھے اور رختِ سفر باندھنے لگے۔ سورج نکلتے ہی وہ اللہ کا نام لے کر چل پڑے۔ اور پھر سورج ڈھلنے تک انہوں نے سفر جاری رکھا۔ اب وہ برف کا لبادہ اوڑھے پہاڑوں کے قریب آ چکے تھے۔ چونکہ شام سر پر تھی لہٰذا انہوں نے پہاڑوں میں داخل ہونے سے پہلے ہی پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا اور

رات گزارنے کے لیے مناسب جگہ تلاش کرنے لگے۔ جلد ہی انہیں گوہر مقصود مل گیا۔ یہ اُجڑی بہار کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا جس کو چند اونچے ٹیلوں نے گھیر رکھا تھا۔ اس وجہ سے یہاں تیز ہواؤں کا اثر کم تھا۔ اگلی صبح وہ برفانی علاقے میں داخل ہو چکے تھے جہاں چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ ان کے ہر تین اطراف برف کی دبیز تہوں کے اس پار بلند ہوتے پہاڑوں کی دیواریں تھیں گو یہ پہاڑ عمودی نہیں تھے تاہم ان کا پھیلاؤ اتنا خوفناک تک حد تھا کہ ان کو دیکھ کر دونوں کے دلوں پر ہیبت ڈیرے ڈالنے لگی۔ دونوں نے چہروں پر مخصوص چشمے پہن لیے تھے۔

''عمران......!'' شہریار برف پر نظر جمائے، کھوئے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

''کہیں ہم ان برف زاروں میں داخل ہو کر غلطی نہ کر رہے ہوں۔ دو انسانی جانوں کی ان تاحد نظر میلوں میں پھیلے ہوئے قدرتی فریزر کے سامنے حیثیت ہی کیا ہے؟''

''ہوں......'' عمران بھی مبہوت تھا۔

''اوں...... ہاں......'' عمران اس کی بات سن کر چونک اُٹھا۔

''نہیں شہریار......'' عمران مضبوط لہجے میں کہنے لگا۔ ''ہمیں ایک ہی جیسے اور بار بار آنے والے خواب دھوکہ نہیں دے سکتے۔ ہماری منزل انہی پہاڑوں کے پیچھے چھپی ہے۔ یا تو منزل پا لیں گے یا پھر...... اس سفید دوزخ میں برفانی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائیں گے اور پھر وہ بڑے عزم اور حوصلے سے ان پہاڑوں پر قدم بڑھانے لگے۔ کوہ پیمائی کا سامان ان کے پاس موجود لیکن تجربہ مفقود تھا۔ صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے برف ابھی سخت تھی۔ چاروں طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں نے اس وقت کوہ پیمائی کے مخصوص جوتے پہن رکھے تھے۔ دُھوپ کے برف سے ٹکرا کر منعکس ہونے سے آنکھوں کو نقصان دینے والی چمک جنم لے رہی تھی۔ وہ مشکلوں سے چند گز ہی اوپر کی طرف گئے ہوں گے کہ نہیں احساس ہوا کہ یہ انتہائی سخت کام ہے لیکن وہ رُکے نہیں۔ برف پر انتہائی احتیاط سے اگلا دم دیکھ بھال کر رکھتے اس قدم کو وہیں جماتے اور پھر اسی طرح اگلے قدم کی تیاری کرتے ونکہ پہاڑ عمودی نہیں تھا بلکہ بیس درجے کے زاویے پر تھا اس لیے زیادہ مشکل نہ تھی۔ تاہم ہوں نے جو معلومات حاصل کر رکھی تھیں اس کے مطابق تو انہیں اگلے سفر میں آسمان کی

جانب منہ اُٹھائے پہاڑ مل سکتے تھے۔ چونکہ ان کے لباس کوہ پیمائی والے تھے لہٰذا کسی حد تک وہ سردی سے بچے ہوئے تھے۔ وہ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے گھسٹ گھسٹ کر اوپر کی جانب رواں دواں رہے۔ سورج جب نصف النہار پہ پہنچا تو انہوں نے محسوس کیا کہ ابھی انہوں نے ایک تہائی راستہ ہی طے کیا ہے۔ سورج پشت پر چمکنے اور مسلسل چڑھائی چڑھنے کی وجہ سے لباس کے نیچے ان کے اجسام پسینے سے گیلے ہورہے تھے۔

یہ تو انتہائی سخت اور تھکا دینے والا مشکل کام تھا۔ ٹریکنگ شوز کی وجہ سے انہیں زیادہ دشواری نہ ہورہی تھی۔ ایک بار جوشہریار نے مڑ کر دیکھا تو اسے پتہ چلا کہ وہ تو پہاڑ کے بیس کیمپ سے خاصی اونچائی پر آچکے ہیں۔ اگر کسی غلطی سے پیر پھسل گیا تو وہ سیدھے نیچے جائیں گے اگر مر نہ گئے تو بھی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے ساتھ ہی نیچے پہنچیں گے۔ یہ خیال اُبھرتے ہی وہ مزید محتاط ہو گئے اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے لگے۔ دوپہر کی تیز دھوپ کی وجہ سے اب برف کی سطح نرم ہونے لگی تھی۔ بعض اوقات تو ان کا پاؤں برف میں دھنس جاتا۔

اس وقت گھڑی پر شام کے پانچ بج رہے تھے جب وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے۔ چوٹی تقریباً بیس فٹ چوڑی تھی جبکہ لمبائی کچھ زیادہ تھی۔ وہاں پہنچنے کے بعد دونوں نڈھال ہو کر گر پڑے۔ کافی دیر لیٹے رہنے کے بعد تنفس بحال ہوئے تو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت سورج دُور اُفق میں ڈھل رہا تھا۔ اتنی بلندی سے غروب آفتاب کا منظر وہ زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے۔ ہر طرف زرد دھوپ کرنوں کی صورت بکھری ہوئی تھی۔ سیاہ چشموں کی اوٹ سے ان کو یہ منظر مٹیالا سا نظر آرہا تھا۔

چند لمحے ستانے کے بعد دونوں نے فیصلہ کیا کہ اترائی صبح اُتری جائے۔ آج کی رات اس چوٹی پر ہی بسر کی جائے۔ یہ فیصلہ کرتے ہی دونوں مناسب جگہ دیکھنے لگے۔ آخر کار چوٹی کے بیچوں بیچ برفانی کلہاڑی (ice axe) کی مدد سے برف کھودنے لگے۔ نصف گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد وہ چھ سات فٹ گہرا گڑھا بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور پھر اس میں اُتر گئے۔ یوں وہ تیز ہواؤں سے کسی حد تک محفوظ ہو چکے تھے۔

اگلے دن صبح صادق کے وقت ان کا سفر پھر شروع ہو گیا۔ اب وہ پہاڑ کی اُترائی اُتر رہے تھے۔ جس کے بعد سامنے ایک وسیع و عریض اونچے نیچے برفانی ٹیلوں کا سلسلہ تھا۔

اب انہیں احساس ہو رہا تھا کہ چڑھائی کی نسبت پہاڑی اُترائی کس قدر مشکل ہے۔ ذرا پاؤں کی لغزش ہوئی اور سامنے موت منہ کھولے ان کی منتظر تھی۔ سہ پہر تک وہ پہاڑی سے اُتر آئے لیکن اب انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کون سا راستہ اختیار کیا جائے کیوں کہ بے ترتیب برفانی تودے جابجا بکھرے ہوئے تھے۔ اب ان پر تھکاوٹ طاری ہو رہی تھی۔ راستہ بھی اُلجھ چکا تھا۔ تاہم انہوں نے اپنے آپ کو قدرت کے رحم وکرم پر چھوڑ کر ناک کی سیدھ میں جانے کا فیصلہ کیا اور سفر جاری رکھا۔ رات پڑتی تو کوئی مناسب جگہ تلاش کر لیتے صبح ہوتی تو چل دیتے۔ آہستہ آہستہ دن گزرتے رہے۔ ان کے پاس خوراک اور پانی کا ذخیرہ ختم ہونے لگا۔ سفری سامان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگا۔ مسلسل برفانی سفر سے ان کی جسمانی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ چہار سو ویرانیوں اور خاموشیوں کے باعث اب وہ چڑچڑے بھی ہو گئے تھے۔ گھنٹوں خاموش رہتے اور ایک دوسرے سے بھی بات نہ کرتے بس خاموشی سے کسی روبوٹ کی مانند چلتے رہتے۔ ایک جیسا موسم، ایک جیسے علاقے، ایک ہی مصروفیت ان کے عصاب شل ہونے لگے۔ ان کے قویٰ ڈھیلے پڑ گئے۔ سستی اور تھکاوٹ اپنا رنگ دکھانے لگی۔ اب تو اگر وہ واپس بھی جانا چاہتے تو نہ جا سکتے تھے۔ قطب نما کب کا خراب ہو چکا تھا۔ ہیں سفر کرتے جانے کتنا عرصہ بیت گیا۔ اب وہ حلیے سے برفانی مخلوق ہی لگتے تھے۔ لیکن ہیں اس حلیے میں یہاں دیکھنے والی آنکھیں کہاں تھیں۔ وہ تو بس دو بھوت تھے جو برف ے اس صحرا میں بھٹک رہے تھے۔ مایوسی کی تہہ ان پر رنگ جمانے لگی۔ پہاڑی ٹیلے ختم نے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ اپنے حساب سے وہ اب تک سینکڑوں میل سفر کر چکے ے۔ پتہ نہیں وہ اپنے ہی ملک میں تھے یا بھٹک کر کسی دوسری سرزمین پر جا نکلے تھے۔ اس ت کا انہیں کچھ قیاس نہ تھا۔ تاہم رفتہ رفتہ انہیں احساس ہوا کہ اب پہاڑی برفانی ٹیلے خال ی رہ گئے ہیں بلکہ برف بھی کم کم نظر آ رہی تھی۔ علاقہ وادی کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ تاہم بھی ڈھلوان ناہموار اور کہیں کہیں ٹیلے موجود تھے۔ انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا کہ اس ہوا اب ان کے پاس کوئی بھی دوسرا راستہ نہ تھا۔

☆......☆......☆

اب وہ ایک ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جس کے بارے میں انہیں بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ کیا ہے۔ حیرت انگیز طور پر پیالے کی مانند تھی جو درمیان سے بالکل ہموار تھی۔ وادی میں برف بھی کم تھی۔ جگہ جگہ سبزہ بھی بہار جانفزا دکھلا رہا تھا۔ یہ بہت خوبصورت صبح تھی۔ ہر طرف دھند لکے کی چادر تنی تھی۔ جو سورج کے چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ کم ہونے لگی اور پھر صبح نو بجے تک دھند سمٹ چکی تھی۔ اب سنہری دھوپ سے پوری وادی چمک رہی تھی۔ دور دور تک چھائی خاموشی کا طلسم اکا دکا پرندوں کی آواز سے ٹوٹ جاتا۔ اس مہکتی وادی کا سحر انہیں خمار دینے لگا۔ وادی کے ایک سرے پر ندی بہہ رہی تھی جو برفیلے پانی سے وجود میں آئی تھی۔ وہ دونوں اس کے پاس جا پہنچے۔ ندی کا پانی میٹھا تھا۔ دونوں نے سیر ہو کر پیا۔ دوپہر کو دھوپ تیز ہوئی۔ غسل وغیرہ کیا۔ کئی دن کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ شیونگ کٹ نکال کر ایک دوسرے کی مدد سے شیو کی۔ کپڑے تبدیل کیے اور میلے کپڑے ندی کے پانی سے دھو کر دھوپ میں ڈال دیئے۔

آج کا دن انہوں نے پکنک کے انداز میں گزارا۔ شام ڈھلی تو تیز ہوا چلنے لگی۔ انہیں دور پہاڑوں کے پیچھے سے سفید بادلوں کا غول اُمڈتا نظر آیا تو دونوں کے ماتھے پر تفکرات کی لکیریں اُبھرنے لگیں۔

وہ جلدی سے اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ جگہ تو انہوں نے گزشتہ رات ہی تلاش کر لی تھی۔ دو پہاڑوں کے سنگم میں ایک کھوہ سی بنی ہوئی تھی جہاں وہ آسانی سے رات کو سوئے تھے۔

سامان کھوہ میں پہنچانے کے بعد وہ موسم کا نظارہ کرنے لگے۔ شام تیزی سے اُترنے لگی۔ اندھیرا پاؤں پسارنے لگا۔ روشنی تاریکی میں بدلنے لگی۔ ادھر لحہ بہ لحہ بادلوں کے غول بڑھنے لگے۔ گڑگڑاہٹ شروع ہوگئی اور پھر برف باری ہونے لگی۔ آسمان روئی کے گالے پھینکنے لگا۔ رات گہری ہونے کے ساتھ ساتھ برف باری تیز ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے

چہار سو برف کی چادر تن گئی۔ وہ دونوں کھوہ میں دبکے رہے لیکن برف باری رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جوں جوں رات آگے بڑھتی گئی، برف باری میں شدت آتی گئی۔ حتیٰ کہ کھوہ کے دہانے کے سامنے بھی برف کا ڈھیر بنتا چلا گیا۔ ایک دفعہ انہوں نے کھوہ سے باہر جھانکنے کی کوشش کی لیکن باہر برفانی جھکڑ چل رہے تھے۔ مجبوراً انہیں پسپا ہو کر اندر آنا پڑا۔ اسی طرح لمحہ بہ لمحہ رات سرکتی رہی۔ جانے کب وہ سو گئے اور پھر جب عمران کی آنکھ کھلی تو گھپ اندھیرا تھا۔ دستی گھڑی دس بجا رہی تھی۔ جس وقت وہ سوئے تھے اس وقت بارہ سے زیادہ کا وقت تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یقیناً یہ صبح کے دس تھے۔ پھر...... یہ گھپ اندھیرا کیوں ہے......؟

یہ سوچتے ہی عمران نے کھوہ سے باہر منہ نکالنے کی کوشش کی تو وہ دھک سے رہ گیا۔ کھوہ کا دہانہ برف باری کی وجہ سے بند ہو چکا تھا۔ اس نے شہر یار کو جگایا اور اس تشویش سے آگاہ کیا۔ اب تو دونوں کو فکر دامن گیر ہوگئی۔ انہوں نے اٹکل پچو طریقے سے برف کو دھکیلنے اور کھرچنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ لگتا تھا کہ غار کا منہ مضبوطی سے بند ہو چکا ہے۔

''اب کیا ہوگا؟'' شہر یار گھبراہٹ سے بولا۔

''ٹھہرو شہر یار!'' عمران نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''مصیبت میں گھبرا جانے سے مصیبت اور بڑھ جاتی ہے۔ پاگلوں کی طرح برف کی دیوار کو دھکا لگانے سے ہم اپنی توانائیاں ضائع کر بیٹھیں گے۔''

''پھر کیا کیا جائے؟'' شہر یار کی گھبراہٹ ختم نہ ہوئی تھی۔

''بیٹھ جاؤ سب سے پہلے اپنے حواس بحال کرو۔ پھر کچھ سوچتے ہیں۔''

دونوں سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے۔ چند فٹ کی غار میں وہ قید ہو چکے تھے۔

اب کیا کریں...... کیا ہوگا......؟ کتنی دیر وہ اس اندھیری قبر میں زندہ رہ سکیں گے......؟ گو ان کے پاس خوراک تھی مگر آکسیجن کا سلنڈر تو نہ تھا۔ یہ سوچتے ہی شہر یار مزید خوفزدہ ہو گیا۔ آکسیجن...... ہاں اگر غار کا ہر سوراخ بند ہو گیا ہے تو آکسیجن جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ وہ سوچ رہا تھا اور پھر گہرے گہرے سانس لینے لگا جیسے آکسیجن کی کمی کا اندازہ لگا رہا ہو۔ اس کے چہرے پر اچنبھے کی کیفیت نمودار ہوئی۔ سانس لینے میں تو کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی وہ تو سوئے ہوئے تھے اور غار نہ جانے رات کے کس پہر سے بند ہو چکا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہوا مسلسل اندر آ رہی ہے...... اس خیال کے ساتھ ہی شہریار پُر جوش ہو گیا اور پھر انہی سوچوں کا دروازہ عمران کے لیے وا کر دیا۔

''ویری گڈ...... بہت ہی اچھے...... تمہاری یہ بات تو منوں وزن رکھتی ہے اگر غار کے دہانے میں کوئی روزن رہ گیا ہے جس سے ہوا اندر آ رہی ہے تو اس کا یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ برف کی کوئی بہت زیادہ موٹی تہہ اوپر نہیں ہے اور اگر ہم دونوں مل کر پوری قوت سے زور لگائیں تو برف کو دھکیل بھی سکتے ہیں۔''

''گڈ آئیڈیا......'' اور پھر دونوں نے اپنے دونوں ہاتھ غار کے دہانے پر جمی برف پر رکھے اور غار کے فرش پر قدم مضبوطی سے جما کر زور لگانے لگے۔ چند منٹ گزر گئے۔ دونوں مسلسل زور لگاتے رہے...... ''اور زور لگاؤ......'' عمران بولا...... اور دونوں پھر قوت صرف کرنے لگے۔ اور پھر برف کا تودہ تو دہانے سے نہ ہلا...... البتہ ان کو پیروں تلے گڑگڑاہٹ سنائی دی اور پھر قبل اس کے کہ وہ سنبھلتے ان کے پیروں کے نیچے سے فرش شق ہو گیا...... اور انہیں پتلی لکڑیوں کی کڑکڑاہٹ سے ٹوٹنے کی آواز آئی اور پھر ان کے نیچے زمین نہ رہی سرکتے، پھسلتے جیسے وہ پاتال میں دھڑام سے نیچے گر گئے...... دس بارہ فٹ کی گہرائی میں گرنے سے ان کے ٹخنوں، گھٹنوں اور کولہے کی ہڈیاں چرچرانے لگیں۔ درد کی ٹیسوں کے باعث چند لمحوں تک انہیں ہوش ہی نہ رہا۔ اور وہ بے سدھ پڑے رہے۔ دھیرے دھیرے اوسان بحال ہوئے تو وہ اپنے آپ کو ٹٹولنے لگے۔ خود کو صحیح پا کر تسلی ہوئی تو اُٹھ بیٹھے کچھ دیر ہونقوں کی طرح اندھیرے میں ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے...... ہاتھ کی مدد سے دائیں بائیں ٹٹولا تو پتہ چلا کہ تین اطراف سے تو یہ جگہ بند ہے مگر ایک طرف پتلی گلی جا رہی ہے۔ وہ اُسی طرف آہستہ آہستہ چل پڑے تاریکی اتنی زیادہ تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ جگہ اتنی تنگ تھی کہ انہیں آگے پیچھے چلنا پڑ رہا تھا۔ خاصی دیر چلتے رہے لیکن ڈھاک کے وہی تین پات۔ سرنگ تھی یا شیطان کی آنت وہ چلتے رہے...... بڑھتے رہے...... شاید کئی گھنٹے گزر گئے...... اب ان کی آنکھیں اندھیرے میں بھی کام کرنے لگی تھیں۔ ایک دوسرے کا ہیولہ انہیں دکھائی دے رہا تھا۔ پھر انہیں یوں محسوس ہوا جیسے سرنگ قدرے کشادہ ہو گئی ہو۔ یہ بات ان کے لیے طمانیت کا باعث تھی۔ یہ

اس بات کا اشارہ بھی ہوسکتا تھا کہ سرنگ کا دوسرا دہانہ اب قریب آ رہا ہے۔ اور ایسے ہی ہوا۔ سرنگ آہستہ آہستہ کھلتی چلی گئی اور پھر انہیں ہلکی ہلکی چمک کا احساس اُبھرا جو بتدریج روشنی میں ڈھلتا چلا گیا۔ انہیں چلتے چلتے کافی گھنٹے گزر چکے تھے۔ پھر سرنگ میں باقاعدہ روشنی پھیل گئی لیکن یہ روشنی دور ایک کونے سے نکل رہی تھی۔

''یقیناً وہاں جا کر سرنگ خم لیتی ہے۔'' یہ جملہ کافی دیر کی خاموشی کے بعد شہریار نے بولا تھا۔

''شش......'' عمران نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''خیریت......'' شہریار نے سرگوشی کے انداز میں استفسار کیا۔

''میرا خیال ہے ہمیں حد درجہ احتیاط سے کام لینا چاہیے......'' عمران کا لہجہ سرسراتا ہوا تھا۔

''کیوں؟'' شہریار نے پھر سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ جہاں ہم گرے تھے وہ یقیناً اس سرنگ کا نکتہ اختتام تھا۔ جس کسی نے بھی یہ سرنگ نکالی ہے وہ بھی یہی راستہ استعمال کرتا ہوگا۔

اور اب ہم سرنگ کے نکتہء آغاز یعنی ''سٹارٹنگ پوائنٹ'' پر پہنچنے والے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ باہر کچھ لوگ ہوں...... یہ نہ ہو کہ ہم چوہے دان میں چوہے کی مانند پھنس جائیں۔ کون جانتا ہے کہ باہر ہمارے لیے کون سے مصائب یا اذیتیں ہماری منتظر ہیں یا کون سا مژدہ ہماری سماعتوں میں رس گھولنے کے انتظار میں ہے۔''

عمران کی شعور بھری باتیں سن کر شہریار سمجھنے کے انداز میں سر ہلا کر رہ گیا اور وہ بھی محتاط انداز میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگا۔ اب سرنگ کشادہ اور ہوادار ہو چکی تھی۔ چند ہی قدموں کے فاصلے پر سرنگ خم لے رہی تھی۔ وہ دونوں سرنگ کی دیوار سے چپک کر انچ انچ آگے بڑھنے لگے۔ پہلے عمران نے ایک آنکھ سے دوسری طرف کا منظر دیکھا تو اس دہانے سے روشنی چھن چھن کر آتی نظر آئی لیکن کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ اس نے شہریار کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور پھر دونوں گربہ پا آگے بڑھنے لگے۔ دہانہ بالکل تنگ سا اور چند فٹ اُونچائی پر کھڑکی کے سے انداز میں تھا۔ فرش سے تقریباً چھ فٹ اوپر۔

عمران نے دونوں ہاتھ منڈیر پر جمائے اور جسم کا سارا وزن شانوں پر ڈالا اور کہنیوں کے زور پر اوپر اُٹھا۔شہریار سہارا دینے کے لیے نیچے موجود تھا۔عمران کو باہر دھوپ تو دکھائی دی لیکن کوئی منظر نظر نہ آیا...... کیوں کہ دہانے پر ایک چٹان کچھ اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ باہر کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا۔عمران نے چند لمحے سوچا اور پھر پلٹ کر شہریار کو خاموشی سے اوپر آنے کا عندیہ دیا اور ہاتھ بڑھا کر اسے بھی اوپر کھینچ لیا۔اور دونوں دوسری طرف کود گئے، نیچے گھاس تھی لیکن چٹان دہانے سے کافی سے زیادہ جھکی ہوئی تھی اور زمین سے بمشکل تین چار فٹ ہی اوپر تھی۔ لہٰذا وہ اکڑوں بیٹھ کر چٹان کے نیچے سے سرک کر باہر نکل آئے۔ باہر کا منظر دیکھتے ہی ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ہر طرف سنہری تیز دھوپ پھیلی تھی۔ مسلسل اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے اچانک تیز روشنی میں آ جانے سے چند لمحے چندھیائے رہے۔ دیکھنے کے قابل ہوئے تو پیالے کی مانند ایک سرسبز وادی ان کی نظروں کے سامنے مسکراتی دکھائی دی۔ جا بجا پھلوں سے لدے درخت...... چاروں طرف برف کی سفید چادریں اوڑھے بلند و بالا پہاڑ۔ایک پہاڑ سے گرتی ہوئی شفاف پانی کی آبشار......اور آبشار کے نیچے خوب صورت جھیل۔

خوش رنگ اور خوش گلو طیور...... جابجا چوکڑیاں بھرتے غزال...... پنکھ پھیلائے رقص کرتے مور...... وادی کیا تھی فردوس بریں تھی۔ ان کے منتشر اعصاب کو سکون ملنے لگا۔ اس تنگ و تاریک ناہموار سرنگ کے خوف زدہ سفر کو وہ بھولنے لگے۔ طبیعت سے ذہنی خلفشار اور انتشار کا زنگ اُترنے لگا۔

دور وادی کی گہرائیاں، دبیز دودھیا دھند میں لپٹی تھیں۔ آسمان صاف گہرا نیلا اور سورج پوری طرح چمکتا ہوا۔

''شہریار......! شہریار......'' عمران کسی سحر زدہ انداز میں بولا۔''یہ...... یہ ہم کہاں آ گئے ہیں۔ خوبصورت موسم سے معمور جنت جیسی وادی...... کک...... کہیں ہم خواب تو نہیں دیکھ رہے۔''

''یہ سب حقیقت ہے عمران اور حقیقت کا ثبوت ہیں ہمارے پیٹ میں بھوک سے قوالی کرتے چوہے یاد رکھو خواب میں کبھی بھوک نہیں لگتی۔''

''پھر ہم کہاں آ گئے......؟'' عمران ابھی تک مبہوت تھا۔

''بھائی صاحب؟ میں یہاں کا مقامی باشندہ نہیں...... آپ ہی کے ساتھ آیا ہوں...... اور مجھے کیا پتہ کہ ہم کہاں آ گئے ہیں......؟ سب سے پہلے تو ہمیں کھانے کا کوئی بندوبست کرنا ہوگا۔ چلو حیرانی کے غوطوں سے باہر آ جائیں۔'' شہریار چہک رہا تھا۔

دونوں ایک جگہ بیٹھ گئے۔ یہ ہر طرح سے پُرسکون و خاموش وادی تھی۔ سوائے پرندوں کے چہچہانے اور جھیل میں گرتے آبشار کے پانی کی جلترنگ کے اور کوئی آواز نہ تھی۔ وادی کم از کم پون کلومیٹر چوڑی تھی لیکن اس کی لمبائی کا اندازہ نہ تھا۔ دور سے دھند میں ڈھکی ہوئی نظر آتی تھی۔ دونوں غیر ارادی طور پر جھیل سے نکلتی ندی کی طرف چل دیئے۔ پہاڑ سے گرتی آبشار کا پانی موتیوں کی طرح دور دور تک بکھر رہا تھا۔ پانی یخ ٹھنڈا تھا چنانچہ اس سے نہانا مناسب نہ تھا۔ دونوں نے اچھی طرح منہ اور ہاتھ پاؤں دھوئے، سیر ہو کر پانی پیا اور پھر درختوں سے پھل توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ آج بڑے دنوں کے بعد انہیں سکون میسر آیا تھا۔

☆......☆......☆

پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

حویلی آشیانہ سے خوشیوں کا ہُما اُڑ چکا تھا۔ بیٹی کے بعد بیٹے کی گمشدگی سے جہاں آرا بیگم اور نواب سراج الدین ٹوٹ پھوٹ سے گئے تھے۔ جہاں آرا ہر وقت روتی رہتیں جبکہ نواب سراج دین کی تمام مصروفیات ختم ہو چکی تھیں۔ ہمہ وقت خلاؤں میں گھورتے رہتے۔ ان کی کل کائنات ہی شہر یار اور حسینہ تھے۔ دونوں ہی کھو چکے تھے۔

دادی اماں کی کمر کچھ اور جُھک گئی تھی۔ ہر وقت مصلّے پر بیٹھی تسبیح رولتی رہتیں اور روتی رہتیں......

مونا اپنے حلیئے سے کسی طور نئی شادی شدہ لڑکی نظر نہ آتی تھی......اس کا تو نہ کوئی ہم عمر تھا نہ ساتھی......اس کی شوخیاں اُڑنچھو ہو چکی تھیں۔ گم صم رہتی اور بولائی بولائی پھرتی۔ ہاں کبھی کبھی ماں کی آغوش میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی......تو پروفیسر ناہید خود بھی سسکنے لگتیں۔ اب تو کبھی کبھی اُن کے ذہن میں یہ خیال اُٹھنے لگتا کہ میں نے اس گھر میں بچوں کے رشتے کر کے غلطی کر دی ہے۔ اِنہی وجوہات پر وہ چڑچڑی سی بھی ہو رہی تھیں۔

پوری حویلی پہ ویرانیاں چھائی ہوئی تھیں۔ بیٹے بیٹی اور داماد کی گمشدگی سے نواب سراج الدین کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ اپنے تمام وسائل بروئے کار لا چکے تھے انہیں نہ ملنا تھا نہ ملے......اب وہ مایوسی کی حد کو چھو چکے تھے۔ اچھا خاصا مضبوط شخص ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا تھا۔ اب تو کوئی رشتہ دار یا آشنا ان سے بیٹی بیٹے کی بابت استفسار کرتا تو زبان سے جواب دینے کی بجائے آنسوؤں کی گرم موم ان کے گالوں کو بھگونے لگتی۔ احباب ہر دم ان کی دل جوئی میں مصروف رہتے۔ مگر اولاد کا دکھ تو انسان کی کمر توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ حسینہ تو خیر ان کی آنکھوں کے سامنے گم ہوئی تھی......مگر......شہر یار اور عمران تو کسی دوسرے شہر میں کسی عامل کی تلاش میں گئے تھے۔ مگر جانے کس جہاں میں کھو گئے تھے۔ ان کے موبائل بھی مسلسل بند

جا رہے تھے۔ ان کی تلاش میں نواب سراج الدین نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا۔ ہر جگہ آدمی دوڑائے گئے، ہر شہر کے ہسپتال، تھانہ، جیل، پاگل خانے چیک کیے جا چکے تھے۔ نجومیوں، عاملوں کا سہارا لیا گیا، اخبارات اور کیبل پر اشتہارات چلائے گئے لیکن شہریار اور عمران کو نہ ملنا تھا نہ ملے۔ جانے اُنہیں زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔ ہر روز صبح کے وقت حویلی کے دروازے پر صدقہ خیرات کیا جاتا...... درود و وظائف کا عمل جاری تھا۔ مساکین کے لیے سائیں جیون کے مزار کے باہر بوہڑ کے درخت تلے روزانہ دیگوں کے منہ کھلتے لیکن نتیجہ ندارد...... ہر آنے والا دن مایوسی کا نیا سورج لے کر طلوع ہوتا...... تلاش میں جانے والا ہر شخص آ کر نفی میں سر ہلا دیتا......

یوں پورا گھرانہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ بتدریج مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

ایک مناسب جگہ رات قیام کرنے کے بعد دونوں نے وادی میں آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور جہاں وادی دھند میں لپٹی نظر آتی تھی اس طرف رُخ کر کے سفر کا آغاز کر دیا۔ اب ان کے چہروں پر ایک طرح کی بشاشت تھی۔ وادی میں سفر تکلیف دہ نہیں بلکہ مسحور کن تھا۔ بھوک پیاس کی فکر نہ تھی۔ پھل دار درخت جیسے ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور جس طرف ان کا رُخ تھا ندی بھی اُسی طرف رواں دواں تھی۔

شام سے قبل وادی ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی جہاں چاروں طرف برف کا راج تھا۔ صرف وادی کا یہ حصہ سرسبز و شاداب تھا۔ یہاں پہنچ کر عمران کو جیسے کچھ یاد آ گیا اور وہ چیخنے کے سے انداز میں بولا۔

''شہریار! یہی وہ جگہ ہے خواب میں یہیں وہ حویلی نمودار ہوتی ہے......'' شہریار رُک کر اپنے دوست کو دیکھنے لگا پھر بولا......''

''تو پھر کیا ہم یہیں پڑاؤ ڈال دیں؟''

''دیکھو وہ درخت نظر آ رہا ہے......''

''ہاں......''

''آؤ وہاں تک چلتے ہیں۔'' عمران نے کہا اور دونوں درخت کے نیچے پہنچ گئے۔ درخت کے نیچے کوئی 2 فٹ اونچا برف کا چبوترا بنا تھا' جس پر درخت کے پتے بکھرے ہوئے تھے' یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس طرف کبھی کوئی انسان نہ آیا ہو۔ چاروں طرف عجیب سی ویرانی تھی۔ دونوں نے مل کر چبوترے پر سے پتے صاف کئے اور ایک جگہ ان کا ڈھیر لگا دیا۔

انہوں نے اپنے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی' ساتھ میں کافی سامان لے کر آئے تھے' اچھا خاصا سفر کر چکے تھے اس لئے تھکن بھی ہوگئی تھی' شہریار نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم نے حاتم طائی کا قصہ سنا ہے......خدا جانے کہاں کہاں ویرانوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔کیا ہم اس دور کے حاتم طائی نہیں ہیں؟''عمران نے چند لمحے خاموشی اختیار کی پھر بولا......''

''اس کا مقصد الگ تھا۔وہ تو لوگوں کی مرادیں پوری کرنے کیلئے سفر کرتا تھا ہم تو خود نامراد ہیں' ہماری زندگی کا ایک حصہ ہم سے جدا ہو گیا ہے اور ہم اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ہم حاتم طائی کیسے ہو سکتے ہیں......''

''میں دوسری وجہ سے کہہ رہا تھا......''شہریار نے جواب دیا۔

''کیا......؟''عمران نے استفسار کیا۔

''ایک بات بتاؤ......''شہریار نے سوال پوچھنے کی اجازت طلب کی۔

''کیا......؟''عمران نے کہا۔

''کیا تم یہ جگہ عجیب وغریب محسوس نہیں کر رہے......؟''

''محسوس کرنے کی بات کر رہے ہو میں کہتا ہوں اس سے زیادہ بھیانک جگہ میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ویسے عمران کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ یہ وہی جگہ ہے......؟''

''میں تمہیں کیا بتاؤں شہریار' جب میں تمہارے گھر کے اس کمرے سے اندر داخل ہوا تو پہلے تو وہاں کوئی ایسی جگہ ہی نظر نہیں آئی' جسے نیا یا کچھ الگ کہا جا سکتا۔اس کے بعد جو طلسمی واقعات کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو تم سوچ نہیں سکتے کہ مجھ پر کیا گزری۔یار کبھی کبھی جب ہم اس طرح کے قصے کہانیاں سنتے تھے تو دل میں سوچتے تھے کہ یہ سب من گھڑت ہیں لیکن اب جب یہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے تو ہمیں یہ احساس ہوا ہے کہ کچھ بھی من گھڑت نہیں ہے۔ہم نے جو داستانیں سنی تھیں وہ سچائی پر مبنی تھیں۔''

دونوں دوست بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔عمران نے کہا......

''ویسے میں تمہیں بتاؤں میری چھٹی حس کہتی ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا' میں نے جس جگہ حویلی کے نمودار ہونے کی بات کی تھی یہی وہ جگہ ہے۔تم یقین کرو یہ جگہ مجھے جانی پہچانی محسوس ہو ہی ہے۔چلو یار کچھ کھانے کا بندوست کرو بھوک لگ رہی ہے......''

''کیوں نہ ان پتوں کو آگ لگا دی جائے' مچھر بھی بھاگ جائیں گے۔''شہریار اپنی جگہ سے اٹھا، جیب سے ماچس نکالی۔اچانک اس نے محسوس کیا کہ جیسے پتوں میں کھڑ

بڑ...... کھڑ بڑ ہو رہی ہے۔ ماچس اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ تیلی جلا کر پتوں میں پھینکنا ہی چاہتا تھا کہ یہ آوازیں سنائی دیں۔ پھر اس نے ننھی منی سی چیخیں سنیں۔ کوئی کہہ رہا تھا......

''بھاگو ورنہ جل کر راکھ ہو جاؤ گے'' اور پھر ایک دہشت ناک منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا پتے اس طرح ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے بھاگ رہے تھے جیسے ننھے مُنے بچے خوف سے بھاگ رہے ہوں۔ عمران نے بھی یہ منظر دیکھا اور شہریار کے پاس آ کھڑا ہوا۔ دونوں دہشت بھری نگاہوں سے ان پتوں کو بھاگتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ پتوں نے ایک راستہ متعین کیا اور چیونٹیوں کی طرح قطار بنائے تیزی سے دوڑے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے بڑی رفتار کے ساتھ یہ میدان عبور کیا اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ عمران اور شہریار ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے پھر شہریار نے کہا۔

''یہ کیا ہوا......''

''اللہ بہتر جانتا ہے......''

''یار! میرا تو دل خوف سے بُری طرح دھڑک رہا ہے......''

''سنبھالو اپنے آپ کو شہریار' ابھی تو خوف کے بے شمار بادل ہم پر منڈلائیں گے۔'' عمران نے ہمت سے کہا اور شہریار خاموش ہو گیا۔ پتوں کا اب کہیں نام و نشان نہیں تھا' شہریار نے ماچس جیب میں رکھ لی اور اپنی جگہ آ بیٹھا۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے باعث تھکن سے چور تھے۔ چنانچہ ان کی آنکھوں میں نیم غنودگی پیدا ہونے لگی کہ اچانک شی شی شی کی آواز سنائی دی۔ ایسا لگا جیسے کوئی انہیں مخاطب کرنے کے لئے آواز نکال رہا ہو۔ پہلے شہریار کی آنکھ کھلی' پھر عمران کی' دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئے......

''یہ کیسی آوازیں ہیں......''؟ ابھی عمران کے منہ سے سوال نکلا ہی تھا کہ اوپر سے پھر آواز سنائی دی......

''دو ہیں کیا......؟'' کسی نے پوچھا۔

''چھوڑ' ویسے ہی پریشان ہیں بیچارے......'' دوسری آواز سنائی دی۔

''میرا مطلب ہے کہ ہمارا آرام خراب ہوگا......'' پھر پہلی صدا بلند ہوئی۔

''درخت پر چڑھیں گے تو اٹھا کر پھینک دیں گے انہیں جب تک درخت کے

نیچے لیٹے ہوئے ہیں کوئی بات نہیں ہے......" دوسری آواز نے مہربانہ رائے دی۔

"جانتے ہو کس چکر میں آئے ہیں......"؟ پہلی آواز نے پوچھا۔

"ہاں......" دوسری نے مختصراً کہا۔

"کیا جانتے ہو......؟" پہلی نے سوال کیا۔

"حویلی کا انتظار کر رہے ہیں......" دوسری کا جواب آ گیا۔

"ابھی تو پوری رات کا چاند طلوع ہونے میں نو دن باقی ہیں......" پہلے نے جیسے اطلاع دی۔

"یہ لوگ نو دن تک یہاں رہیں گے......" دوسری آواز نے جیسے عمران اور شہریار کے مضبوط ارادے بھانپ رکھے تھے۔

"اگر حویلی کی تلاش میں آئے ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ نو دن کے بعد جب چاند نکلے گا تو حویلی نمودار ہوگی تو پھر تو یہ لوگ یہیں رہیں گے......" پہلی آواز نے اپنی بات جاری رکھی۔

"ہمارے آرام میں خلل نہیں پڑے گا......؟"

"ارے نہیں، اگر کوئی خلل پڑے گا تو دیکھ لیں گے ابھی بے چاروں کو پڑا رہنے دو......" دوسری آواز نے جیسے فیصلہ سنا دیا ہو۔

یہ آوازیں انتہائی عجیب تھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے دو جانور آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ لیکن ان کی زبان پوری طرح سمجھ آ رہی تھی۔ عمران شہریار کے قریب ہو گیا، شہریار نے بھی اس کی گردن میں بانہیں ڈال دی تھیں۔ آوازیں بند ہو چکی تھیں۔ شہریار نے سرگوشی سے کہا......

"یہ کیسی آوازیں تھیں......؟"

"جیسی بھی ہوں مگر ہماری رہنمائی کر گئیں......"

"کیسے......؟"

"نو دن کے بعد جب چاند نکلے گا تو حویلی نمودار ہوگی اور ہم یہی تو چاہتے تھے کہ ہمیں حویلی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو جائیں۔ بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی دونوں خاموش ہو گئے انہیں یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ درخت کے اوپر بولنے والا کون ہے

البتہ یہ بات انہیں پتہ چل گئی تھی کہ اگر ان میں سے کسی نے درخت پر چڑھنے کی کوشش کی تو ان کے ساتھ بہت برا ہوگا۔ اس کے بعد بھلا آنکھوں میں نیند کہاں سے آتی۔ صبح ہونے میں تھوڑی دیر رہ گئی تھی اور وہ دونوں پاس پاس لیٹے خاموشی سے اوپر دیکھ رہے تھے۔ اچانک انہیں پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی اور اس کے بعد اُلوؤں کا ایک جوڑا درخت پر سے اڑتا ہوا ان کے سروں سے گزر کر چلا گیا۔ دونوں ایک دم خوفزدہ ہو گئے لیکن یہ سب کچھ تو برداشت کرنا ہی تھا......

صبح کا اجالا نمودار ہوگیا تو دونوں اٹھ کر بیٹھ گئے' سب سے پہلے دونوں نے نماز پڑھی اور پھر چائے بنانے کا انتظام کرنے لگے' جیسے بھی الٹی سیدھی چائے بن سکی بنائی اور بسکٹ وغیرہ لے کر ناشتہ کرلیا تو......شہر یار نے کہا۔

''پورے نو دن ہمیں یہاں گزارنے ہیں......''

''ہاں' رات جو کچھ ہوا وہ کافی سنسنی خیز تھا......''

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' شہر یار بولا......

''کیا......؟''

''آخر یہ علاقہ کون سا ہے......؟''

''وقت چاہے جتنا تبدیل ہوجائے کتنی ہی جدت پیدا ہوجائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کچھ پراسرار باتیں اس کائنات کا ایک حصہ رہی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔ پتہ نہیں جدید ترین سائنس اس بارے میں کیا کہانیاں سناتی ہے......''

''میں ایک بات کہتا ہوں کہ زمانہ قدیم میں ایک علم جادو کہلاتا تھا آج بھی ہم جادوگروں کی کہانیاں سنتے رہتے ہیں۔ سامری جادوگر افراسیاب جادوگر اور نجانے کون کون سے، اس کے علاوہ جن' بھوت' پریت' آسیب، سایہ جدید دور کے لوگ ان ساری باتوں کو نہیں مانتے ہم بھی کہاں مانتے تھے' جب سے ہمارے ساتھ یہ واقعات پیش آئے ہیں۔ تب سے ان پراسرار حقیقتوں سے پردہ اُٹھا ہے۔'' عمران نے اپنی رائے واضح کی۔

''ویسے حسینہ والا واقعہ ہوا بہت عجیب ہے......''

''دوسری بات یہ کہ حسینہ کو زمانہ قدیم کا ایک کردار ثابت کیا گیا ہے۔ دونوں

دوست باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس میدان میں چہل قدمی کی جائے۔ وہ اس وسیع و عریض میدان میں چل پڑے اپنا سارا سامان انہوں نے درخت کے نیچے ہی چھوڑ دیا تھا۔ ویسے بھی یہ کوئی شارع عام نہیں بلکہ ایک الگ تھلگ سی جگہ تھی اور وہ تو اس بات پر حیران تھے کہ سیدھے اس جگہ پر کیسے پہنچ گئے جوان کی منزلِ مقصود کا نقطہ آغاز تھی۔"

"قابل غور بات ہے کہ آخر ہم ادھر ہی کیسے آ گئے......" شہریار نے پوچھا۔

"ہمیں آنا ادھر ہی تھا......"

"ویسے ایک بات بتاؤ......"

"کیا......"

"درخت کے اوپر کیا وہ دونوں الو ہی باتیں کر رہے تھے جو بعد میں فضا میں پرواز کر گئے تھے......"

"وہ جو کوئی بھی تھے لیکن ایک بات ہمیں معلوم ہے کہ اگر ہم نے ان کی کھوج لگانے کی کوشش کی اور درخت پر چڑھے تو ہمارا کریا کرم ہو جائے گا......"

"بالکل ٹھیک کہتے ہو ہم ایسا کچھ نہیں کریں گے جس سے ہمیں نقصان پہنچے......"

میدان کے آخری سرے تک کا سفر بہت ہی طویل ثابت ہوا انہیں چلتے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے تھے بالآخر وہ تھک گئے اور انہوں نے ایک جگہ منتخب کی اور بیٹھ گئے...... وہ میدان کے بیچ دیکھ رہے تھے جہاں کسی حویلی کے نمودار ہونے کا امکان تھا......

دونوں بہت دیر تک بیٹھے ستاتے رہے اور جب سورج ڈھلنے لگا تو واپس اسی درخت کی طرف چل پڑے۔ درخت تک پہنچتے پہنچتے سورج غروب ہو چکا تھا۔ شدید بھوک کو مٹانے کے لیے شہریار نے کھانے پینے کا انتظام کیا پھر نماز پڑھ کر وہ لیٹ گئے۔ اس وقت رات کا تقریباً ایک بجا ہو گا ابھی ان کی آنکھوں میں نیم خوابی جیسی کیفیت تھی کہ اچانک اس میدان میں مدھم مدھم روشنی نموار ہونے لگی شہریار نے فوراً عمران کو آواز دی۔

"عمران! اٹھو جلدی اٹھو......"

"کیا ہوا شہریار......؟"

"ذرا ادھر دیکھو۔ شہریار نے کہا اور عمران ادھر دیکھنے لگا جدھر شہریار نے اشارہ

کیا۔ مدھم مدھم روشنی میدان کو روشن کرتی جا رہی تھی لیکن یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے۔ روشنی کا کوئی مرکز یا منبع نہیں تھا۔ یہاں تک کہ میدان پوری طرح روشن ہوگیا۔ آسمان چاند کے بغیر بدستور تاریک تھا لیکن میدان میں ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت ساری مشعلیں جلا دی گئی ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ انسانوں کو دیکھا جو آہستہ آہستہ بڑے منظّم طریقے سے آگے آ رہے تھے۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ ان کے ہاتھوں میں جھاڑو دبے ہوئے ہیں مزید غور کرنے سے ان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ آنے والوں کے کندھوں پر سر نہیں تھے۔ شانوں کے درمیان کی جگہ بالکل سپاٹ تھی لیکن وہ زندہ انسانوں کی طرح چل پھر رہے تھے۔ شہریار لیٹے لیٹے عمران کے بالکل قریب ہوگیا۔

"وہ......وہ......وہ سر کٹے ہیں......" شہریار کے منہ سے آواز نکلی۔

"میں دیکھ رہا ہوں۔" عمران بھی گھٹی گھٹی آواز میں بولا......

سر کٹے اچھل کود کرتے ہوئے میدان میں جھاڑو لگا رہے تھے ان کے ہنسنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں خدا جانے یہ آوازیں کہاں سے نکل رہی تھیں کیونکہ ان کے منہ نہیں تھے۔ پھر اچانک وہ اس طرح رُک گئے جیسے انہوں نے کچھ دیکھ لیا ہو ان کا رُخ عمران اور شہریار کی جانب ہی تھا وہ جھاڑو ہاتھ میں لئے خاموش کھڑے تھے پھر ان میں سے ایک کی بھیانک آواز اُبھری......ایسا لگا جیسے ریلوے انجن کی سیٹی بجی ہو......

"کون ہو تم دونوں......" شہریار کے حلق سے دبی دبی چیخ نکل گئی وہ عمران سے بولا۔

"ہم سے ہی پوچھ رہے ہیں......" عمران کے منہ سے آواز نہیں نکلی دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے سر کٹوں کو دیکھ رہے تھے' جن کی تعداد کافی زیادہ تھی......

"تمہیں معلوم ہے یہ بے کنٹھ ہے اور بے کنٹھ میں کسی باہر سے آنے والے کو جگہ نہیں دی جا سکتی۔ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ ورنہ ہم تمہاری گردنیں کاٹ کر تمہیں اپنے جیسا بنا لیں گے......"

"اب کیا کریں......؟" شہریار نے پوچھا۔

"اللہ مالک ہے......" عمران نے کہا۔ آواز پھر سنائی دی۔

"تم نے سنا نہیں دونوں کے دونوں یہیں ہو؟ آخری بار کہہ رہے ہیں یہاں سے

بھاگ جاؤ......''

''ہم نہیں بھاگیں گے۔'' عمران کے حلق سے رونے جیسی آواز نکلی۔ ان لوگوں نے اپنے جھاڑو فضا میں پھیلائے اور دوسرے ہی لمحے جھاڑو چمکنے لگے' وہ تلواروں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ اس کے بعد وہ کسی منظّم فوج کی طرح آگے بڑھنے لگے ان کے قدم ایک ساتھ اٹھ رہے تھے اور ان کا رخ انہیں کی جانب تھا۔ پھر انہوں نے اپنے حلق سے خوفناک آواز نکالی ہو' ہا' ہی' ہو کرتے عمران اور شہریار کی جانب دوڑے تو دونوں کے حواس جواب دے گئے۔ پیچھے ایک درخت تھا اور دونوں درخت پر چڑھنا جانتے تھے۔ چنانچہ وہ برق رفتاری سے درخت کے تنے پر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اوپر جانے لگے۔ اس وقت وہ بھول گئے تھے کہ پچھلی رات ان سے کہا گیا تھا کہ وہ درخت پر نہ آئیں لیکن اب کیا کرتے وہ خوفناک سر کٹے ان کی جانب دوڑ رہے تھے اور اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ لمحوں کے اندر اندر وہ ان کے قریب پہنچ کر ان کی گردنیں اڑا دیں گے۔ وہ درخت کے اوپر چڑھتے ہی چلے گئے' بہت ہی اونچی شاخوں پر پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ سر کٹے درخت کے قریب پہنچ گئے تھے' وہ تلواریں ہرا رہے تھے اور درخت کے نیچے ناچ رہے تھے۔ اتنا ہولناک منظر تھا کہ بڑے سے بڑا نڈر انسان اسے دیکھتا تو اس کا پتہ پانی ہو جاتا۔ یہ دونوں بھی دہشت زدہ نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے بدن پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اچانک انہیں' اپنے قریب سرسراہٹیں محسوس ہوئیں اور عمران نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ کالے رنگ کا ایک خوفناک سانپ جو تقریباً چھ گز لمبا تھا اوپر کی شاخ سے نیچے اتر رہا تھا س کی آنکھیں ننھے ننھے ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں اور اس کی دوشاخہ زبان' بار بار باہر ل رہی تھی۔ نیچے بھی موت تھی اور اوپر بھی۔ دونوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ریں۔ ان کے اعصاب جواب دینے لگے۔ سانپ آہستہ آہستہ قریب پہنچتا جا رہا تھا۔ ران ایک شاخ سے چمٹا ہوا تھا۔ سانپ نیچے آ گیا اور اس نے عمران کے بدن کے گرد لپٹنا وع کر دیا۔ عمران کو اپنی پسلیاں ٹوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ سانپ کی گرفت کافی سخت تھی۔ زکار سانپ اس کے پورے بدن سے لپٹ گیا اور عمران شاخ میں جھولنے لگا۔ اس نے ے بھری نگاہوں سے شہریار کو دیکھا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ ویسا ہی ایک سانپ شہریار

کے بدن سے بھی لپٹا ہوا ہے۔ شہریار نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا اس کے ہاتھ پاؤں شاخ کو چھوڑ چکے تھے۔ اس وقت اگر یہ سانپ پوری قوت سے اس کے جسم کے گرد نہ لپٹا ہوتا تو شاید وہ نیچے گر پڑتا ادھر نیچے سر کٹے مسلسل شور مچا رہے تھے اور تلواروں سے درخت کے تنے پر ضربیں لگا رہے تھے لیکن درخت کافی مضبوط اور موٹا تھا اس لئے تلواریں اسے نقصان نہیں پہنچا رہی تھیں۔ خوشی کی دوسری بات یہ بھی تھی کہ شاید وہ درخت پر چڑھنا نہیں جانتے تھے کیونکہ ان میں سے کسی نے بھی درخت پر چڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ عمران اور شہریار کی حالت عجیب سی تھی وہ ہوش میں بھی تھے محسوس کر رہے تھے کہ سر کٹے کیا بکواس کر رہے ہیں لیکن بے ہوشی بھی ان پر طاری تھی۔ اب انہیں اپنے جسموں پر سانپوں کی گرفت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ رفتہ رفتہ ان کے حواس جواب دے رہے تھے اور پھر وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئے۔ جب انہیں ہوش آیا تو وہ انہی شاخوں سے لپٹے ہوئے تھے اور نیچے سر کٹے غائب ہو چکے تھے۔ دن کا اجالا پھوٹنے لگا تھا......

عمران نے شہریار کی صورت دیکھی' بولنے کی کوشش کی لیکن منہ سے آواز نہیں نکلی اچانک اسے سانپ کا خیال آیا اور اس نے خوفزدہ نگاہوں سے ہاتھوں کو شاخ سے ہٹا کر اپنے بدن کو ٹٹولا لیکن سانپوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ دونوں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو انہیں اپنے سر کے اوپر ایک بڑا سا گھونسلہ نظر آیا جو یقیناً الوؤں کا تھا۔ عمران نے بڑی مشکل سے اپنے حواس بحال کئے اور شہریار کو آواز دی......

''کیا تم ہوش میں ہو میرے بھائی......!''

''ہاں......''

''سانپ چلے گئے......؟''

''ہاں اب نظر نہیں آ رہے......''

''شاخ سے گرو گے تو ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں گے نیچے اب کوئی بھی نہیں ہے......''

''ہاں۔''

''میں نیچے اترنے کی کوشش کر رہا ہوں......'' تم بھی احتیاط سے نیچے اترو......

''ٹھیک ہے۔'' شہریار نے کہا۔ عمران نے بڑی ہمت سے کام لے کر نیچے اُترنا

شروع کیا اور تھوڑی دیر بعد اس کے قدموں نے زمین چُھو لی۔ پھر شہریار بھی آہستہ آہستہ نیچے آ گیا......

''ہم دونوں زندہ ہیں......''

''اللہ کا فضل ہے......''

''دیکھو یہ درخت کے تنے پر تلواروں کے نشان......''

''ہاں اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ ہم نے دیکھا وہ خواب نہیں حقیقت ہی تھا......''

''اب کیا ہو گا عمران......؟''

''کچھ نہیں۔ شہریار! انسان کی زندگی میں ہمت بنیادی حیثیت رکھتی ہے اگر ہم نے ہمت کا دامن چھوڑ دیا تو کچھ بھی نہیں کر سکیں گے......''

''تو کیا ہم اس درخت کے نیچے ہی قیام کریں گے......؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ درخت ہماری بہترین پناہ گاہ ہے۔'' عمران نے جواب دیا۔

یہ ایک دلچسپ بات تھی حالانکہ جو لمحات گزرے تھے ان کے تحت خوف سے ان ے دلوں کی دھڑکنیں بند ہو جانی چاہئیں تھیں اور انہیں یہاں سے بھاگ جانا چاہیے تھا۔ لیکن جذبہ انہیں یہاں تک لایا تھا وہ بھلا انہیں بھاگنے کہاں دیتا' البتہ جس خوفناک صورتحال ، وہ گزرے تھے اس نے اس جذبے پر اوس ضرور ڈال دی تھی۔ آج دونوں کی حالت کافی ب تھی۔ بے یار و مددگار بیٹھے رہے، ان کی کیفیت بتا رہی تھی کہ بڑی بے بسی محسوس کر ہے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ اب ہو گا کیا......؟

وقت اسی طرح گزرتا رہا اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے' دوپہر کے بعد عمران نے ار سے کہا......

''میری بات کا بُرا مت ماننا شہریار! حسینہ تمہارا خون ہے اور میری شریکِ حیات ندگی کی آخری سانس تک اس کی تلاش جاری رکھوں گا۔ میرے دوست تم جن جذبوں ت میرے ساتھ آئے ہو ان میں شک کرنا بے وقوفی بھی ہے اور زیادتی بھی۔ لیکن پھر حالات پر غور کرلو کوئی بھی لمحہ ہماری موت کا لمحہ بن سکتا ہے اور ہم موت کی آغوش میں لتے ہیں۔ حسینہ تو ان حالات کا شکار ہو گئی' انکل اور آنٹی کو تمہاری اشد ضرورت ہے تم

مجھے بتاؤ کیا تم......؟'' شہریار نے مسکرا کر عمران کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

''تم جیسا دوست اور محبت کرنے والا جسے مل جائے دنیا میں اسے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ میرے پیارے دوست میں تمہاری محبت کے جذبے کو سراہتا ہوں اور پورے خلوص سے یہ بات کہتا ہوں کہ اگر ہماری تقدیر نے ہمارا ساتھ دیا اور حسینہ ہمیں مل گئی تو میں اتنی خوشی حاصل کروں گا جسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ سمجھ رہے ہو نا تم...... میں تمہارا ساتھی ہوں اور حسینہ کو تلاش کرنے میں آخری وقت تک تمہاری مدد کروں گا چاہے اس میں میری جان ایک بار نہیں سو بار چلی جائے......''

''خدا کرے حسینہ ہمیں مل جائے۔'' عمران نے حسرت بھرے لہجے میں کہا......

اس گفتگو نے ان کے اندر ایک بار پھر ناقابلِ شکست جذبہ اور ولولہ پیدا کر دیا...... دن گزر گیا۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی لیکن جیسے ہی رات آئی' ان کے دلوں میں خوف نے ڈیرے ڈال لیتے اور وہ سوچتے کہ دیکھو آج رات کی کہانی کیا ہوتی ہے۔ شام کے سائے فضا میں اتر آئے تو وہ ہوشیار ہو گئے۔ کھانے پینے کے کافی دیر بعد تک وہ سہمے ہوئے لیٹے رہے۔ ابتدائی راتیں تھیں' چاند سرِ شام نمودار ہوتا اور پھر جلد غروب ہو جاتا تھا۔ ابھی چودھویں کی رات میں کچھ دن باقی تھے' چاند کے ابتدائی سفر میں چاندنی بھی کوئی خاص نہیں ہوتی۔ بس مریل اور زرد زرد سی۔ گزری رات کے واقعہ کا بھی اندازہ تھا۔ انہوں نے اپنے کان درخت پر ہونے والی ہر آہٹ پر بھی لگا رکھے تھے' انہیں اس بات کا پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ سانپ کہاں سے آئے تھے اور کہاں گئے۔ انہوں نے ایک طرح سے ان کی مدد ہی کی تھی اگر وہ انہیں اپنے جسم کی لپیٹ میں نہ لے لیتے اور درخت پر انہیں رات بھر نہ لٹکائے رکھتے تو پتہ نہیں وہ سر کٹے بھوت ان کا کیا حال کرتے۔ جس طرح انہوں نے درخت کے تنے پر تلواریں برسائی تھیں اور جس طرح دن کی روشنی میں درخت کے تنے پر ان تلواروں کے نشان نظر آ رہے تھے اس سے تو یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اگر یہ ان کے ہاتھ لگ جاتے تو وہ ان کا قیمہ ہی کر ڈالتے۔ پھر کافی رات گزر گئی۔ اور پھر دونوں گہری نیند سو گئے' عمران نے دیکھا کہ برف کی سفید چادریں زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی ہے اور ان پر ہلکے ہلکے کالے دھبے پڑے ہوئے ہیں جو سمجھ میں نہیں آ رہے تھے پھر اُس نے وہ محل دیکھا جو

سونے کا بنا لگتا تھا اس کی چمک ایک برف کے ویرانے کو سنہری کیئے ہوئے تھی اسے ویسا ہی محسوس ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ محل میں داخل ہو رہا ہے اور پھر اُس نے دور سے حسینہ کو دیکھا جو سسکیاں بھر رہی تھی۔ دونوں ہی کی آنکھ ایک ساتھ کھلی۔ عمران دوڑ کر شہریار سے لپٹ گیا......

''وہ رو رہی ہے شہریار......! وہ رو رہی ہے۔'' شہریار کی آواز بھی رندھ گئی۔

''ہاں وہ رو رہی ہے، دیکھو فضا میں اس کی سسکیاں گونج رہی ہیں۔'' شہریار نے کہا اور دونوں کی سانسیں رُک گئیں۔ ویران میدان میں حسینہ کی سسکیاں حقیقتاً اُبھر رہی تھیں۔ ہواؤں کی سرگوشیوں کے ساتھ مدھم سسکیاں حسینہ رو رہی تھی...... وہ سچ مچ رو رہی تھی دونوں اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگے لیکن تاحد نگاہ ویرانی اور سناٹے کا راج تھا شہریار نے کہا۔

''کیا تم بھی وہی خواب دیکھ رہے تھے عمران......''؟

''خواب......''

''ہاں......''

''اور تم!؟ کیا تم نے بھی برف کی وہ سفید چادر دیکھی تھیں، کیا تم نے بھی وہ برف کا ویرانہ دیکھا تھا، جہاں سنہری محل جگمگا رہا تھا اور سنہری محل کے اندر حسینہ ایک مسہری پر بیٹھی رو رہی تھی، سسکیاں لے رہی تھی۔ مجھے بتاؤ میرے دوست کیا تم نے بھی یہی منظر دیکھا تھا......؟'' عمران نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں آبدیدہ ہو کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ فضا میں حسینہ کی سسکیاں مدھم پڑتی جا رہی تھیں اور اس کے بعد فضاؤں میں سکوت چھا گیا۔ پھر عمران نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''شہریار! بے شک زندگی ایک بار ملتی ہے لیکن اس وقت ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمیں کس طرح جینا ہے اور کس طرح مرنا ہے......''

دونوں کے اندر ایک نیا حوصلہ بیدار ہو گیا تھا اور وہ بہت مطمئن ہو گئے تھے۔ کیونکہ بعد کے دن پرسکون گزرے اور کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جو ان کے لئے خوف کا باعث بنی ہو۔ یہ بھی شاید انہیں خوفزدہ کر کے بھگانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ نہیں بھاگے یہاں تک کہ چاند کی چودھویں تاریخ آ گئی۔ پچھلے دنوں بھی چاند بڑی آب و تاب کے ساتھ

نکل رہا تھا اور اس کی پراسرار چاندنی میں نجانے کیسے کیسے خیالات ان کے دلوں میں آتے رہتے تھے۔ چودھویں کا چاند نمودار ہو گیا۔ پورے چاند کی چاندنی نے پوری فضا کو منور کر دیا۔ وہ دونوں اس طرح اپنا سامان سمیٹ کر بیٹھے تھے جیسے کسی سفر پر روانگی ہو۔ آج فیصلہ ہونا تھا کہ انہیں یہاں رکنا ہے یا نہیں۔ غالباً رات کے بارہ بجے تھے جب میدان کے بیچوں و بیچ ایک مدھم سی سیاہی نظر آنے لگی۔ یہ سیاہی ایک بہت بڑے علاقے کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ رفتہ رفتہ اس سیاہی کی دیواریں بلند ہونے لگیں۔ اس کے بعد اس میں دروازے نمودار ہونے لگے باقی اطراف کے بارے میں انہیں معلوم نہیں تھا کہ ادھر کیا ہے' لیکن سامنے کا حصہ واضح طور پر اُبھر رہا تھا' دو چھوٹے چھوٹے دروازے اور ایک عظیم الشان بلند دروازہ جس میں انتہائی موٹی لکڑی کے تقریباً پندرہ فٹ اونچے کواڑ نظر آ رہے تھے ان کواڑوں میں ایک موٹی زنجیر سے بہت بڑا تالا لٹکا ہوا تھا۔ دروازوں کا رنگ خوبصورت تھا اور ان میں پیتل کی کیلیں جڑی نظر آ رہی تھیں۔ دونوں سحر زدہ نگاہوں سے اس حویلی کی تکمیل کا منظر دیکھتے رہے حویلی کی طرزِ تعمیر روایتی نوعیت کی تھی۔ اس حویلی کی داستان اس وقت انہیں خود نہیں معلوم تھی ان کے سامنے حویلی کا جو خاکہ نمودار ہوا تھا اب وہ مستحکم تر ہوتا جا رہا تھا۔

پھر حویلی کی تکمیل کا عمل مکمل ہو گیا۔ حویلی نمایاں ہو گئی تھی۔ دفعتاً عمران کی آواز ابھری۔

''آؤ......'' شہریار اس طرح چونک پڑا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے عجیب سی نگاہوں سے عمران کو دیکھا' تو عمران نے کہا۔

''شہریار......!''

''ہاں......''

''میں حویلی میں جا رہا ہوں۔'' شہریار ایک دم جیسے بیدار ہو گیا۔ عمران کے لہجے سے اسے احساس ہوا کہ جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ شہریار حویلی میں جانے سے خوفزدہ ہے۔ اس نے جلدی سے کہا۔

''خدا کی قسم! میں صرف حیرت زدہ ہوا ہوں عمران......! خوفزدہ نہیں۔''

''آؤ......'' عمران نے کہا اور ان کے قدم حویلی کے صدر دروازے کی جانب بڑھنے لگے اس بڑے تالے کو توڑنے کے لئے بڑے وزنی اوزار چاہئیں تھے اور عمران اس پر

نگاہیں جمائے سوچ رہا تھا کہ اسے توڑنا انتہائی مشکل کام ہوگا لیکن سب سے طاقتور چیز وہ عزم ہوتا ہے جو کسی کام کے لئے کیا گیا ہو اور یہی عزم عمران کے دل میں زندہ تھا اور جب عزم زندہ ہوتا ہے تو مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں' جیسے ہی یہ قریب پہنچے' تالے نے اپنا منہ کھول دیا اور لکھنے لگا۔ عمران نے مسکراتی نگاہوں سے شہریار کو دیکھا' شہریار ابھی تک حیران تھا اس کے اندر عمران جیسی ہمت اور مستعدی نہیں پیدا ہوئی تھی......عمران نے آگے بڑھ کر کوئی پانچ کلو وزنی تالا اس کے کنڈے سے باہر نکالا اور اسے زمین پر ایک طرف پھینک دیا پھر اس نے موٹی زنجیر کھول دی اس دروازے کا ایک پٹ کھولنے کے لیے دونوں کو پوری قوت صرف کرنا پڑی تھی تب چوں چوں کی بھیانک آواز کے ساتھ حویلی کا دروازہ پیچھے سرکنے لگا......اور پھر کواڑ اتنے کھل گئے کہ دونوں داخل ہو سکیں۔ چنانچہ بسم اللہ پڑھ کر دونوں اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک وسیع وعریض صحن تھا جس میں چودہ دروازے کھلتے تھے۔ ان دروازوں کے دوسری جانب کیا تھا اس کے بارے میں انہیں کچھ نہیں علم تھا۔ فطری طور پر انہیں سامنے والے ہی دروازے کا رخ کرنا تھا۔ دونوں وسیع وعریض صحن عبور کر کے سامنے والے دروازے کے پاس پہنچنے اور جائزہ لینے کے لیے رُک گئے صحن میں بینچ پڑے تھے۔ یہاں انتہائی بڑے بڑے درخت تھے یہ کہا ہی نہیں جاسکتا تھا کہ یہ کوئی ویران حویلی ہے بلکہ یہ تو پوری طرح آباد محسوس ہو رہی تھی لیکن ابھی تک کوئی انسانی وجود نگاہوں کے سامنے نہیں آیا تھا۔

تھوڑی دیر رکنے کے بعد دونوں آگے بڑھتے چلے گئے دروازے کے پاس پہنچ کر انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور اندر قدم رکھ دیا۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا جس کے آخری سرے پر پھر ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ کمرہ صاف شفاف تھا اس میں عالیشان پردے لگے ہوئے تھے۔ دیواروں کے اوپر روشن دان بنے تھے جس میں رنگین شیشے لگے ہوئے تھے اور ان شیشوں سے چاند کی روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی اور بڑی حسین لگ رہی تھی۔ شیشوں کے رنگ پورے کمرے میں بکھرے ہوئے تھے یہ رنگ ایک میز کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ جس پر خوبصورت جلد والی موٹی کتاب پڑی تھی۔ عمران نے شہریار کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے میز کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ میز کے پاس پہنچ کر اس نے لرزتے ہاتھوں سے کتاب کی جلد پلٹی۔ پہلا صفحہ کورا تھا لیکن دوسرے صفحے پر ایک تحریر نمایاں نظر آ رہی تھی۔

اس نے غور سے تحریر کو دیکھا، لکھا تھا:

''حویلی میں داخل ہونے والوں کو سلام۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں وہی داخل ہوگا جس کے دل میں کوئی بڑی آرزو ہوگی۔ قدرت ہر کسی کی ہر آرزو پوری کرتی ہے' لیکن کسی مظلوم کے لئے دل میں کوئی جذبہ پیدا کرنا سب سے بڑی عبادت ہے اور کامیابی اس کو ملتی ہے جو کسی کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ اگر تم اپنی کسی خوشی کی تکمیل چاہتے ہو تو پہلے اس قیدی کو آزاد کرانے کی کوشش کرو' جو زندہ درگور ہے اگر تم اسے آزاد کرانے میں کامیاب ہوگئے تو سمجھ لو تمہاری کامیابی کے راستے کھل گئے' آگے بڑھو اور سامنے والا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جاؤ......'' کتاب کی تحریر یہی تھی۔ عمران نے اسے خود پڑھ کر دیکھا اور اس کے بعد بلند آواز میں شہریار کو اس کے بارے میں بتایا۔ شہریار حیران رہ گیا۔ اس نے کہا۔

''ہاں اس میں کوئی شک نہیں' اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تقدیر ہمارے لئے کوئی مناسب فیصلہ کرنا چاہتی ہے......''

''تو پھر اب بتاؤ کہ کیا کیا جائے......؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں آگے بڑھ کر اس دروازے تک پہنچنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے چلو چلتے ہیں۔'' عمران نے کہا اور چونک کر رُک گیا۔

''کیوں کیا بات ہے......؟'' شہریار نے پوچھا۔

''شہریار کیا ہمیں کتاب کے دوسرے صفحات پلٹ کر نہیں دیکھنے چاہئیں......؟''

''تم بتاؤ......''

''میں کوشش کرتا ہوں' عمران نے کہا اور کتاب کا دوسرا صفحہ کھولا' اس پر لکھا تھا۔

''نہیں' ہر بات وقت سے پہلے جان لینا مناسب نہیں ہوتا' تمہیں جن راستوں سے گزرنا ہے انہی پر نگاہ رکھو' بعض اوقات ہر بات کو جان لینے کی کوشش نقصان دہ ہوتی ہے......''

عمران نے فوراً کتاب بند کر دی۔ دونوں حیرت سے اس کتاب کے بارے میں سوچتے رہے اور پھر عمران نے گہری سانس لے کر کہا۔

''مجھے خوشی ہے کہ قدرت ہماری رہنمائی کر رہی ہے اس کے علاوہ ہمیں اور

کیا چاہیے......''

''واقعی' قدرت ہماری بڑی رہنمائی کر رہی ہے......'' پھر دونوں اس دروازے کی جانب بڑھ گئے اور اسے کھول دیا۔ دروزہ کھلتے ہی ان کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ وہ روشنی میں نہا گئے۔ اس طرف بڑی تیز روشنی تھی۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ حویلی کے اس پراسرار حصے میں ایسا کوئی منظر بھی ہوگا۔ یہ ایک باغ تھا جس میں پھلوں سے لدے درخت جھوم رہے تھے' لیکن دوسری چیز بڑی سنسنی خیز تھی وہاں کالے رنگ کے بہت سے مجسمے کھڑے تھے ان مجسموں کی شکلیں بہت خطرناک اور ہیبت ناک تھیں۔ ایک نظر دیکھنے پر یہ اندازہ ہوا کہ وہ مجسمے ہیں اور بے شک پتھر کے ہی بنے ہوئے ہیں لیکن ان کے چہرے انسانوں جیسے ہیں انہوں نے نگاہیں اٹھا کر عمران اور شہریار کو دیکھا اور پھر جیسے سب نے مل کر رونا شروع کر دیا ہوان کے منہ سے آوازیں آرہی تھیں......

''تم ہم جیسے مت ہو جانا' مایا کالی کے چکر میں مت آنا......تم ہم جیسے مت ہو جانا ' مایا کالی کے جال میں مت آنا......'' یہ صدائیں سن کر عمران اور شہریار کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اس ابتر صورتحال کا انہیں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ کافی دیر تک وہ یہ آوازیں سنتے رہے۔ رونے پیٹنے والوں کی آواز اس قدر بھیانک تھیں کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے' حالانکہ ان کی آواز میں منمناہٹ تھی لیکن یہ منمناہٹ اس قدر خوفناک تھی کہ دل قابو سے باہر ہوئے جا رہے تھے......''

''اب کیا کریں؟'' شہریار نے سوال کیا......

''آگے بڑھو قدرت نے ہماری تقدیر میں جو لکھ دیا ہے وہی ہوگا......''

''تمہیں کتاب کی تحریر یاد ہے......؟''

''ہاں......''

''اس میں تو بڑے صاف الفاظ میں لکھا تھا کہ ہمیں کسی قیدی کی مدد کرنا ہے......''

''ہاں......''

''مگر یہ لوگ قیدی تو نہیں ہیں......؟''

''یہ لوگ کون ہیں......''

''ان سے معلوم کیا جائے......''

''چلو آگے بڑھو۔'' شہریار اور عمران ہمت کر کے ایک مجسمے کے پاس پہنچ گئے انہوں نے اسے چھو کر دیکھا وہ پتھر کا ہی تھا' شہریار نے اس سے سوال کیا......

''تم کون ہو......اور یہ باقی لوگ کون ہیں......؟''

''ہم سب مایا کالی کے قیدی ہیں......''

''مایا کالی کیا ہے......؟''

''آگے بڑھ کر دیکھو تمہیں ایک حوض نظر آئے گا، اس حوض میں جو پانی ہے اگر تم وہ پانی نکال کر ہمارے اوپر ڈال دو' تو ہم ٹھیک ہو جائیں گے......''

''کیا تم کسی جادو کے زیر اثر ہو......؟''

''باقی باتیں ہم بعد میں بتائیں گے' پہلے ہمارا یہ کام کر دو۔'' ان کی یہ بات سن کر عمران اور شہریار آگے بڑھ گئے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک حوض نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے حوض میں جھانک کر دیکھا تو انہیں اسی کتاب کا عکس نظر آیا۔ جو صفحہ سامنے تھا اس پر لکھا تھا۔

''مایا کالی کا جال بڑا مضبوط ہو گا' جس قیدی تک تمہیں جانا ہے پہلے اس کی جانب رخ کرو' یہ راستے کے پتھر ہیں جو تمہارا راستہ روکیں گے......'' اور فوراً ہی یہ تحریر مٹ گئی۔ اب حوض میں کسی کتاب کا وجود نہ تھا۔

''اب تو مجھے ایک بات کا یقین ہوتا جا رہا ہے۔'' شہریار بولا......

''کیا......؟''

''یہی کہ انشاء اللہ ہم حسینہ کو لے کر واپس جائیں گے۔''

''یار میں اس حویلی کے بارے میں ایک بات سوچ رہا ہوں......''

''ابھی مت سوچو' کیونکہ ہم حویلی میں ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ یہ حویلی کتنے عرصے تک یہاں نمودار رہے گی......''

دونوں دوست یک دم خوفزدہ ہو گئے۔ کیونکہ یہ بات واقعی سوچنے کے قابل تھی کہ حویلی میں جو کچھ کرنا ہے اس کے لیے ان کے پاس کتنا وقت ہے۔

''چلو آگے چلیں......'' اور دونوں وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

صاف ظاہر تھا کہ یہ ایک طلسمی حویلی تھی۔ کتاب کی پہلی تحریر سے انہیں جو رہنمائی حاصل ہوئی تھی اس سے انہوں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ تھوڑی سی کوشش کے بعد یقیناً وہ کوئی اہم راز پالینے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اگرچہ حویلی کے بارے میں انہیں جو تفصیلات معلوم تھیں ان سے صرف یہی پتہ چلتا تھا کہ حویلی ایک ایسے جن کے قبضے میں ہے جو صدیوں سے کوئی عمل جاری رکھے ہوئے ہے۔ لیکن اس حویلی میں داخل ہونے کے بعد ان کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ انہیں حسینہ کے بارے میں معلومات حاصل ہوجائیں۔ دونوں ایک عجیب سی الجھی ہوئی کیفیت کا شکار تھے۔ یہ حویلی انہیں بہت سے رازوں کی امین محسوس ہونے لگی تھی......شہریار نے آہستہ سے کہا......

''عمران! مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے حویلی میں داخل ہونے کے بعد ہم کسی پراسرار طلسم میں پھنس گئے ہوں۔ اب بتاؤ آگے کیا کیا جائے......؟''

''دوست ہم اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتے۔ ہم ایک ایسے مقصد کے لئے نکلے ہیں جس کا تعلق ہماری زندگی اور موت سے ہے۔ مقصد کی تکمیل کیلئے ہم اپنا مشن جاری رکھیں گے اور اگر ہماری تقدیر میں زندگی نہیں لکھی تو موت کو اپنا لیں گے......'' شہریار نے عمران کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''حقیقت یہ ہے میرے دوست! گو حسینہ میری بہن ہے لیکن اس کی تلاش کا جتنا جذبہ تمہارے اندر ہے اتنا میرے اندر نہیں۔''

''ایسی بات مت کرو شہریار! ہم دونوں ایک ہی جذبے کے تحت ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے کام کررہے ہیں اور وہ جذبہ ہے محبت اور مقصد ہے حسینہ کا حصول۔ آؤ تھوڑی دیر ستالیں...... ہم نہیں جانتے کہ اس پراسرار حویلی میں ہماری یہ رات کس طرح گزرے گی۔''

دونوں ایک جگہ بیٹھ گئے انہیں پچھلا منظر یاد آرہا تھا' جہاں پتھر کے مجسمے رو رہے تھے' فریاد کررہے تھے' انہیں ہوشیار کررہے تھے کہ مایا کالی کے جال میں مت آنا......اب یہ پتہ نہیں کہ مایا کالی کا جال کون سا ہوتا ہے؟ لیکن فیصلہ یہی کیا گیا تھا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا......اور ہم لوگ اپنا کام کرتے رہیں گے۔'' عمران نے کہا۔

''ایک بات تمہیں بتاؤں......''

''ہاں بولو......''

''میں تمہارے گھر کے اس ہمیشہ بند رہنے والے کمرے میں داخل ہوا بادی النظر میں تو وہ کمرہ چھوٹا سا تھا لیکن جب میں اس کے دوسرے دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوا تو اندر کا منظر بالکل الگ تھا۔ بے شمار دروازے تھے' اور ان میں ایک طویل عرصہ میں نے گزارا۔ اتنا لمبا عرصہ کہ لگتا تھا کہ سالہا سال گزر گئے ہوں حالانکہ وہ ساری کہانی ایک رات کی تھی۔ اگلی صبح جب مجھے ہوش آیا تو میں سائیں جیون کے مزار پر بیٹھا ہوا تھا۔ پھر مجھے نہیں معلوم کہ جب میں تمہارے ساتھ گھر پہنچا تو غائب ہو کر اندر کیسے پہنچ گیا۔ یوں لگا جیسے اچانک ہی یہ سب ہو گیا ہو......''

شہریار عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا...... پھر ایک دم ہنسنے لگا' عمران نے چونک کر اسے دیکھا اور بولا......

''تمہیں ہنسی کیوں آئی......؟''

''ایک بات بتاؤ......''

''ہاں پوچھو......''

''عمران ہم جدید دنیا کے جدید لوگ ہیں' مجھے معلوم ہے کہ انٹرنیٹ کے جادو کیا ہیں؟ لیکن کیا انٹرنیٹ کے سارے جادو یہاں آ کر فیل نہیں ہو جاتے' میں اپنی بہن کی تلاش میں نکلا ہوں اس وقت انٹرنیٹ میرے کسی کام کا نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے ابھی کیا کیا کچھ کرنا پڑے گا......''

''ہاں یہ بات کھل کر کہی جا سکتی ہے کہ صدیوں کا طلسم' طلسم ہی ہوتا ہے اور ہم اس طلسمی حویلی میں داخل ہوئے ہیں' دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے......؟''

''اٹھو' اب آگے چلتے ہیں۔ ہمیں آرام میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ وہ تھوڑا اور آگے چلے اور پھر ایک اور دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ حویلی پر اسرار رازوں کا مسکن تھی، وہاں کیا کیا ملے اس کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہاں انہوں نے دیوار کے ساتھ ایک بوڑھے آدمی کو بیٹھے دیکھا، جس کی آنکھوں کی جگہ دو گڑھے نظر آ رہے تھے وہ کافی عمر رسیدہ

معلوم ہوتا تھا۔ سوکھا بدن تھا' ہاتھ پاؤں بھی سوکھے ہوئے' بالکل ساکت بیٹھا ہوا۔ یہ دونوں اسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔

''کیا یہ لاش ہے......؟''

''نہیں جس انداز سے بیٹھا ہوا ہے اس سے لاش تو نہیں معلوم ہوتا یہ......''

''ہاں۔''

''آؤ دیکھیں جب یہاں تک آ ہی گئے ہیں تو کوئی بات نہیں۔'' وہ آگے بڑھے اور بوڑھے کے پاس پہنچ گئے......''

''السلام علیکم بابا جی......!'' جواب میں بوڑھے کی گردن ہی نہیں اس کے ہاتھ پاؤں بھی فضا میں لہرائے اور اس کی آواز ابھری۔

''کون ہے بھائی......!''

''بابا جی! ہم دو پریشان حال اجنبی ہیں......''

''پریشانی؟'' اس کے ہاتھ پاؤں پھر فضا میں لہرائے۔

''جی بابا جی! ہم بہت پریشان ہیں......''

''پریشانی تو زندگی کا جزو ہوتی ہے اور انسان اپنے دکھ کے جال میں پھنس جاتا ہے۔''

''کیا ہم آپ کے پاس بیٹھ سکتے ہیں؟''

''اگر مجھے اس قابل سمجھتے ہو تو بیٹھ جاؤ' بوڑھے نے کمزور سے لہجے میں کہا اور وہ دونوں اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔

''بابا جی! ہمیں اپنے بارے میں کچھ بتائیں......''

''کیا جاننا چاہتے ہو میرے بارے میں......؟''

''کیا آپ اسی حویلی میں رہتے ہیں......''

''رہتا نہیں ہوں' میں اس حویلی کا قیدی ہوں......''

''آپ قیدی!'' وہ دونوں چونک پڑے......

''ہاں میں......''

''ہم سمجھے نہیں بابا جی......!''

''کیا کرو گے سمجھ کر......؟''

''بابا جی! کیا آپ یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں......؟ جواب میں بوڑھے نے حسرت بھرے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا پھر بولا۔

''کیوں دل کے تار چھیڑتے ہو......؟''

''نہیں بابا جی! آپ براہ کرم بتائیے تو سہی......''

''بیٹے! کیا جاننا چاہتے ہو میرے بارے میں......؟'' تم یوں سمجھ لو کہ بس میں تم ہوں......تم میں ہوں......ہم دونوں کیا ہیں...... یہ بس تم نہیں جانتے......'' دونوں بوڑھے کی اس بات پر غور کرنے لگے......ایک خیال بار بار عمران کے دل میں آ رہا تھا کہ کیا یہی وہ قیدی ہے جس کے بارے میں کتاب میں لکھا ہوا تھا۔'' عمران نے سوال کیا۔

''بابا جی! ایک بات بتائیے کیا کہ آپ اس حویلی کے قیدی ہیں......؟''

''تم یہ سوال مجھ سے پہلے بھی کر چکے ہو......''

''میرا مطلب ہے کہ آپ یہاں کب سے ہیں......؟''

''یقین کر لو گے......؟''

''جی جی' آپ بزرگ ہیں' ہم آپ کی بات پر کیوں یقین نہیں کریں گے......''

''گیارہ سو سال سے......''

''کیا......؟''

''ہاں' گیارہ سو سال سے میں اسی طرح بیٹھا ہوا ہوں......'' عمران اور شہریار کو بھلا یقین کیسے آتا اس دور میں گیارہ سو سال زندہ رہنے کی بات تو ناقابل یقین ہی ہو سکتی ہے۔ عمران کو احساس ہوا کہ بوڑھے کا دماغ خراب ہے۔ پھر اس نے کہا۔

''بابا جی! آپ کھاتے پیتے کہاں سے ہیں؟''

''کیا میں تمہیں اپنے وجود سے کھاتا پیتا نظر آتا ہوں؟''

''نہیں بابا جی' لیکن پھر بھی......''

''چلو چھوڑو' میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ یہ حویلی ایک جن کی ملکیت ہے جس کی کہانی صدیوں پرانی ہے۔ میرے اندر وہ قوت نہیں ہے کہ میں اس کی کہانی بیان کر سکوں

لیکن تم اتنا سمجھ لو کہ تمہارے لئے مشکلات ہی مشکلات ہیں۔ تم جیتی جاگتی دنیا سے اس حویلی میں آئے ہو۔ یہاں تمہارے لئے اتنے جال پھیلے ہوئے ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے......"

"باباجی! آپ ہماری کوئی مدد کرسکتے ہیں؟"

"کیسی بات کرتے ہو' اگر میں کوئی مدد کرسکتا تو اپنی نہ کرلیتا......"

"باباجی میری بہن اور میرے دوست کی بیوی اچانک ہی غائب ہوگئی ہے ہم اس کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں اس حویلی کی نشاندہی ہوئی ہے ہم اس کی تلاش میں دنیا کے آخری گوشے تک بھی جاسکتے ہیں۔ چاہے ہمیں ہزار بار کا سامنا کرنا پڑے۔" بوڑھا خاموش بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر تک اس کی گردن جھکی رہی پھر اس نے اپنی بے نور آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھنے کی کوشش کی اور بولا......

"میں کوئی درویش نہیں ہوں......ولی نہیں ہوں' میں تو خود ایک مصیبت زدہ ہوں اور اگر تم لوگ مجھے اس جن کی قید سے آزادی دلا دو تو میں اپنے تجربے کی بناء پر تمہاری رہنمائی کرسکتا ہوں......"

"ہم آپ کو اس کی قید سے کیسے رہائی دلا سکتے ہیں......؟"

"تمہیں اس کے لیے بہت سی مشکلوں سے گزرنا ہوگا' تم سوچ لو کہ کیا تم یہ کر سکتے ہو یا نہیں......؟"

"باباجی! ہم تو مشکلوں سے گزرنے کے لئے ہی اس حویلی میں داخل ہوئے ہیں جس کے بارے میں ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کب تک فضا میں نمودار رہے گی اور کب غائب ہوجائے گی۔ جب یہ غائب ہوجائے گی تو ہمارا کیا ہوگا' بولیے ہمارا کیا ہوگا......؟"

"تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ یہ نمودار ہوتی ہے اور اس کے بعد اپنی جگہ گم ہوجاتی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ روشنی کی شعاعوں میں چھپ جاتی ہے۔ چودھویں رات کے چاند میں مکمل روشنی اسے نمایاں کردیتی ہے اور اس کے بعد یہ حویلی تاریکیوں میں ڈوب جاتی ہے......لیکن رہتی اپنی جگہ پر ہے اور اس کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔ تم مہذب دنیا کے لوگ ہو، میں تمہاری کیا رہنمائی کروں گا۔ آگے بڑھو اور دیکھ لو کہ مقدر میں تمہارے لئے کیا لکھا ہوا ہے......"

"کہاں آگے بڑھیں......؟"

''بس یوں سمجھ لو کہ آج سے تمہاری زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے اس سے بددل مت ہو جانا' راستے میں جو کچھ ملے اس سے سمجھوتہ کر لینا......''

''ہمیں کدھر جانا چاہیے......؟''

''دائیں سمت......''

''کہاں بابا جی؟''

''دائیں طرف دیکھو گے تو تمہیں ایک دروازہ نظر آئے گا جس کا رنگ نیلا ہے اس میں داخل ہو جاؤ اور جو کچھ ملے اس سے بددل مت ہونا۔ بس یوں سمجھ لینا کہ تمہاری زندگی کا ایک مقصد ہے۔''

شہریار نے عمران کی شکل دیکھی اور عمران نے شہریار کی اور دونوں دوست نیلے دروازے تک جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب یہ سب کچھ ان کی زندگی کا مقصد بن ہی گیا تھا تو پھر آگے کیا ہوگا' دیکھا جائے گا۔ عمران نے آگے بڑھ کر نیلا دروازہ کھولا اور دوسرے ہی لمحے ان کے دماغ بھک سے اڑ گئے۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ مہذب دنیا کے کسی خاص گوشے میں آ گئے ہوں۔ یہ تو کوئی بہت ہی جدید جگہ معلوم ہوتی تھی۔ ہر طرف قہقہے بکھرے ہوئے تھے' لوگ آ جا رہے تھے' یوں لگ رہا تھا جیسے ریستوران ہو۔ انتہائی خوبصورت اور بڑے لوگوں کی آماجگاہ۔ عمران نے شہریار کی جانب دیکھا پھر ان کی نگاہ اپنے لباسوں پر گئی اور وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ ان کے جسموں پر بہترین لباس ہیں۔

''اف میرے خدایا! یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔'' شہریار نے کہا اور عمران کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کہا۔

''دیکھو شہریار! تقدیر میں جو لکھا ہے وہ تو ہو کے رہے گا یہ بات تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں کہ ہم جنات کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں اور یہ جنات بڑی قوت رکھتے ہیں۔ جہاں تک ان کے بس میں ہوگا وہ ہمیں بھٹکانے کی کوشش کریں گے۔ حسینہ کے بارے میں جو کہانی تم نے سنا رکھی ہے وہ تمہیں معلوم ہی ہے۔ تم نے بتایا تھا کہ وہ ایک قدیم روح کی شکل میں تھی اس کا چہرہ ایک ایسی شخصیت سے ملتا تھا جس سے ایک جن محبت کرتا تھا اور اب حالات سے اندازہ ہوتا جا رہا ہے کہ وہ جن ہی حسینہ کو لے گیا ہے۔ یقینی طور پر وہ اس

کی تلاش میں تھا اور اب ہمیں حسینہ کو اس جن کے چکر سے نکالنا ہے اس کے لئے ہمیں جو بھی مشکل پیش آئے وہ ہمیں برداشت کرنا ہوگی۔''

یہ کہہ کر عمران نے شہریار کا ہاتھ دبایا' شہریار نے اپنے ذہن کو قابو کرنے کی کوشش کی اور عمران نے ایک میز کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

''آؤ جب اس جدید دنیا میں آہی گئے ہیں تو اس میز کی طرف چلتے ہیں۔'' وہ دونوں میز کے قریب پہنچے اور کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ واقعی یہاں کا ماحول بڑا ماڈرن تھا۔لوگ شاندار لباسوں میں ملبوس تھے' جوڑے آرہے تھے' ایک طرف موسیقی کا اہتمام تھا۔ اس پراسرار اور نامعلوم حویلی میں یہ منظر انتہائی سنسنی خیز اور ہیجانی تھا۔ وہ بیٹھے ہوئے ایک ایک کی شکل دیکھ رہے تھے پھران کی نگاہوں نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا......''

یہ ایک حسین لڑکی تھی۔ عمر کا صحیح اندازہ لگانا بعید از فہم تھا۔ انتہائی خوبصورت لباس میں ملبوس' اس کا چہرہ اس قدر جاذب نظر تھا کہ ایک نظر دیکھنے کے بعد نگاہیں ہٹانے کو دل ہی نہ چاہے' شہریار بھی اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے عمران سے کہا۔

''یار عمران! اس لڑکی کو دیکھ رہے ہو......؟''

''ہاں میں اسے ہی دیکھ رہا ہوں......''

''عمران کیا یہ چہرہ عجیب وغریب نہیں ہے......؟ یہ تو کسی اور سیارے کی مخلوق لگتی ہے۔''

اچانک اس لڑکی کی نگاہیں ان کی جانب اٹھ گئیں۔ عمران نے فوراً محسوس کرلیا کہ وہ شہریار کو دیکھ رہی ہے۔ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن عمران کے فرشتوں کو بھی اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ شہریار اس طرح اٹھ جائے گا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو عمران نے فوراً ہی کہا۔

''کہاں جارہے ہو شہریار......؟''

''آؤ عمران مجھے لگتا ہے کہ وہ مجھے بلا رہی ہے۔'' شہریار بولا......

''ہوش میں آؤ کیا فضول باتیں کررہے ہو......؟''

''قسم خدا کی یقین کرو۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے اس کی آنکھیں مجھے آواز دے رہی ہیں۔ آؤ پلیز آؤ۔'' شہریار نے عمران کا ہاتھ پکڑا اور اتنی قوت سے اٹھایا کہ خود عمران حیران رہ گیا۔ شہریار کے بارے میں اسے اندازہ تھا کہ شہریار اتنا طاقتور نہیں ہے اور اس وقت وہ

پورے دعوے کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ یہ شہریار کی طاقت نہیں تھی بلکہ کوئی اور قوت تھی جس نے شہریار کے ساتھ ساتھ عمران کو بھی اٹھا دیا۔ شہریار کے قدم اس لڑکی کی جانب اٹھ گئے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ اس لڑکی کی میز کے پاس پہنچ گیا۔ عمران نے بھی اسے دیکھا' شہریار تو خیر اس کے زیر اثر آ ہی گیا تھا' لیکن لڑکی کو دیکھ کر عمران کو بھی اپنے جسم میں نامعلوم وحشت کا احساس ہوا۔ اس کے جسم میں دہشت کی لہریں اٹھ رہی تھیں اور رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ حسینہ کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا اور اس کے علاوہ کوئی عورت اسے حسین نظر آ ہی نہیں سکتی تھی لیکن اس لڑکی کو دیکھ کر اس کے دل میں عجیب وغریب صورت حال پیدا ہو گئی تھی اور وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکی کے نقوش اتنے دلکش اور حسین تھے کہ اسے دیکھ کر کوئی بھی بہک سکتا تھا لیکن اس کی قربت سے ایک خوف کا تصور بھی ابھرتا تھا۔ وہ ذرا الگ ہی قسم کی چیز تھی اور عمران اپنے آپ کو ان تصورات سے الگ نہیں کر پا رہا تھا۔ لڑکی نے اپنا خوبصورت چہرہ اٹھا کر شہریار کی طرف دیکھا تو عمران کو اس عورت کی چمکدار آنکھوں میں دوسروں کو مسخر کر لینے کی بے پناہ قوت کام کرتی دکھائی دی ادھر شہریار بھی عجیب سے انداز میں اس لڑکی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ دونوں کچھ لمحے پلکیں جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر اچانک ہی لڑکی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آیئے تشریف رکھیئے۔ آپ لوگوں سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا خوبصورت ہاتھ شہریار کے ہاتھ میں دے دیا اور اس سے ہاتھ ملانے کے بعد اس نے اپنا وہی ہاتھ عمران کی جانب بڑھایا اور عمران کو یوں لگا جیسے اس نے دہکتے انگاروں پر انگلیاں رکھ دی ہوں۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ایک طرف کو ہو گیا۔

لڑکی نے دونوں کو اپنے پاس بیٹھنے کی پیش کش کی۔ شہریار تو فوراً ہی بیٹھ گیا لیکن عمران تھوڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ اس کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا......

''یہ سب کچھ اچانک ہی ہوا تھا۔ عمران کے ذہن سے یہ بات ابھی تک نہیں نکلی تھی کہ وہ ایک پراسرار حویلی میں داخل ہوئے تھے۔ عمران کا دل چاہ رہا تھا کہ شہریار کو سمجھائے کہ اس پراسرار دنیا سے ہوشیار رہنا بہت ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی مشکل

پیش آجائے اور وہ اپنے مقصد سے بھٹک جائیں۔ یہ بات بھی عمران کے ذہن میں بار بار آرہی تھی کہ وہ جن جو حسینہ کو لے کر چلا گیا ہے ہر ممکن کوشش کرے گا ہم اپنی منزل نہ پاسکیں اس سے بھی بچنا تھا۔ یہ تمام باتیں بڑی غور طلب تھیں لیکن اس لڑکی کی قربت ان کے حواس چھیننے کے درپے تھی۔ عمران نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ اس کے جسمانی نقوش میں بھی بے پناہ دلکشی تھی لیکن نزاکت نام کو نہیں تھی۔ سنگ مرمر کی طرح سفید ہاتھوں کی انگلیاں غیر معمولی طور پر لمبی تھیں جن میں ہیرے کی انگوٹھیاں ان کے حسن کو دوبالا کر رہی تھیں۔ آواز میں ایک خاص خوبصورتی اور روح کے اندر اتر جانے والا اثر تھا وہ اپنے سامنے والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی عادی تھی۔ اس کی نگاہیں بدستور شہریار کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور عمران کو یوں لگ رہا تھا جیسے شہریار اس عورت کی نگاہوں کا شکار ہو کر پتھر کا بت بن گیا ہو۔ لڑکی دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

''آپ لوگ بالکل خاموش ہیں؟'' شہریار جیسے خواب سے چونکا ہو۔ اس نے آہستہ سے کہا......

''آپ کی موجودگی میں زبان ساتھ ہی نہیں دے رہی......''

''آپ کیسے ہیں یہ بتائیے......''

''جیسے بھی ہیں آپ کے سامنے ہیں، صحیح فیصلہ تو آپ ہی کر سکتی ہیں۔'' شہریار نے برجستہ کہا......

عمران کو یہاں بھی حیرت ہوئی۔ شہریار ایک سیدھا سادہ، شرمیلا انسان تھا اس نے کبھی اس طرح کھل کر لڑکیوں سے بات نہیں کی تھی لیکن اب یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی زبان ہی بدل گئی ہو، وہ بہت زیادہ خوش و خرم نظر آرہا تھا......لڑکی ہنسنے لگی اور بولی......

''آپ بہت اچھے ہیں......کہاں رہتے ہیں......؟''

''تھوڑا دور رہتے ہیں یہاں سے۔'' شہریار نے جواب دیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے گھر کا پتہ بھی بھول گیا ہو۔ لڑکی بہت دیر تک ان سے باتیں کرتی رہی۔ عمران کو احساس ہوا کہ اس کی باتوں میں بڑی جاذبیت ہے اور یقینی طور پر وہ کسی کو بھی پوری طرح قبضے میں لے لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس نے کہا۔

''میں تھوڑی دیر بعد آپ سے ملوں گی' آپ لوگوں کو یہیں میرا انتظار کرنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھی اور خوبصورت انداز میں چلتی ہوئی ہال سے باہر نکل گئی اس کے جاتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے کوئی طلسم ٹوٹ گیا ہو۔ شہریار نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا۔

''یہ کیا ہوا؟ عمران نے شہریار کی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

''خیریت کیا بات ہے......؟''

''خدا کی پناہ' یہ لڑکی تھی یا جہنم کا شرارہ......''

''یہ کیا کہہ رہے ہو شہریار؟ تھوڑی دیر پہلے تو تم اس سے اس طرح گھل مل کر باتیں کر رہے تھے جیسے تمہاری برسوں کی شناسائی ہو......''

''میری طرف سے کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو میرے دوست! مجھے یوں لگا تھا کہ جیسے میں کسی عجیب سے چکر میں پھنس گیا ہوں۔ میری سمجھ میں خود نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے؟ اور کیا ہو رہا ہے......؟''

''شہریار کیا کریں' اٹھیں یہاں سے......؟''

''آؤ اٹھو۔'' اور دونوں اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ویسے عمران کو اس لڑکی کے لمس کا احساس تھا جیسے کسی شدید گرم چیز کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ایک انسانی جسم کیا اس قدر گرم ہو سکتا ہے کہ اسے چھونے سے ہاتھ جل جائے؟ یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔

وہ اسی دروازے سے ہال سے باہر نکلے جس سے گزر کر اندر پہنچے تھے۔ لیکن یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اِدھر کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ اب وہاں وہ انسانی ڈھانچہ موجود تھا نہ کوئی اور...... بلکہ یہ ایک بڑا سا کشادہ کمرہ تھا جس میں بستر لگے ہوئے تھے' یوں لگتا تھا جیسے کسی نے مہمانوں کے لئے خاص انتظام کیا ہو۔ اس وسیع و عریض کمرے میں ایک میز بھی لگی ہوئی تھی جس پر بہت ہی خوبصورت چینی کے برتن رکھے تھے جو ڈھکے ہوئے تھے۔ میز کے برابر ایک کارنر تھا جس پر لمبی لمبی شمعیں روشن تھیں جن کی روشنی سے پورا کمرہ منور ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ شہریار نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑتے ہوئے کہا۔

''خدا کی قسم! کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے میرا سر ٹینشن سے پھٹ جائے گا اور میرے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔''

''دیکھو شہریار' بار بار یہ کہتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے کہ ہم لوگ ایک طلسمی جال میں پھنسے ہوئے ہیں' اور یہاں ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے' ہم لوگ اس وقت مصیبت زدہ ہیں اور صرف ایک ہی چیز ہمیں اس مصیبت سے نکال سکتی ہے اور وہ ہے ہمت......''

''عمران میرا تو خیال ہے کہ ہمیں اس حویلی سے باہر نکل جانا چاہیے! کیا سمجھے......؟''

''یہاں میں تم سے اتفاق نہیں کرونگا' شہریار' میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ مجھے میری آگ میں جلنے دو' میں اس آگ میں جل کر خاکستر ہو جانا چاہتا ہوں' میں نے تم سے درخواست کی تھی کہ تم میرے ساتھ نہ چلو'' عمران نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ شہریار نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

''کیا کروں ذہن بار بار بے قابو ہو جاتا ہے' دل یہ باتیں کرنے کو نہیں چاہتا مگر زبان کر دیتی ہے۔ میرے دوست! حقیقت وہی ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ آئندہ ایسی کوئی بات نہیں کہوں گا......''

''نہیں یار! واقعات ایسے ہی پریشان کر دینے والے ہیں کہ انسانی ذہن بھٹک جاتا ہے ویسے میرا ذہن اب اسی لڑکی کی جانب جا رہا ہے...... وہ کہہ کر گئی تھی کہ ابھی آتی ہوں لیکن آئی نہیں......''

''چھوڑو ہمیں کسی ایسی بات سے کوئی غرض نہیں جو ہمارے لئے بے مقصد ہو۔ اب اس بات میں تو کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ جو خواب ہم دونوں نے ایک ساتھ دیکھے ان سے ہی ہماری رہنمائی ہوئی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے......لیکن وہ برفانی علاقہ......وہ کہاں غائب ہے......؟''

''اس کا پتہ اس حویلی سے ہی چلے گا میرا دل یہ گواہی دیتا ہے۔ آؤ ذرا باہر نکل کر دیکھتے ہیں کہ باہر کی دنیا کیا ہے......؟'' عمران نے شہریار کو دلاسہ دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ عمران اس وقت شہریار سے زیادہ باہمت ثابت ہو رہا تھا۔ رشتوں کا تو خیر کوئی تعین ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کسی کے دل میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ عمران کے دل میں اپنی محبوبہ اور بیوی کا پیار تھا تو

شہر یار بھی ایک بہن کا بھائی تھا۔ دونوں اپنی اپنی آگ میں جلتے ہوئے گھر بار چھوڑ کر نکل آئے تھے۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے تھوڑی سی دیر میں حویلی کا نقشہ ہی بدل گیا ہو۔ یہ جناتی حویلی اپنے اندر نجانے کیسے کیسے راز چھپائے ہوئے تھی۔ وہ دنیا جس سے وہ ابھی باہر نکل کر آئے تھے اس پراسرار حویلی کی دنیا تو نہیں معلوم ہوتی تھی وہ تو کسی جدید شہر کا جدید انداز کا ہال نما کمرہ تھا جہاں اور بھی بہت سے افراد موجود تھے۔

''ایک غلطی ہوگئی!'' اچانک ہی شہر یار نے عمران سے کہا اور عمران چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''کیا......؟''

''ہم صرف اس لڑکی کے جال میں پھنس کر رہ گئے وہاں دوسرے لوگ بھی موجود تھے ہم ان سے رابطہ کرتے تو پتہ نہیں ہم پر کیا کیا انکشافات ہوتے۔''

''چھوڑو جو گزر گئی' وہ گزر گئی' ادھر دیکھو یہاں تو ماحول ہی بدل گیا ہے ایسا لگتا ہے جیسے سارے دروازے بند ہوگئے ہوں۔'' اچانک عمران چونک پڑا اس نے کہا۔''

''شہر یار! اس حویلی میں اور تمہارے گھر کے اُس کمرے میں ایک بات بالکل ایک جیسی محسوس ہو رہی ہے۔'' شہر یار سوالیہ نگاہوں سے عمران کو دیکھنے لگا تو عمران نے کہا۔

''جب میں نے وہاں کے ماحول سے گھبرا کر نکلنا چاہا تو بالکل اسی طرح میری واپسی کے تمام راستے بند ہوگئے تھے اور اس کے بعد مجھ پر طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہونے لگی۔ پھر میں وہاں سے کیسے باہر نکلا میں نہیں جانتا' البتہ یہ بات تمہارے علم میں بھی ہے کہ میں بے حواسی کے عالم میں سائیں جیون کے مزار کے سامنے بیٹھا ہوا تھا......''

''ہاں مگر اس سے کوئی ایسی بات سامنے نہیں آتی جو کوئی ٹھوس اور بنیادی حیثیت رکھتی ہو......''

''سوال پھر یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کریں کیا......؟''

''آؤ واپس اسی کمرے میں چلیں......''

''آؤ۔'' اور اس کے بعد دونوں دوست اس کمرے میں واپس آگئے' یوں لگ رہا

تھا جیسے پراسرار قوتیں یہی چاہتی ہوں کہ وہ اس کمرے میں آ کر آرام کریں وہ دونوں اندر آنے کے بعد کرسیوں پر بیٹھ گئے جو ایک طرف رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں بڑا سلیقہ تھا' یہ کسی پرانی حویلی کا کمرہ تو معلوم نہیں ہوتا تھا' یوں لگتا تھا جیسے کسی نے خاص طور سے مہمانوں کے لئے آراستہ کیا ہو' وہ دیر تک اس کو دیکھتے اور سوچتے رہے پھر شہریار نے کہا۔

''یار! ذرا دیکھو تو سہی میز پر جو برتن ڈھکے رکھے ہیں ان میں کیا ہے؟'' عمران ہنس دیا پھر بولا۔

''زندگی کی ضرورتیں کسی طرح ختم نہیں ہونی چاہئیں چاہے حالات کیسے ہی پیش آئیں' مجھے بھوک لگ رہی ہے کاش ان میں کھانے کی ایسی چیزیں موجود ہوں جنہیں کھایا جا سکے۔

وہ میز کے پاس پہنچ گئے جب انہوں نے ان قابوں کو کھولا تو ان پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ گئے۔ قابوں میں بہت ہی عمدہ اور لذیذ قسم کا کھانا موجود تھا جس سے دھوئیں کی لکیریں اٹھ رہی تھیں حالانکہ پتہ نہیں کب سے یہ کھانا رکھا ہوا تھا لیکن اب بھی گرم ہی تھا۔ بظاہر اس کے گرم ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی یوں لگتا تھا جیسے کسی نے ابھی ابھی اسے ان قابوں میں نکالا ہو' عمران نے مسکراتے ہوئے شہریار سے کہا۔

''کیا خیال ہے پراسرار قوتوں کی دی ہوئی اس دعوت کو قبول کر لیں یا......؟''

''رزق اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے جس طرح سے بھی مل جائے اور اگر اس میں بھی کوئی ایسی چیز پوشیدہ ہے جو ہمارے لئے نقصان دہ ہے تو ہوتی رہے اب جب یہاں سب کچھ بے بسی کی نذر ہو گیا ہے تو پھر ہمیں اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔'' دونوں نے قابیں کھول لیں' پلیٹیں سامنے کیں اور پھر انہوں نے جو کھانا کھایا اس کے بارے میں یہی کہہ سکتے تھے کہ اس سے عمدہ کھانا انہوں نے پہلے کبھی نہ کھایا تھا۔

سنا ہے ذہنی بحران کے عالم میں بھوک بھی بڑھ جاتی ہے اور پھر کھانا لذیذ ہو تو انسان سب کچھ بھول جاتا ہے' چنانچہ وہ کھانے پر اس طرح ٹوٹے کہ قابیں خالی ہوتی چلی گئیں انہوں نے اتنا کھایا کہ اس کے بعد کوئی گنجائش نہیں رہی۔ پھر دونوں ہی چونکے...... عمران شہریار کو دیکھ کر ہنس پڑا اور بولا۔

''ایسا لگتا ہے جیسے ہم اس حویلی میں کھانا کھانے ہی آئے تھے۔'' اور شہریار بھی

ہنسنے لگا اور پھر بولا۔

''یار! میں تو بہت زیادہ کھا گیا......''

''اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ اب اٹھ جاؤ یہاں سے۔'' عمران نے کہا اور سامنے رکھے ہوئے جگ سے پانی نکال کر پینے لگا مگر صحیح معنوں میں پانی کی گنجائش ہی نہیں تھی وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور پھر عمران نے کہا۔

''اور اب جب معزز میزبانوں نے ہمارے لئے ہر طرح کی آسائش کا بندوبست کر دیا ہے تو تھوڑی دیر نیند ہی کیوں نہ پوری کر لیں۔'' یہ کہہ کر دونوں بستروں کی جانب بڑھ گئے۔

بستر بھی بہت آرام دہ تھے وہ لیٹ کر ماحول کا جائزہ لینے لگے۔ وہ لیٹ تو گئے تھے اور نیند بھی غالب تھی لیکن پلکوں نے ایک دوسرے کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور وہ اپنے بارے میں سوچنے لگے۔ وقت آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا' معاً کمرے میں مدھم مدھم روشنی چھن چھن کر آنے لگی اور وہ چونک اٹھے۔ کافی دیر کے بعد کوئی تحریک ہوئی تھی۔ کون ہوسکتا ہے......؟ ان کی نگاہیں دروازے کی جانب اٹھ گئیں' لیکن دروازے پر کسی طرح کی کوئی جنبش نہیں تھی البتہ روشنی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے کمرے کے اندر چاند نکل رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ایک مدہوش کن خوشبو بھی کمرے میں در آئی دونوں خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے۔ پھر شہریار کی نگاہ ایک جانب اٹھ گئی اور پورا بدن پسینے میں نہا گیا۔ جو اس نے دیکھا پتہ نہیں عمران نے دیکھا تھا یا نہیں۔ کمرے میں ایک طرف کرسی پر وہی پُر اسرار لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔

شہریار نے ایک بار پھر عمران کی طرف دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ اس کی نگاہیں بھی اُسی کی جانب ہیں۔ لڑکی خاموشی سے بیٹھی ہوئی دور خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ دونوں نے چاندنی میں اس کے چہرے کو سکڑتے ہوئے دیکھا لڑکی کے ہاتھ پیروں نے لرزنا شروع کر دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی خاص عمل کے تحت وہ ہل رہی ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کا حسن بھی غارت ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے اس کا گوشت اندر ہی اندر گل کر کہیں گم ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا چہرہ سوکھ کر چمڑہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر اب ہلکی ہلکی زردی مائل روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ اس کی کھوپڑی سکڑ کر بالکل مختصر ہو چکی تھی اندر کو دھنسی ہوئی نیلی

آنکھیں اس وقت زرد اور بے نور معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کی پتلیاں خوف ناک انداز میں اندر ہی اندر حرکت کر رہی تھیں ناک اور کان بھی بڑی حد تک مسخ ہو چکے تھے‘ پھٹے ہوئے ہونٹوں میں سے لمبے لمبے سفید دانت جھانکنے لگے تھے‘ چاندنی بدستور اس کا احاطہ کیئے ہوئے تھی‘ یکا یک اس کے ڈھانچے میں جنبش ہوئی اور مدھم سی آواز کمرے میں گونجی۔

”تم لوگ سو رہے ہو......؟ سو رہے ہو تم......؟ دیکھو سورج کس طرح ڈھلتا ہے۔ دیکھو چاندنی کس طرح ویران ہو جاتی ہے۔ دیکھو زندگی کس طرح موت کی تربت میں سماتی ہے۔ آہ تم مجھ سے اتنا فاصلہ کیوں اختیار کیئے ہو؟ کہاں ہو تم؟ میرے پاس آؤ۔ مجھے اپنے بدن کا لمس دو۔ میں آخری خواہش کا اظہار کر رہی ہوں۔ آ جاؤ کہاں ہو تم؟“ اس کی آواز اس ماحول میں اس قدر بھیانک لگ رہی تھی کہ دونوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ معاً جیسے تیز ہوا چلنے لگی ہو کھڑکیاں کھلنے اور بند ہونے لگیں اور چاندنی کا عمل مختصر ہونے لگا۔ دروازے کھڑکیاں اب باقاعدہ ایک آواز سے بج رہے تھے جیسے بینڈ دھن بکھیر رہا ہو۔

عمران اس ہولناک منظر سے اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ دوبارہ مسہری پر گر پڑا۔

اچانک وہ لڑکی جو اب ڈھانچے میں تبدیل ہو چکی تھی، اپنی جگہ سے اٹھی اور لڑکھڑاتی کڑکڑاتی سست قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی...... جیسے ہی وہ کمرے سے باہر نکلی ہر قسم کی چیخ و پکار، طوفانی ہوائیں اور کھڑکیوں دروازوں کا بجنا بند ہو گیا۔ کمرے میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا تھا اور چاندنی اس طرح سمٹ سمٹ کر کھڑکیوں سے باہر جا رہی تھی جیسے وہ کوئی پگھلا ہوا سونا ہو جو اپنا کام کر کے واپسی کا سفر اختیار کر رہا ہو۔ کچھ لمحوں کے بعد مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔

”عمران......! تم......تم جاگ رہے ہو......؟“

”تم جاگنے کی بات کر رہے ہو دوست! میرا آدھا خون خشک ہو چکا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے شہریار......؟ یہ کیا ہو رہا ہے......؟“

”پتہ نہیں! کیا میں تمہارے پاس آ جاؤں......؟“

”آ جاؤ۔“ عمران نے کہا اور شہریار اپنی جگہ سے اٹھ کر عمران کے پاس چلا گیا۔

”اب تو سب کچھ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے......“

''نہیں شہریار! میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہاں سے ہم کچھ لے کر ہی نکلیں گے......''

''یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ حویلی کے بارے میں یہ سنا ہے کہ پورے چاند کی رات کو نمودار ہوتی ہے۔ کیا خیال ہے جتنا وقت ہمیں گزر چکا ہے اس میں چاند ڈھل نہ گیا ہوگا......''

''اس پراسرار حویلی میں آنے کے بعد باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ کٹ چکا ہے۔ شہریار! ہم اب اس حویلی کے مہمان ہیں......''

''اور ہمارا میزبان کون ہے......؟''

''پتہ نہیں!''

عمران نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ شہریار اس کے پاس لیٹ گیا۔ دونوں پہلو بہ پہلو خاموش لیٹ گئے۔ اور پھر شاید نیند کی دیوی کو ان پر رحم آ گیا تھوڑی دیر بعد کمرے کی فضا دونوں کے ہلکے ہلکے خراٹوں سے گونج رہی تھی۔

غالباً وہ سورج کی کرنیں تھیں جنہوں نے کسی رخنے سے اندر داخل ہو کر انہیں بیدار کیا تھا۔ پہلے عمران جاگا۔ اس نے برابر لیٹے ہوئے شہریار کو دیکھا جو بچوں کی طرح اس کی آغوش میں سو رہا تھا۔ شہریار حسینہ کا بھائی تھا اس کے چہرے کے نقوش حسینہ سے ملتے تھے۔ عمران کے دل میں ایک بار پھر حسینہ کی محبت امنڈ آئی منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن دل سے آواز ابھری۔

''حسینہ! تمہاری تلاش میں مجھے دنیا کے آخری گوشے تک بھی جانا پڑا تو میں گریز نہیں کروں گا...... اس کی آنکھوں کے کٹوروں سے آنسو ٹپکنے لگے...... آنسو شاید شہریار کے چہرے پر بھی جا پڑے۔ شہریار نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا لیکن عمران جلدی سے خود کو سنبھال کر اُٹھ گیا۔

''اُٹھ جاؤ دوست دن نکل چکا ہے۔''

''کیا ہم اسی پراسرار حویلی میں ہیں؟'' شہریار نے سوال کیا۔

''ہاں وہی کمرہ ہے۔'' عمران بولا۔ شہریار اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ اچانک اسے ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا اور اس نے چونک کر عمران کی طرف دیکھا۔

''عمران! وہ دیکھو ادھر......'' عمران بھی اس دروازے کی جانب دیکھنے لگا اور پھر

اس کی آواز ابھری۔

''یار یہ دروازہ رات کو تو نہیں تھا۔'' شہریار کچھ دیر خاموش رہا پھر اس کے منہ سے ایک مدھم سی ہنسی نکلی اور وہ بولا۔

''میں ذرا اس دروازے کو کھول کر دیکھوں۔''

پھر شہریار اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور اس دروازے کے قریب پہنچ کر دروازہ کھولا اور اندر جھانک کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''کیوں کیا ہے؟'' عمران نے سوال کیا۔

''واش روم۔''

''اچھا! میں ذرا واش روم ہو آؤں۔'' شہریار بولا۔

''ہاں جاؤ۔ حالانکہ دل نہیں چاہتا کہ ہم ایک لمحے کے لئے بھی جدا ہوں۔''

''یار اب تو ہر طرح کے حالات کو برداشت کرنا پڑے گا۔'' شہریار نے کہا اور واش روم چلا گیا۔ عمران باہر بیٹھا حالات پر غور کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی والدہ اور بہن اس کے لئے کس قدر مضطرب ہوں گی اس کا دل سینے کے اندر پھڑ پھڑا رہا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کسی طرح انہیں اپنی خیریت کی خبر دیں۔ وہ تو یہ سوچ کر گھر سے نکلا تھا کہ اب یا تو حسینہ کے ساتھ واپس آئے گا یا پھر کبھی نہیں یا پھر...... باقی ساری باتیں پیچھے رہ جاتی ہیں...... اندر سے پانی گرنے کی آواز ابھرتی رہی اور تھوڑی دیر بعد شہریار مسکراتا ہوا غسل خانے سے باہر نکل آیا......

''یار! تم یقین کرو نہانے کا وہ لطف آیا ہے کہ بتا نہیں سکتا۔''

''میں بھی جا رہا ہوں۔'' عمران نے کہا اور غسل خانے میں چلا گیا۔ شہریار خاموشی سے بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا تب اس کی نگاہ اس میز کی جانب اٹھ گئی جس پر رات کو انہوں نے کھانا کھایا تھا اور وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ میز پر نئے برتن رکھے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی چائے کا سامان بھی۔ ایک بڑی سی کیتلی سامنے رکھی تھی اور اس کی ٹونٹی سے دھوئیں کی پتلی لکیر نمودار ہو رہی تھی۔ شہریار کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ایک لمحہ پہلے ہی میز بانوں کو یاد کیا تھا اور اب ان کے لئے ناشتے کا سامان موجود تھا۔

اسی اثناء میں عمران بھی واش روم سے نکل آیا۔

اور ناشتہ کو دیکھ کر مسکرا دیا تھا اور آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی۔

''آؤ جلدی آؤ۔ چائے کی خوشبو مجھے پاگل کیے دے رہی ہے۔''

شہریار نے کہا اور دونوں ناشتے کی میز پر پہنچ گئے۔

''میں یہ سوچ رہا تھا کہ جب سے ہم اس حویلی میں آئے ہیں' ہمیں کوئی جسمانی نقصان نہیں پہنچا' یہ الگ بات ہے کہ ذہنی جھٹکے شدید لگے ہیں اور اس حویلی کے پراسرار مکین جو نظر نہیں آتے ہماری بھرپور معاونت بھی کر رہے ہیں۔

ناشتے سے فراغت پا کر دونوں اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ عمران نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب تو اپنے ان میزبانوں سے محبت ہوتی جا رہی ہے جنہوں نے ابھی تک ہمیں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچایا اور مسلسل میزبانی میں بھی مصروف ہیں۔'' شہریار بھی ہنسنے لگا اس نے کہا۔

''ظاہر ہے رات بھر آرام کیا ہے' سکون کی نیند سوئے ہیں' دیکھیں تو سہی آگے کیا ہوتا ہے۔

''آؤ......!'' اور اس کے بعد دونوں کمرے سے باہر نکل آئے جو سب سے پہلا اور سامنے کا دروازہ انہیں نظر آیا وہ اس میں داخل ہو گئے۔ یہ بھی ایک کمرہ تھا بہت زیادہ وسیع تھا لیکن اسے اتنا صاف ستھرا اور ٹھنڈا دیکھ کر انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ کمرے میں ایک نامعلوم روشنی پھیلی ہوئی تھی جس میں کمرے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ ان کی نگاہ کارنس کی جانب اٹھ گئی جس پر یہ موم کے بنے ہوئے دو زنانہ پیر رکھے ہوئے تھے۔ ان کا فاصلہ ان گھنگھروؤں سے زیادہ دور نہیں تھا جو ان سے تھوڑے فاصلے پر رکھے ہوئے تھے' سونے کے خوبصورت گھنگھرو جو چمک رہے تھے' کچھ ایسا منظر تھا کہ دونوں حیران ہو کر اس کے قریب پہنچ گئے' انہوں نے انہیں غور سے دیکھا اور عش عش کر اٹھے۔ دونوں پاؤں ٹخنوں کے اوپر سے کٹے ہوئے تھے اور بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے انہیں چند لمحے قبل کسی انسانی جسم سے کاٹا گیا ہو۔ ناخن مہندی سے رنگے ہوئے تھے' دونوں شدت حیرت سے منہ کھولے ان پیروں کو دیکھتے رہے اور پھر ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔

''دیکھ رہے ہو! بالکل یوں لگ رہا ہے جیسے انہیں ابھی ابھی انسانی جسم سے کاٹا گیا ہو۔''

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہاں کی موجود چیزوں کا مقصد کیا ہے......''

''آؤ دیکھتے ہیں۔'' وہ کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔

اب انہیں ایک دروازہ نظر آیا جو کھلا تھا......

دروازہ اتنا بلند نہیں تھا کہ وہ سیدھے اس سے اندر داخل ہو سکتے۔ چنانچہ انہیں کافی جھک کر اس سے اندر داخل ہونا پڑا۔ دوسری جانب سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو نیچے جا رہی تھیں اور حیرت انگیز طور پر روشن تھیں۔ سارا منظر صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ کل آٹھ سیڑھیاں تھیں جن سے وہ نیچے اتر گئے۔ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ آتش دان میں آگ روشن تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اسے تھوڑی دیر پہلے استعمال کر رہا ہو۔ پھر انہیں ایک رقاصہ نظر آئی۔ مجسمہ بہت ہی خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ اس کے نزدیک ہی ایک لیمپ روشن تھا۔ مجسمے کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ رقص کے زاویہ میں لڑکی کا قدم آدم مجسمہ۔ دونوں حیرت میں گم مجسمے کا حسن دیکھ رہے تھے کہ اچانک ایک پورا مضبوط ہاتھ جس کی انگلیوں میں بہت سی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں عالمِ غیب سے ظاہر ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر مجسمے کو دبوچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی مومی مجسمے کی رقاصہ چیخنے لگی۔

''بچالو......آہ مجھے بچالو......بچالو مجھے......بچالو......مجھے بچالو......''

وہ ہاتھ مجسمے کو گھسیٹتا لے گیا۔ اس کے بعد سکوتِ مرگ چھا گیا۔ عمران اور شہریار ان واقعات کے اس قدر عادی ہوتے جا رہے تھے کہ ان کو وقتی خوف محسوس ہوتا لیکن وہ جلد ہی نارمل ہو جاتے۔ دیر تک وہ اس تہہ خانے کا جائزہ لیتے رہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے تہہ خانے کی دیواروں کو رنگ کر کے کوئی خاص بات چھپانے کی کوشش کی گئی ہو۔ بہت دیر تک وہ یہاں گھومتے رہے اور پھر واپسی کے لئے قدم بڑھائے۔ اوپر نکلتے ہی پھر چیخوں کی صدائیں سنائی دیں۔ ایک ہولناک آواز ابھری۔

''ناچو......'' یہ وہی جگہ تھی جہاں انہوں نے کٹے ہوئے پاؤں دیکھے تھے۔ اس وقت ان کے اندر کی زندگی بیدار ہو گئی تھی اب وہ متحرک تھے۔ گھنگھرو ان پیروں میں پہنچ چکے تھے۔ سونے کے گھنگھرو جن سے انتہائی نفیس اور باریک آواز نکل رہی تھی اور وہ پاؤں اس

طرح رقص کر رہے تھے جیسے زبردست طاقت ان کے اندر سما گئی ہو۔ اس انوکھے رقص کو دیکھتے رہے انہیں ایک عجیب سی تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر وہ اس منظر کو اِسی طرح چھوڑ کر باہر نکل آئے اور ایک جگہ خاموش بیٹھ گئے۔ جب خاموشی لمبی ہونے لگی تو شہریار نے کہا۔

''مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہم اس حویلی کے قیدی ہوں اور ہماری موت یہیں لکھی ہوئی ہو۔'' اور عمران اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگا' پھر بولا:

''کاش شہریار! تم میرے ساتھ نہ آتے......''

''کیسی باتیں کر رہے ہو عمران' تم میری بہن کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگائے ہوئے ہو اور میں بے حسوں کی طرح اپنے گھر میں آرام کی نیند سو رہا ہوتا......

''مت بھولو کہ حسینہ تمہاری بہن ہی نہیں میری بیوی بھی ہے۔''

ابھی عمران کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ انہیں ایک خوفناک قہقہہ سنائی دیا' یوں لگا کہ قہقہہ برابر والے کمرے میں لگایا گیا ہو۔ قہقہہ انتہائی بھیانک تھا اور اس کی گونج دیر تک سنائی دیتی رہی۔ قہقہے کے جو اثرات عمران پر مرتب ہوئے وہ حیران کن تھے۔ دفعتاً عمران کے حلق سے ایک وحشت ناک اور خوفزدہ کر دینے والی آواز نکلی۔

''کیا چاہتے ہو تم؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟ کون ہو تم؟ سامنے آکر بات کرو۔ میں کہتا ہوں کون ہو تم؟ کیا قوتیں ہیں تمہارے پاس؟ یہ چوہے بلی کا کھیل کیوں کھیل رہے ہو؟ آؤ مقابلہ کرو مجھ سے۔ آؤ میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں۔ مجھے شکست دے دو یا خود تم شکست قبول کر لو۔ یہ کھیل مت کھیلو۔ سامنے آؤ...... آؤ...... آؤ......'' عمران دوڑنے لگا۔ شہریار کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ پورے بدن میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں عمران پر جو وحشت طاری ہوئی تھی وہ انتہائی خوفناک تھی اور وہ ایک لمحے کے لئے بھی عمران کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

عمران ایک راہداری میں دوڑتا رہا اور پھر ایک بند دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے دروازے پر زوردار لات ماری اور دروازہ ایک تیز آواز کے ساتھ کھل گیا۔ عمران اندر داخل ہو گیا۔ شہریار بھی پیچھے نہیں رہا تھا۔ وہ ایک وسیع و عریض کمرے میں پہنچ گئے جہاں زمانہ قدیم کا فرنیچر پڑا تھا۔ فرنیچر قیمتی تھا لیکن گرد کی ایک دبیز تہہ اس پر جمی ہوئی تھی۔ اونچی چھت کے درمیان ایک بہت بڑا فانونس لٹکا ہوا تھا۔ دیوار کے چاروں طرف لکڑی کے قیمتی

فریموں میں بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔ کمرے میں مدھم سی زرد روشنی پھیلی تھی اور اس میں بڑی ٹھنڈک تھی۔ کچھ ہی لمحوں بعد اس کی فضا آہستہ آہستہ گرم ہونے لگی ساتھ ہی روشنی بھی بڑھ گئی۔ دونوں حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ان کے سامنے کوئی سات فٹ کے فاصلے پر ایک بڑے سے آتش دان میں نارنجی شعلے بلند ہو رہے تھے۔ گرمی شاید انہی شعلوں کی تھی۔ آتش دان پر بنے ہوئے لکڑی کے مینٹل پیس پر بہت ہی خوبصورت اور پرانی طرز کا اونچا شمع دان رکھا تھا جس پر دودھ کی مانند لمبی لمبی شمعیں روشن تھیں۔ دونوں دیر تک کھڑے اس پراسرار شمع دان کو تکتے رہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آتش دان کس نے روشن کیا ہے اور کس لیے شمعیں جلائی ہیں۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے تو ہلکا سا اندھیرا نظر آیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ شہریار عمران کے ہر قدم کا ساتھ دے رہا تھا۔ دونوں اس شمع دان کے پاس پہنچ گئے جس سے روشنی کے ساتھ ساتھ گرمی بھی نکل رہی تھی اور یہ گرمی اس وقت بڑی خوشگوار لگ رہی تھی۔ انہوں نے اس شمع دان کو دیکھا جس میں موم کی بنی شمعیں روشن تھیں۔ ہر شمع کا اونچا شعلہ مسلسل روشن تھا لیکن اس میں ذرا سی جنبش نہیں تھی وہ بالکل ساکت تھا۔ کمرے میں روشن دان کے راستے ہوا کا تیز جھونکا ہوا آتا مگر آتش دان کے شعلے اِدھر اُدھر حرکت نہیں کرتے تھے۔ موم بتیوں کے شعلے بالکل اوپر کی سیدھ میں اٹھ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان پر ہوا کا کوئی اثر نہ ہو رہا ہو۔ ان کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ شہریار خاص طور سے بہت متاثر تھا اور اس کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ عمران آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس نے شمع دان کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔ شہریار نے غور سے دیکھا تو یہ موم بتیاں دراصل شیشے کی پتلی پتلی نلکیوں میں رکھی ہوئی تھیں اور نلکیوں کے سرے اس اندازہ میں اوپر تک اٹھائے گئے تھے کہ ہوا سے ان کے بجھ جانے کا خطرہ نہ رہ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ جنبش کیے بغیر شعلہ جلتا رہتا تھا۔ اچانک ہی انہیں کمرے کے ایک کونے سے بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو اٹھنے کا احساس ہوا۔ عمران نے شہریار کی جانب دیکھا اور ہنس پڑا۔ اب وہ حیرت انگیز طور پر نارمل ہو کر خود کو سنبھال چکا تھا۔

”واہ کمال کے ہیں ہمارے میزبان! احمقانہ طریقے سے ہمیں مخاطب کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں آؤ اور دوستوں کی طرح ہم سے بات کرو۔ کیا چاہتے ہو؟ کیا کرنے کے

خواہش مند ہو؟ جو بھی تمہارا دل چاہتا ہے ہمیں بتاؤ......'' یہ کہہ کر وہ بڑی بے تکلفی سے شہریار کا ہاتھ پکڑ کر اس میز کی جانب بڑھ گیا جس پر کھانے پینے کی بہت ساری چیزیں' پانی کا جگ اور گلاس رکھے تھے۔

کھانے سے فراغت ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ انہیں محسوس ہوا جیسے ان کے کانوں میں کوئی پراسراری آواز آ رہی ہے۔ ہلکی ہلکی سنسناہٹ' جو کچھ دیر کے بعد مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں بدل گئی۔ عمران نے اپنے سر کو دو تین بار زور سے جھٹکا لیکن آواز مسلسل آ رہی تھی جیسے کوئی کمرے میں اڑ رہا ہو لیکن پورے کمرے میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ زن زن......زن زن......زن زن کی آواز مسلسل گونج رہی تھی۔ عمران نے شہریار کی طرف دیکھا اور بولا۔

''تمہیں کوئی آواز سنائی دے رہی ہے......؟''

''ہاں......!''

''مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی ......'' اور یہ اس سامنے والے بند دروازے کے عقب سے آ رہی ہے۔

''ذرا آؤ تو سہی۔'' عمران شہریار کا بازو پکڑ کر تیز رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ عمران نے دروازے کو کھولا تو وہ اتنی آسانی سے کھل گیا جیسے اشارے کا منتظر ہو۔ دوسری طرف ایک وسیع و عریض ہال تھا اِس میں بھی قدیم زمانے کا فرنیچر اور ساز و سامان سجا ہوا تھا البتہ دیواروں پر تصویروں کے بجائے' بارہ سینگوں کے سر' تلواریں اور خنجر ماہرانہ انداز سے لٹکائے گئے تھے۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ اب تیز ہوگئی تھی۔

ہال کے درمیان سے گزرتے ہوئے انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ہر شے زندہ ہو رہی ہو۔ خنجر تلواریں اور لمبے لمبے چھرے' یہاں تک کے بارہ سینگوں کے سر' آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک شمع دان یہاں بھی روشن تھا اور اس کی مدھم روشنی ایک اور دروازے کو نمایاں کر رہی تھی۔ لکڑی کے اس بند مضبوط دروازے پر نہایت خوبصورت نقش و نگار اور بیل بوٹے بنے ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی بنائے گئے ہوں۔ وہ اس دروازے سے آگے بڑھے تو انہیں اندر کی جانب سیڑھیاں نظر آئیں۔

وہ سیڑھیاں انتہائی احتیاط سے طے کرتے ہوئے اوپر پہنچ گئے جہاں انہوں نے خود کو ایک طویل اور نیم تاریک راہ داری میں پایا۔ یہاں انہیں ایک ناگوار سی بُو محسوس ہو رہی تھی۔ عمران اور شہریار نے دور دور تک نگاہیں دوڑائیں تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ اس بدبو کا منبع کہاں ہے۔ راہداری سنسان تھی البتہ اس کے آخری سرے پر بائیں ہاتھ پر ایک کھلا ہوا دروازہ دکھائی دے رہا تھا جس کے آگے سرخ رنگ کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ عمران اور شہریار دبے پاؤں اس دروازے تک پہنچ گئے اور عمران نے ذرا سا پردہ اٹھا کر دوسری طرف جھانکا اور بے اختیار اس کے منہ سے ہلکی سی آواز نکل گئی۔ جیسے اس کی روح سمٹ کر حلق میں آ گئی ہو۔ اس کے جسم کا رواں رواں کانپنے لگا۔ شہریار نے ابھی وہ منظر نہیں دیکھا تھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں تابوت تھا جس میں لاش نظر آ رہی تھی۔ وہ ناقابل برداشت بدبو اسی تابوت سے اٹھ رہی تھی۔ اندر پہنچتے ہی دونوں کے بدن خوف سے کانپ اٹھے۔ شہریار تو کانپتا ہوا عمران سے لپٹ گیا۔ لاش پر ہزاروں کالی آدم خور مکھیاں چمٹی ہوئی لاش کا گوشت ہڑپ کرنے میں مصروف تھیں۔ جیسے ہی انہیں محسوس ہوا کہ کوئی ان کے قریب آیا ہے تو یہ مکھیوں کا غول تابوت سے اٹھا۔ ان کے پروں کی بھنبھناہٹ ایسی لرزہ خیز تھی کہ شہریار پیچھے ہٹنے کی کوشش میں زمین پر گر گیا اور پھر وہ خون آشام مکھیاں ان دونوں کے بدن سے چمٹ گئیں۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے بدن میں باریک باریک سوئیاں چبھو دی گئی ہوں۔ درد کی شدت سے وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے انہوں نے عالمِ وحشت میں ان مکھیوں کو ہاتھ مار مار کر دور کرنا چاہا، لیکن بے سود۔ ان کی نوکیلی پردار ٹانگیں ان کی کھال میں پیوست ہو رہی تھیں۔ بھنبھناہٹ کا شور اتنا بھیانک تھا کہ سارا کمرہ گونج رہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ اس دروازے تک پہنچے جس سے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ درد سے ان کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جسم کے روئیں روئیں سے جان نکلی جا رہی ہو۔ پورا بدن پسینے میں شرابور تھا۔ جیسے ہی وہ کمرے سے باہر نکلے، مکھیاں ان کے جسموں سے غائب ہو گئیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس دروازے سے باہر نہ آنا چاہتی ہوں۔ دونوں کے جسم فرطِ خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ موت اپنی بھیانک شکل میں رقص کر رہی تھی لیکن حیرت کی نہتا یہ تھی کہ ان کے جسم اب کوئی تکلیف محسوس نہ کر رہے تھے۔ پوری حویلی پر ایک حیرت

ناک سناٹا چھایا ہوا تھا سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔

''عمران! یا تو ہم مرجائیں یا پھر اس منحوس حویلی سے باہر نکل جائیں۔''

''نہیں! ہم یہاں سے حسینہ کا پتہ معلوم کرکے ہی نکلیں گے۔ تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔'' عمران نے پُرعزم انداز میں کہا اور اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

''یار! چھوڑو' پہلے بھی کونسا کچھ کرلیا ہے' جواب کریں گے، ہم تو حویلی کے قیدی بن کررہ گئے ہیں۔ آؤ گھومنے پھرنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔'' شہریار کے لہجے میں مایوسی تھی۔

مایوسی گناہ ہے شہریار۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ اگر کچھ پراسرار قوتیں ہماری دشمن ہیں تو کوئی ہمارا دوست اور راہ بر بھی ہے جو ہمارے ساتھ ساتھ ہے۔ کون ہو سکتا ہے؟ وقت آنے پر خود ہی پتہ چل جائے گا۔ آؤ حویلی کی آوارہ گردی جاری رکھیں۔ شاید...... منزل کا نشاں مل جائے۔ اور پھر وہ دونوں مزید آوارہ گردیوں کے لیے حویلی کی راہ داریوں میں گردش کرنے لگے۔ بس یونہی آوارہ گردی۔ چنانچہ بہت سی راہ داریوں اور بہت سے کمروں سے گزرتے ہوئے وہ ایک بڑے دروازے کے پاس جاکر رکے جو بالکل گول تھا اس سے پہلے یہ دروازہ انہیں نظر نہیں آیا تھا...... حویلی کی سب سے بڑی خوبی ہی یہ تھی کہ اس میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی تھیں۔

یہ طلسمی حویلی ان کے حساب سے دنیا کا آٹھواں عجوبہ تھی اور وہ اس عجوبے سے ابھی تک اکتائے نہیں تھے۔

''کیا خیال ہے اس گول دروازے کی دوسری طرف کی سیر کرلی جائے......؟''

''ہاں' آؤ دیکھتے ہیں۔'' عمران نے کہا اور گول دروازے پر لگے ہوئے ہینڈل کو پکڑ کر کھینچا' دروازہ آسانی سے کھل گیا۔ یہ بھی اس حویلی کی خوبی تھی کہ کسی بھی جگہ مشکل نہیں ہوتی تھی اور آسانی سے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آجا سکتے تھے لیکن دروازے کی دوسری طرف ایک خوبصورت ڈھلوان تھی۔ سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا اور گہرائیوں میں چلا گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اترنے لگے' ڈھلوان اتنا زیادہ نہیں تھی کہ انہیں دوڑنا پڑ جاتا اور پھر قالین کی وجہ سے چلنا بھی مشکل نہیں تھا' چنانچہ وہ اس قالین پر چلنے لگے۔ اندر

کا ماحول نہایت خوشنما تھا۔ یہ سرنگ نما ڈھلوان کافی کشادہ تھی اور اس پر چلنے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی لیکن اس کی طوالت نا قابل فہم تھی۔ کوئی پانچ سو قدم کے فاصلے کے بعد راستہ دوسری جانب مڑ گیا۔ ادھر بھی بالکل وہی انداز تھا اللہ جانے یہ قالین کتنا لمبا تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ پھر مزید اتنا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ بائیں طرف بڑھتے راستے پر مڑ گئے۔ ڈھلوان مسلسل نیچے گہرائیوں میں جا رہی تھی لیکن اس کے باوجود یہاں گھٹن کا کوئی احساس نہیں تھا۔ ایک مدھم مدھم روشنی جس کے مرکز کا پتہ نہیں چل رہا تھا ساری سرنگ میں پھیلی ہوئی تھی جس میں نیچے اترنے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی اور ہر چیز صاف صاف نظر آ رہی تھی......

وہ ڈھلوان خاموشی سے طے کرتے رہے انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ کچھ نہیں کچھ نہیں تو وہ ہزاروں فٹ کی گہرائیوں میں پہنچ گئے لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ گہرائی میں مسلسل سفر کرتے ہوئے بھی نہ تو ان کے سانس پھولے نہ گھٹن کا احساس ہوا تھا۔ سب سے بڑی حیرت کی چیز یہ قالین تھا جس میں کوئی جوڑ نظر نہیں آتا تھا۔ بہت دیر تک سفر کرنے کے بعد آخر کار ایک گول دروازے پر جا رُکے۔

''اب کیا کریں......؟''

''اور کیا کر سکتے ہیں سوائے دروازہ کھول کر اندر جانے کے۔'' چنانچہ انہوں نے دروازہ کھولا اور ان کی آنکھیں تیز روشنی سے بند ہو گئیں۔ یہ روشنی سورج کی تھی جو پورا اپنی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ وہ ایک دم خوشی سے سرشار ہو گئے۔ عمران کے منہ سے نکلا۔

''شہریار......!''

''ہاں......''

''ہم حویلی کے دوسرے دروازے پر پہنچ گئے ہیں......؟''

''ہاں ایسا ہی لگتا ہے۔''

''جلدی سے آؤ۔'' وہ دوڑ کر کئی قدم آگے بڑھ گئے۔ انہیں یہ خوف تھا کہ کہیں کوئی اور ایسا واقعہ نہ پیش آ جائے جس کی وجہ سے انہیں واپس حویلی میں داخل ہونا پڑے چونکہ باہر کی فضا سے لگ رہا تھا جیسے اب وہ حویلی کے طلسم سے آزاد ہو چکے ہیں۔ تا حد نگاہ

وسیع وعریض میدان تھا لیکن اس میدان میں بلندی شروع ہوگئی تھی جو زیادہ نہیں تھی لیکن اس کی وجہ سے دوسری طرف کے مناظر نظر نہیں آ رہے تھے۔ شہریار نے اچانک عمران کو پکارا اور وہ چونک پڑا۔

''کیوں کیا بات ہے......؟''

''عمران پیچھے دیکھو۔'' شہریار کی لرزتی ہوئی آواز ابھری اور عمران مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ سورج کی روشنی میں انہوں نے اس حویلی کو دیکھا جسے انہوں نے پورے چاند کی روشنی میں نمودار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ حویلی موم کی طرح پگھل رہی تھی اس کا اوپری حصہ بیٹھ چکا تھا اور پگھلے ہوئے پتھر جو سرخ نہیں بلکہ میلے اور بھدے رنگ کے تھے اور پانی بن کر زمین پر بہتے جا رہے تھے۔ جبکہ زمین پر پہنچتے پانی بھاپ بن کر اُڑ رہا تھا۔ جیسے زمین میں سخت تپش ہو۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ منظر ناقابل یقین اور انتہائی خوفناک تھا۔ حویلی بتاشے کی طرح بیٹھتی چلی جا رہی تھی اور اس کی بلندی کم ہوتی جا رہی تھی، عمران نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''غالباً اب وہ نگاہوں سے اوجھل ہونے والی ہے......''

''اور سورج چمک رہا ہے......''

''ہاں۔''

''مطلب سمجھ رہے ہو......؟''

''کیا!'' عمران نے تعجب سے کہا۔

''گویا ہم جتنا وقت گزار چکے ہیں وہ صرف ایک رات کا تھا۔''

''ارے ہاں! اب تو ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے دن کی روشنی اس حویلی کو نگاہوں سے اوجھل کر رہی ہے۔ وہ لوگ حیرانی سے اس حویلی کو دیکھتے رہے جس کے پانی بننے کی رفتار پہلے بہت آہستہ تھی اور پھر تیز ہونے لگی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ زمین کا حصہ بن گئی۔ اب ان کے سامنے وہی میدان تھا اور اس کی دوسری جانب وہی درخت۔

''یہ وہی جگہ ہے اور واقعی یہ ساری کہانی ایک رات کی تھی۔'' عمران نے کہا۔

''یار واقعی اس منحوس حویلی سے باہر آنا ہی بہت بڑا کام ہے۔ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے

کہ باقی زندگی اسی میں بسر ہو جائے گی اور ہم وہیں دم توڑ دیں گے اور ہماری لاشیں اس حویلی کے کسی کمرے میں پڑی سڑ رہی ہوں گی اور اگر کوئی انسان اس حویلی میں داخل ہوتا تو وہ یہ سوچتا کہ یہ دونوں ڈھانچے پتہ نہیں کس دور کے ہیں۔''

''ایسی دل دہلا دینے والی باتیں مت کرو......''

''میں تمہیں کچھ اور بتا رہا تھا......''

''کیا......؟''

''میں اس کمرے کی بات بتا رہا تھا......''

''کون سے کمرے کی یار......؟''

''کمال کرتے ہو اپنے گھر کا کمرہ بھول گئے ہو؟''

''اوہو......ہاں......اس کمرے کی......''

''جب میں اس کمرے میں داخل ہوا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری آدھی عمر وہیں بیت گئی ہے اور جب میں صبح کو تمہیں سائیں جیون کے مزار کے سامنے ملا تھا۔ تو وہ کہانی ایک رات کی ثابت ہوئی تھی کیونکہ گھر کے تمام معاملات بھی اسی طرح سے تھے جیسے میں چھوڑ کر گیا تھا اور یوں سمجھ لو کہ اور اس وقت حویلی میں بھی ہمیں وہی واقعہ پیش آیا ہے۔''

''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ہم کیا کریں......''

''حویلی سے ہمیں کوئی ایسی بات تو معلوم نہیں ہو سکی جو ہماری رہنمائی کر سکے۔''

''ایک بات پر ذرا غور کرو۔'' شہریار نے عمران کو یاد دلایا۔

''کیا......؟'' عمران نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''جس میدان میں ہم اس درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے وہاں سے ہمیں یہ بلندیاں نظر نہیں آئی تھیں یہ کوئی نئی اور اجنبی جگہ ہے' اب عمران نے بھی اس پر غور کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ واقعی حویلی سے باہر نکلنے کے بعد وہ جس جگہ پہنچے ہیں یہ وہ جگہ نہیں جہاں وہ بیٹھے ہوئے تھے لیکن حویلی اسی جگہ غائب ہوئی تھی اور وہ درخت بھی ویسا ہی نظر آ رہا تھا لیکن یہ تمام طلسمی معاملات تھے ان کے سلسلے میں بھلا کیا کہا جا سکتا ہے......''

دیر تک وہ ان معاملات پر تبصرہ آرائی کرتے رہے پھر عمران نے کہا۔

''اب یہاں سے آگے چلنے کے سوا اور کیا چارہ کار ہے؟''

''ہاں ٹھیک ہے چلو۔'' شہریار نے کسی قدر مایوس لہجے میں کہا اور عمران چونک کر اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

''کیا بات ہے؟ میرے دوست! تھک گئے ہو......؟''

''بار بار یہ سوال مجھ سے کیوں کرتے ہو عمران' حسینہ میری بہن ہے' اپنی بہن کو حاصل کرنے کے لئے اگر مجھے ہزار بار بھی مرنا پڑے تو میں اس عزم اور ارادے سے نہیں ہٹوں گا۔ بس میرا دل عجیب سی الجھن کا شکار ہے......'' شہریار بولا۔

''کیا بات ہے مجھے نہیں بتاؤ گے......؟''

''عمران ہم اس حویلی سے باہر نکل آئے ہیں۔ ہم حویلی کے نمودار ہونے کا انتظار کیوں کر رہے تھے؟''

''اس لئے کہ ہمیں وہاں داخل ہونے کے بعد اس بات کی امید تھی کہ شاید حسینہ کے بارے میں کوئی نشان مل جائے۔''

''مگر ہمیں کچھ بھی تو نہیں ملا......''

''تمہارا خیال غلط ہے۔'' عمران کے الفاظ نے شہریار کو چونکا دیا تھا۔

''کیا مطلب؟''

''ہمیں وہاں سے بہت کچھ ملا ہے، تم نے غور نہیں کیا......؟''

''کیا......؟''

''شہریار یوں سمجھ لو کہ ہم نے ایک مرحلہ عبور کر لیا ہے تم کہتے ہو وہاں سے ہمیں کچھ نہیں ملا مگر میں کہتا ہوں کہ ہمیں بڑی رہنمائی ملی ہے وہاں سے۔ ہمیں وہاں سے یہ پتہ چل گیا ہے کہ کچھ پراسرار قوتیں حسینہ پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور انہوں نے ہمارا راستہ روکنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ قوتیں ایسی بھی ہیں جو ہماری مدد کر رہی ہیں۔'' شہریار سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے کہا۔

''ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو عمران! چلو آؤ چلیں۔'' وہ فاصلہ طے کرتے رہے اور آخر کار ان بلندیوں کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ دوسری طرف کا منظر مایوس کن تھا ادھر ایک

ویران میدان تھا جس میں بڑی بڑی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں لیکن اور ایسی کئی ناہموار ڈھلوانیں تھیں۔ شہر یار نے بے بس نگاہوں سے عمران کو دیکھا اور بولا۔

''اب کیا کریں؟''

''ہم اپنا مقصد کبھی ترک نہیں کریں گے چاہے ایسی ہزاروں مشکلیں ہمارے راستے میں آئیں۔'' ہم نے اس سے بڑے برفانی میدان عبور کیے ہیں تو یہ لق دق جنگل بھی پاٹ لیں گے۔ عمران نے جرأت سے کہا کہ اس کے لہجے نے شہر یار کے بدن میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی تھی چنانچہ وہ چلتے رہے۔ ایک کے بعد ایک ڈھلوانیں طے کرنے کے بعد انہیں پانی کی شرشر آواز سنائی دی۔ اس بے آب وگیا میدان میں پانی کی آواز ایک وہم ہی محسوس ہوتی تھی لیکن جب وہ سامنے نظر آنے والی بڑی چٹان کے پاس پہنچے تو ایک لمحے کے لئے ان کے قدم ساکت ہوگئے۔ چٹان کی اوٹ سے ایک چشمہ پھوٹ رہا تھا اور ایک چھوٹی سی ندی برابر میں بہہ رہی تھی۔ چشمے کا پانی بالکل شفاف تھا۔ وہ ہاتھ منہ دھونے لگے، پانی پیا اور اس کے بعد وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ پانی نے ان کے بدن میں توانائی پیدا کر دی تھی۔ وہ اطمینان کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ چشمہ ایک تیز رفتار نالے کی شکل میں بہہ رہا تھا اور وہ اس کے کنارے کنارے یہ سفر طے کر رہے تھے۔ وقت گزر گیا سورج ڈھلنے لگا تھا اور شام کی خاموشیاں نمودار ہونے لگی تھیں۔

رفتہ رفتہ ماحول پر تاریکی پھیلنے لگی۔ ان کے پاؤں بری طرح دکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے تاریکی میں دو چراغ جلتے ہوئے دیکھے اور انہیں احساس ہوا جیسے کوئی آبادی قریب ہو۔

''اگر ہم آبادی کے قریب پہنچ گئے تو ہوسکتا ہے ہمیں آگے کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے۔''

''اگر ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر سستا لیں تو ہم دوبارہ چلنے کے قابل ہو جائیں گے۔'' شہر یار نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نہیں میرے دوست! اگر ہم بیٹھ گئے تو سمجھ لو اٹھنا مشکل ہو جائے گا۔ چلو تھوڑی ہمت کرو، آگے چلتے ہیں دیکھیں تقدیر اب ہمارے لئے کیا فیصلہ کرتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' شہر یار نے کہا اور دونوں ہمت کر کے آگے بڑھنے لگے! عمران کو

احساس ہو رہا تھا کہ ماحول بدلتا جا رہا ہے' سنگلاخ اور بے آب و گیا چٹانیں اب سرسبز و شاداب علاقے میں تبدیل ہونے لگی تھیں۔ کہیں کہیں درخت بھی جھومتے نظر آنے لگے تھے۔ اس دوران چلنے والی ہوا بے حد خوشگوار تھی۔ دن بھر کی تپش اور چڑھائی نے بدن کی جو حالت کر دی تھی وہ کسی قدر چشمے کے پانی نے بہتر کر دی تھی۔ اس ماحول میں آ کر طبیعت بہت ہی بہتر ہونے لگی تھی، ہلکی ہلکی بھوک بھی لگ رہی تھی۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتے گئے۔ سرسبز و شاداب گھاس نظر آنے لگی۔ پھر انہوں نے تھوڑے سے فاصلے پر ایک عمارت کے آثار دیکھے یہ ایک محراب سی تھی اور اس محراب کے نچلے حصے میں یہ دونوں چراغ جل رہے تھے۔ محراب کے ساتھ ہی خوبصورت کٹاؤ کے درے بنے ہوئے تھے جو دور تک پھیل گئے تھے۔ ان درّوں کے نیچے تقریباً چار فٹ کی اونچی دیوار کا احاطہ تھا۔ اس احاطے کے اندر نامعلوم کیا تھا لیکن چراغ یقیناً مسافروں کی رہنمائی کیلئے یہاں رکھے گئے ہوں گے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ہوا چلنے کے باوجود یہ چراغ بجھ نہیں رہے تھے۔ ممکن ہے کسی خاص طریقے سے انہیں ہوا سے محفوظ کر دیا گیا ہو کیونکہ ان کے شعلے بھی نہیں لرز رہے تھے البتہ اس ویران ماحول کو دیکھ کر انہیں حویلی کے ایک کمرے میں جلتی ہوئی شمعیں یاد آنے لگیں جو شیشوں سے ڈھانپی گئی تھیں۔ اس سے پہلے انہیں یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ شمعیں کیسے روشن ہیں۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ اس درے سے اندر داخل ہو گئے۔"

''اور اگر کسی نے یہ سوال کر ڈالا کہ تم کون ہو اور بغیر اجازت اندر کیسے آ گئے تو کیا جواب دیں گے......؟'' شہریار نے سوال کیا۔

''یار! کہہ دیں گے کہ راستہ بھٹک کر اس طرف آ نکلے ہیں۔''

''دیکھ لو؟''

''ہاں۔ ہاں کوئی حرج نہیں ہے، آؤ چلتے ہیں۔'' وہ اور آگے بڑھے اور احاطے کی دوسری جانب پہنچ گئے۔ دوسری طرف کا منظر ہی انوکھا تھا اتنا حسین' اتنا خوبصورت کہ دیکھ کر آنکھیں حیرت سے پھیل جائیں۔ یہ ایک باغ تھا اور اس انداز میں بنایا گیا تھا جیسے مغل بادشاہ اپنے محلات کے باغ تعمیر کرایا کرتے تھے۔ بہت ہی خوبصورت برساتیاں بنی ہوئی تھیں جن کے نیچے سفید سنگ مرمر کی بینچیں پڑی تھیں۔ نگاہوں کے آخری حصے تک سبز گھاس مخمل کی

طرح بچھی ہوئی تھی۔ ایک جگہ ایک چھوٹا حوض بھی نظر آ رہا تھا۔ ویران علاقے میں یہ پراسرار اور انوکھی جگہ ان لوگوں کے لئے حیات بخش تھی اور خاص طور سے عمران یہ سوچ رہا تھا کہ یقیناً اس جگہ کا بھی کوئی طلسمی عمل ضرور ہوگا ورنہ ایسے علاقوں میں ایسی جگہیں بنائی نہیں جا سکتیں۔ وہ دونوں آگے بڑھتے رہے کافی بڑا باغ تھا پھر کچھ فاصلے پر ایک سنگی چبوترا نظر آیا جس کی تین سیڑھیاں تھیں۔ اس کے بعد ایک طویل میدان تھا اور میدان کے انتہائی سرے پر ایک خوبصورت دیوار نظر آ رہی تھی جس میں چھوٹے چھوٹے کئی دروازے بنے ہوئے تھے۔

''آؤ! ہمیں آگے بڑھتے ہی رہنا ہے۔'' عمران نے کہا اور شہریار نے بے بسی سے اُسے دیکھا لیکن وہی بات تھی، عمران کے عزم کے آگے شہریار کی حیثیت کچھ بھی نہیں تھی۔ البتہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ عمران یہ سوچے کہ شہریار ہمت ہار رہا ہے۔ وہ لوگ سنگی چبوترے پر پہنچ گئے۔ فرش بے حد ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر پہنچنے کے بعد شہریار نے کہا۔

''میں جوتے اتار دوں؟''

''ہاں! میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔'' عمران نے کہا اور دونوں نے اپنے اپنے جوتے اتار لئے۔ سنگی چبوترے کو عبور کرنے کے بعد وہ دیوار تک پہنچے اور انہیں پہلے دروازے کی دوسری جانب آہٹ سی سنائی دی۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا یہ آہٹ کیسی ہے لیکن کچھ لمحوں بعد جو شکل انہیں نظر آئی اسے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے ساکت رہ گئے۔ کیا شکل وصورت تھی کیا حسن تھا، قد تقریباً ساڑھے پانچ فٹ، بدن انتہائی متناسب، جسم پر ہلکے نیلے رنگ کا لباس، سر پر پٹی بندھی ہوئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی جوگن ہو۔ ماتھے پر لگی ہوئی بندیا سے یہ احساس ہوتا تھا کہ اس کا تعلق ہندو مذہب سے ہے۔ اس کا چہرہ اتنا خوبصورت اور دلکش تھا کہ آنکھیں اس پر سے ہٹنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ یاقوتی لب مسکرا اٹھے۔ اس کی آنکھوں میں استقبالیہ چمک تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچتے اس کی مترنم آواز سنائی دی۔

''مہمانوں کا سواگت کرتی ہوں پدھاریئے۔'' انہیں یوں لگا جیسے یہ دل موہ لینے والی آواز چاروں طرف سے آ رہی ہو۔ اس سے زیادہ اچھی آواز انہیں شاید ہی کبھی سننے کو ملی ہو۔ پھر اس کی مسکراتی آنکھیں اس نیم تاریک ماحول میں روشنیوں کے چراغ جلا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے قدرت نے اسے تخلیق کرتے ہوئے وقت سارا حسن اس میں سمو دیا

ہو۔ چند لمحوں بعد وہ پھر بولی۔

''اندر پدھاریئے۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔'' دونوں ان الفاظ پر چونک پڑے۔

''ہمارا؟'' دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

''ہاں آپ کا......!''

''مم مگر آپ ہمیں کیسے جانتی ہیں؟''

''کیا غیروں کی طرح باہر کھڑے ہیں۔'' اس کے لہجے میں بڑی اپنائیت تھی۔

''دیکھو اگر تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے تو اس میں ہمارا قصور نہیں ہوگا ہم مسافر ہیں اور راہ بھٹک کر ادھر آ گئے۔ اگر تمہیں کسی کا انتظار تھا تو وہ کوئی اور ہوں گے۔'' جواب میں اس کی کھنک دار ہنسی سنائی دی اور وہ بولی۔

''آپ ہمیں دیوانہ سمجھتے ہیں مہاراج؟''

''ہم آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں' آپ کا نام عمران اور یہ شہریار ہیں۔'' اس نے کہا اور یہ سنتے ہی دونوں پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ دور دراز ویران علاقوں میں یہ اجنبی لڑکی انہیں کیسے جانتی ہے ان کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے۔ بمشکل تمام عمران نے خود پر قابو پایا اور بولا۔

''لیکن تم کون ہوں؟''

''داسی ہوں۔ آپ کی راہ تک رہی تھی۔''

''لیکن ہم تو تمہیں نہیں جانتے۔''

''پتہ نہیں آپ اتنے کٹھور کیوں ہیں؟ آیئے تو سہی' میرا نام سدھا کماری ہے۔''

''سس' سس' سس سدھا کماری۔'' شہریار نے بے اختیار کہا۔

''ہاں۔'' سدھا کماری نے محبت بھری نگاہوں سے شہریار کو دیکھا۔ اس سے پہلے بھی یہی احساس ہو رہا تھا کہ وہ شہریار کی طرف متوجہ ہے۔''

وہ مڑ کر واپس چلی تو عمران نے شہریار کی طرف دیکھا جو بے خود محبت بھری نگاہوں سے سدھا کماری کو دیکھ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لڑکی کون ہے۔ پھر اچانک ہی دونوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔ یعنی یہ کہ وہ تو ہیں ہی طلسمی دنیا سے دوچار اگر کوئی

لڑکی ویرانے میں انہیں مل جاتی ہے اور انہیں ان کے نام سے مخاطب کرتی ہے تو اس میں تعجب کی تو کوئی بات نہیں۔ وہ اس کے پیچھے چلنے لگے۔ اُس کا رخ عمارت کی جانب تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ عمارت میں داخل ہو گئے۔ اندر کے منظر نے انہیں ایک بار پھر حیران کر دیا۔ وہاں کی ہر چیز انتہائی قیمتی اور خوبصورت تھی۔ ایک ایک حصہ اور ایک ایک گوشہ انتہائی حسین اور قیمتی چیزوں سے بھرا ہُوا تھا۔ بے شمار کمرے اور بے شمار راہ داریاں ان تمام جگہوں سے گزرتی ہوئی وہ انہیں ایک ایسے بڑے کمرے میں لے آئی جو غالباً کھانے کے لئے مخصوص تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی نگاہیں اس بڑی لمبی میز پر پڑیں جس پر طرح طرح کے کھانے چُنے ہوئے تھے۔ ہر قسم کے پھل اور میوے بھی بڑے سلیقے سے سجائے گئے تھے۔

''آیئے بیٹھے۔'' سدھا کماری نے میز کے نزدیک پہنچ کر مسکراتی نگاہوں سے انہیں دیکھ کر کہا۔ وہ ہچکچائے تو وہ آگے بڑھی اور اس نے انہیں بڑے پیار سے کہا۔

''آیئے نا! میں کوئی بُری آتما تو نہیں ہوں آیئے بیٹھے۔'' اس نے اس ادا سے کہا کہ انہیں بیٹھتے ہی بن پڑی۔ دونوں میز کے ایک طرف کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سدھا کماری ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ عمران نے محسوس کیا کہ شہریار چور نگاہوں سے اسے بار بار دیکھ رہا ہے۔ عمران اندیشہ ہوا کہ کہیں شہریار اس کی جانب مائل نہ ہو جائے۔ یہ تو طلسمی مورتیاں ہیں ان کا کیا......؟ تھوڑی دیر اس طرح گزر گئی تو وہ بولی۔

''اب میں آپ سے بھوجن کا کہوں تب آپ شروع کریں گے؟''

''وہ اصل میں سدھا کماری' یہ کھانا...... میرا مطلب ہے۔''

''بھوجن صرف بھوجن ہوتا ہے آپ براہ کرم کھایئے۔''

''ٹھیک ہے۔'' عمران نے کہا اور کھانے کی جانب ہاتھ بڑھا دیئے۔ انہیں یاد آ گیا تھا کہ حویلی میں بھی انہوں نے کئی بار کھانا کھایا تھا ویسے بھی کوئی چیز اجنبی نہیں تھی۔ ہندوانداز کی پوریاں اور سالن تھا اور بھی کئی ڈشیں تھیں۔ ان کے ہمراہ پھل وغیرہ بھی تھے۔ کھانا بہترین اور لذیذ تھا اور بھوک ہر قسم کے احساس کو مٹا دیتی ہے۔ وہ خاموشی سے کھاتے رہے۔ اچانک عقب سے کچھ آہٹیں ابھریں۔ دونوں چونک کر اُدھر دیکھنے لگے۔ وہاں ایک دبلا پتلا لمبے قد کا ہندو جوگی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی شیطانیت برس رہی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر کہا۔

''میرا نام دینا پرشاد ہے اور میں جانتا ہوں کہ یہ نام تمہارے لئے اجنبی نہیں ہے۔ تمہیں یاد ہوگا تمہیں بتایا گیا تھا کہ دینا پرشاد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور اس پر طلسم کیا گیا تھا لیکن ہم بھوانی کے پجاری اتنی آسانی سے نہیں مرتے۔ ہمیں سات جنم کی مہلت حاصل ہے۔'' اور ہم اپنا کام کرنے کے لئے تمہیں لوگوں سے مدد لیتے ہیں' کیا سمجھے؟''

عمران ایک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اسے دینا پرشاد کا نام یاد آ گیا تھا۔ اس کی بابت اسے حسینہ نے بتایا تھا اور بعد میں تفصیل ایک بار دادی اماں نے بھی سنائی تھی۔

دینا پرشاد نے خونخوار نگاہوں سے سدھا کماری کو دیکھا اور بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تو ہمارے ساتھ دھوکہ کر رہی ہے۔'' سدھا کماری کا چہرہ اتر گیا اس نے دینا پرشاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''دینا پرشاد مہاراج! مجھ سے تو آپ ہی نے کہا تھا کہ مہمان آ رہے ہیں ان کا سواگت کروں۔''

''ہاں! میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ یہ ہمارے مہمان ہیں۔ ابھی ہمیں ان سے بہت سے کام لینے ہیں۔ نیا جیون حاصل کرنے کے لئے مجھے انہی کی مدد کی ضرورت ہے۔ تُو ان کی ہر طرح سے خاطر مدارت کر اور سنو میرے مہمانو! اس جگہ کو اپنے لئے بُرا مت سمجھو۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ ہاں ایک ایسا سمے ضرور آئے گا جب ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ تم دونوں کے خون کے سات سات قطرے مجھے نیا جیون دے دیں گے۔ میں تمہاری جو خدمت کروں گا اس کا تم سے اس کے علاوہ اور کوئی صلہ نہیں مانگوں گا۔''

عمران نے شہریار کی طرف دیکھا جو اس وقت بھی سلگتی نگاہوں سے سدھا کماری کو دیکھ رہا تھا عمران نے اسے آواز دی۔

''شہریار۔'' اور شہریار چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔

''تم کیا سوچ رہے ہو؟''

''آں...... ہاں کچھ نہیں کچھ بھی تو نہیں۔'' شہریار نے کہا۔ اس وقت دینا پرشاد نے سدھا کماری سے کہا۔

''تُو میرے ساتھ آ' مہمانوں کے آرام کا انتظام بھی تو کرنا ہے۔'' اور سدھا کماری مریل قدموں سے دینا پرشاد کے ساتھ چل دی اور وہ دونوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ عمران نے شہریار کو دیکھا اور کہا۔

''شہریار! یہ تو نئی کہانی شروع ہوگئی' تمہیں یاد ہے نا دینا پرشاد...... یاد ہے نا؟''

''اچھی طرح...... اچھی طرح' دادا بلکہ دادا کے پردادا حضور کی کہانی میں دینا پرشاد کا کردار تھا۔''

''مگر مجھے لگ رہا ہے کہ تم ایک نئی کہانی کو جنم دے رہے ہو!'' عمران نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور شہریار چونک گیا۔ عمران اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا تب شہریار نظریں چرانے لگا۔

''شہریار اپنے آپ کو سنبھالنا ضروری ہے' حسن کے اس جال میں گرفتار ہو کر کہیں پھنس نہ جانا۔'' شہریار کے چہرے سے یوں لگا جیسے اسے عمران کی بات ناگوار گزری ہو۔

دور سے انہیں سدھا کماری آتی دکھائی دی اور وہ دونوں خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ سدھا کماری کا چہرہ اب بھی اسی طرح جگمگا رہا تھا تاہم اس کے چہرے میں ذرا سا پھیکا پن پیدا ہو گیا تھا۔ اسے دیکھ کر واقعی انسان اپنے دل و دماغ پر قابو پانے میں مشکل کا شکار ہو جاتا تھا۔ سدھا کماری آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے نزدیک پہنچ گئی۔ وہ لباس تبدیل کر چکی تھی۔ جو ساڑھی اس نے اب باندھی تھی اس میں بے پردگی کا مکمل خیال رکھا گیا تھا۔ ساڑھی اتنے خوبصورت انداز میں باندھی ہوئی تھی کہ آنکھوں میں کھب رہی تھی وہ ان کے اور قریب آگئی اور کہنے لگی۔

''مجھے افسوس ہے کہ تم لوگوں کو یہاں آ کر دکھ کا سامنا کرنا پڑا۔''

''نہیں' افسوس تو ہمیں ہے کہ ہماری وجہ سے دینا پرشاد نے تمہیں بُرا بھلا کہا۔''

''کون کہتا ہے کہ انہوں نے ہمیں برا بھلا کہا' وہ تو ہمارے سوامی ہیں' بڑے دیالو ہیں وہ' میں ان کی داسی ہوں' کوئی ایسا کام بھی نہیں کیا میں نے' جو ان کی مرضی کے خلاف ہو' وہ تو خود تمہارے پاس آنا چاہتے تھے۔''

''وہ تمہیں کہاں لے گئے تھے اپنے ساتھ......؟''

''آپ لوگوں کے لئے آرام کی جگہ تیار کرنے کیلئے۔''

”ہوں‘ تو پھر اب کیا کرنا ہے......؟“

”آئیے اب آپ میرے ساتھ آئیے۔“

”ٹھیک ہے آؤ شہریار۔“ عمران نے کہا اور شہریار ایک دم چونک اٹھا۔لگ رہا تھا کہ وہ بُری طرح سدھا کماری کے سحر میں گرفتار ہو گیا ہے۔ راستے میں عمران نے پوچھا۔

”یہ کونسی جگہ ہے سدھا......؟“

”پریم نگر۔“ اس نے جواب دیا۔

”میرا مطلب ہے یہ کہاں کا علاقہ ہے......؟“

”یہ میں نہیں جانتی‘ بس اتنا جانتی ہوں کہ یہ پریم نگری ہے۔“ وہ ان لوگوں کو لئے ہوئے ایک کمرے تک پہنچ گئی‘ پھر دروازہ کھولتے ہوئے ہی بولی۔

”آئیے۔“ کمرہ بڑا خوبصورتی سے آراستہ تھا۔ اس میں دو دیدہ زیب مسہریاں پڑی تھیں‘ وہ ایک مسہری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”یہ آپ کے آرام کیلئے ہے۔“ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنے گریبان سے ایک چھوٹا سا آئینہ نکال لیا۔ اس کا یہ عمل ان لوگوں کیلئے ذرا تعجب خیز تھا۔ وہ آئینے میں کچھ دیر تک دیکھتی رہی اور اس کے بعد بولی۔

”شکر ہے بھگوان کا!“

”کیوں خیریت کیا ہوا؟“

”دینا پرشاد جی کو دیکھ رہی تھی۔“

”کیا مطلب......؟“

”مطلب یہ کہ دیکھ رہی تھی کہ دینا پرشاد کہاں ہیں۔“

”کہاں ہیں وہ؟“

”لمبے سفر پر گئے ہوئے ہیں۔“

”اوہ‘ تمہیں پتہ چل جاتا ہے؟“

”ہاں۔“

”مگر تم یہ کیوں معلوم کرنا چاہتی تھیں؟“ عمران نے سوال کیا تو اس کے چہرے پر

عجیب سے تاثرات پھیل گئے پھر اس نے کہا۔

''مہاراج! میں آپ کی سیوا کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں آپ کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ یہ میری مجبوری ہے کہ میں وہ کروں جو دینا پرشاد کہہ رہے ہیں۔ لیکن آپ کو ایک بات بتادوں دینا پرشاد جی جو کچھ کر رہے ہیں وہ اپنے لئے کر رہے ہیں۔ انہوں نے آپ سے سات سات قطرے کی بات کی ہے جو سچ نہیں ہے۔ وہ آپ دونوں کی بھینٹ دینا چاہتے ہیں کیونکہ انہیں ختم کر دیا گیا ہے اب ان کی آتما کو مسلمانوں کے خون کی ضرورت ہے۔ آپ سے سات قطرے خون نکالنے کی بات کریں گے لیکن آپ کی شہ رگ کاٹ دیں گے اور اس کے بعد آپ کے خون میں نہائیں گے۔ اسی طرح انہیں نیا جیون مل سکتا ہے۔'' عمران اور شہریار لرز کر رہ گئے تھے۔ عمران تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر کہنے لگا۔

''مگر تم یہ بات ہمیں کیوں بتا رہی ہو؟'' عمران کے سوال پر سدھا کماری کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی مہاراج۔''

''کیوں؟''

''کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

''جب تم نے اتنا کیا ہے تو یہ بھی بتادو۔''

''سنو! اگر تمہارے ذہن میں یہ خیال ہے کہ ہم تمہیں کوئی نقصان پہنچائیں گے تو اس خیال کو دل سے نکال دو۔''

''پرنتو وہ بڑا مورکھ ہے اسے سب کچھ پتا چل جائے گا۔ بھگوان کی سوگند میں بھی تمہاری طرح ایک مظلوم کنیا ہوں۔ بڑا طویل عرصہ گزار چکی ہوں یہاں پر۔''

''اس سے پہلے تم کہاں رہتی تھیں؟''

''اپنے گاؤں میں۔''

''وہاں سے کیسے چلی آئیں؟'' عمران نے سوال کیا اور سدھا کماری کے چہرے پر پھر دکھ کے آثار پھیل گئے۔ پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''میرے ماتا پتا نے مجھے بھینٹ چڑھا دیا۔''

''ماتا' پتا نے؟'' عمران تعجب سے بولا۔

''ہاں! دھرم کے ہاتھوں پاگل بن کر انہوں نے اپنی بیٹی کا بلیدان دے دیا۔''

''ہم سات بہنیں تھیں۔ میرے پتا کو بیٹے کا بڑا ارمان تھا اور ہر بار ہمارے ہاں جب بہن پیدا ہو جاتی تو انہیں بڑا دکھ ہوتا۔ منتیں مرادیں مانتے پھرتے تھے۔ وہ ایک مندر میں آئے' یہاں انہوں نے منت مانی اور کہا کہ اگر بھگوان انہیں بیٹا دے گا تو وہ اپنی پہلی بیٹی کو اس مندر کی داسی بنا دیں گے۔ میں ان کی پہلی بیٹی تھی اور دھرم کے مطابق پہلی بیٹی کو ہی بیٹے پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ یہ منت ماننے کے بعد وہ گھر چلے گئے اور پھر بھگوان نے انہیں بیٹا دے دیا۔ میری کم بختی آئی اور انہوں نے مجھے مندر کے سپرد کر دیا۔ اس وقت میں گیارہ سال کی تھی جب میں اس مندر میں آ گئی۔ پہلے تو مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی لیکن جوں جوں میں جوان ہوتی گئی مجھے پتہ چلا کہ مندر کا ماحول اچھا نہیں ہے۔ پجاری' پنڈت' دیکھنے میں تو بھگوان کے بھگت نظر آتے ہیں مگر ان کی آنکھوں میں شیطان ناچتا ہے۔ سمے بیتا تو میرے ماتا پیتا نے میری طرف توجہ بھی چھوڑ دی اور آہستہ آہستہ میں انہیں بھولتی جا رہی تھی لیکن مندر کی زندگی مجھے بالکل ناپسند تھی۔ میری عمر سترہ سال تھی جب مجھے دینا پرشاد کے سامنے ناچنا پڑا۔ وہ اس وقت اس مندر کا پجاری تھا اور وہاں اپنی گھناؤنی حرکتوں میں مصروف رہتا تھا۔ پھر اس نے یہاں کے ایک ایک آدمی کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ مندر میں میرا سمے گزرتا گیا اور پھر ایک دن میں...... ایک دن میں...... اس شیطان کے ہاتھوں اُجڑ گئی۔ اس نے مجھے اپنی داسی بنا لیا۔ سنسار میں میرا کوئی نہیں تھا۔ مجھے اس کے اشاروں پر کام کرنا پڑتا ہے اور اب میں اس کا ہر کام کرتی ہوں۔ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے اب جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ بھگوان نے جو میرے بھاگ میں لکھ دیا ہے میرے ساتھ وہی ہوگا۔''

''ہم تمہیں یہاں سے نکال لے جائیں گے شاید ہماری ذمہ داری یہی لگا دی گئی ہے۔'' شہریار نے بے اختیار کہا اور عمران اسے چونک کر دیکھنے لگا اس کے چہرے پر حیرانگی اُمڈ پڑی۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں۔'' جب وہ چلی گئی تو عمران نے کہا۔

''شہریار! یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

''ایں؟'' ''کیا کر رہا ہوں میں؟'' شہریار نے چونکتے ہوئے کہا۔

''مجھے یوں لگ رہا ہے شہریار! جیسے تم سدھا کماری کے سحر میں گرفتار ہوتے جا رہے ہو! تم اسے لے کر کہاں جاؤ گے؟ پتہ نہیں'' شہریار تھوڑی دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا اس کے بعد گردن جھٹک کر بولا۔

''واقعی! مجھے احساس ہو رہا ہے' جیسے میں کسی سحر میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ میں کیا کروں مجھے بتاؤ؟''

''کچھ نہیں بس خود کو سنبھالے رکھو۔''

''میری ایک بات مانو گے؟ یہ دینا پرشاد کے بارے میں جو کچھ ہمیں معلوم ہو چکا ہے وہ غلط نہیں ہے۔ سدھا کماری نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے!''

پھر بتاؤ کیا کریں؟''

''آؤ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اگر یہاں رہے تو مشکل کا شکار ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے چلو اور اس کے بعد وہ دونوں باہر نکل آئے اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ وہ سب کی نگاہوں سے بچ کر یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے لیکن صحیح راستوں کا انہیں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ پھر انہوں نے خدا کا نام لیا اور اس کے بعد ناک کی سیدھ میں آگے بڑھنے لگے۔ یہ جگہ ویسے تو ایک احاطے کے اندر تھی لیکن اس وقت انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ سامنے کے راستے کشادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ رخت پھل' بُوٹے اب بھی یہاں موجود تھے لیکن زمین انہیں بھرپور راستہ دے رہی تھی۔ تقریباً ین گھنٹے چلتے رہے اور ایک بار پھر تھکن نے ان پر قابو پالیا۔ اس وقت شاید ساری پراسرار تیں سو رہی تھیں جو ان کی نگرانی کر سکتی تھیں یا پھر ممکن ہے کہ ان کے روّیے نے انہیں یہ مینان دلایا تھا کہ وہ لوگ کہیں بھاگیں گے نہیں۔ خاص طور سے شہریار جس طرح سدھا ماری کے جال میں پھنس گیا تھا اور جیسے جیسے وہ اس کے بارے میں سوچ رہا تھا' اس بات نے دینا پرشاد کو ہی نہیں بلکہ سدھا کماری کو بھی یقین دلایا ہوگا کہ یہ لوگ فرار کی کوشش نہیں

کر سکتے۔ تین گھنٹے پیدل چلنے کے بعد وہ ایک نیم تاریک میدان میں پہنچ گئے۔

میدان کے آخری حصے پر ایک چھوٹا سفید مکان نظر آ رہا تھا۔ یہ مکان ان کی امیدوں کا مرکز بن گیا۔ قرب و جوار میں اور کوئی چیز نہیں تھی۔ دونوں اس مکان کی جانب بڑھ گئے۔

مکان دور سے بھی خوبصورت نظر آ رہا تھا اور قریب سے بھی خوبصورت تھا۔ عمران نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا جو آسانی سے کھل گیا۔ سامنے ہی ایک بیٹھک نما جگہ تھی۔ اس کے بعد صحن اور پھر اندر تین کمرے۔ مکان بے حد پراسرار نظر آ رہا تھا۔ وہ ان کمروں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھے اور پھر عمران نے درمیان میں کھڑے ہو کر آواز لگائی۔

''اس گھر میں کوئی ہے؟'' کوئی جواب نہیں ملا پھر دوسری آواز۔ تیسری آواز پر سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک بوڑھے آدمی نے باہر جھانکا۔

''کون ہو بھائی' کیا چاہتے ہو؟''

''بابا جی ہم مسافر ہیں' ایک رات کے لئے پناہ چاہتے ہیں۔''

وہ شخص خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا پھر بولا۔

''ٹھیک ہے۔ اندر آجاؤ۔''

وہ اندر داخل ہوئے تو انہیں ایک بہت بڑا ہال نما کمرہ نظر آیا' جس میں جگہ جگہ کینوس بورڈ رکھے ہوئے تھے' رنگ اور برش' چھوٹے چھوٹے اسٹول' اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ یہ کسی مصور کا نگار خانہ ہے' بے شمار تصویریں بورڈ پر لگی ہوئی تھیں لیکن ان پر خاکی کاغذ پڑے ہوئے تھے جن سے وہ ڈھک گئی تھیں۔

''بابا! کیا آپ مصور ہیں۔'' جواب میں بوڑھے نے گھور کر دونوں کو دیکھا اور بولا۔

''تمہیں پناہ چاہیے یا میرا انٹرویو کرنے آئے ہو؟''

''نہیں بابا جی معافی چاہتے ہیں آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟''

''آسمان سے تو اُترے نہیں ہو گے' نہ مجھے زمین میں اُگے ہوئے لگتے ہو' عجیب آدمی ہو یار! وہ جو برابر والے کمرے کا دوازہ ہے نا اسے کھولو اور اندر چلے جاؤ۔ ایک رات کی پناہ چاہیے تو اعتراض نہیں کرتا لیکن اس سے زیادہ نہیں۔''

''بابا! ہم بڑے پریشان حال ہیں۔'' جواب میں بوڑھے نے انہیں پھر غصیلی نگاہوں سے دیکھا' کچھ دیر گھورتا رہا پھر بولا۔

''چلو' بیٹھ جاؤ!'' یہ کہہ کر اس نے ان اسٹولوں کی جانب اشارہ کیا جو ایک طرف پڑے ہوئے تھے پھر وہ بولا۔

''کچھ کھاؤ گے......؟''

''ہوں' کس پریشانی میں مبتلا ہو۔؟''

''بابا بس آپ یوں سمجھ لیجئے کہ ہم زندگی سے اکتائے ہوئے ہیں۔''

''مرنے آئے ہو یہاں؟''

''مر جائیں گے' لیکن اپنا مشن پورا کئے بغیر نہیں مریں گے۔''

''مشن کیا ہے......؟''

''بابا آپ کو تفصیل بتائیں گے کہ تو آپ برا مان جائیں گے......؟''

''میں کیوں برا مانوں گا اگر بات میری مرضی کے خلاف ہوگی تو کان سے پکڑوں گا اور باہر نکال دوں گا تمہیں' مجھے جانتے نہیں ہو تم کہ میں کون ہوں؟''

''بابا آپ کوئی مصور معلوم ہوتے ہیں!''

''ہاں' میں زندہ تصویروں کا مصور ہوں۔ حقیقی تصویریں بناتا ہوں۔ مستقبل اور ماضی کی پیشین گوئیاں کر دیتا ہوں۔ کرلو گے یقین میری بات پر؟'' بوڑھے نے کہا اور آگے بڑھ کر ایک تصویر پر سے کاغذ ہٹا دیا لیکن جو تصویر انہوں نے دیکھی' وہ اسے دیکھ کر بُری طرح اچھل پڑے۔ بوڑھے نے کاغذ واپس گرا دیا تھا۔

''غلط کاغذ اٹھا لیا......''

بابا جی......! بابا جی......! یہ...... یہ...... بابا جی...... یہ۔''

''ہاں' ہاں دینا پرشاد کو بنا کر دی تھی۔ واپس منگوا لیا ہے میں نے۔ وہاں وہ اس سے غلط کام لے رہا تھا۔''

وہ ہم سمجھے نہیں؟''

''ارے بھئی! دینا پرشاد نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک تصویر بنا دو۔ ایک خوبصورت

سی لڑکی کی تصویر' اس سے ایک کام لینا ہے۔ میں نے بنا کر دے دی۔ وہ اسے استعمال کرتا رہا۔ پھر تصویر واپس آ گئی اور اس نے کہا کہ وہ ان لوگوں کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔ شاید ان میں سے کسی لڑکے پر اس کا دل آ گیا تھا۔"

دونوں شدت حیرت سے گنگ رہ گئے تھے۔ شہریار نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عمران کو دیکھا۔ عمران نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہو گیا؟"

"وہ......وہ۔"

"کیا......وہ......وہ۔"

"بابا جی ایک لمبے سفر کے بعد ہم اس جگہ پر پہنچے تھے' وہاں یہ لڑکی ہمیں زندہ ملی۔"

"تو مردہ ملتی کیا؟ میری تصویریں......زندہ ہی ہوتی ہیں۔ کیا سمجھا تو؟ نہیں سمجھا۔"

"اس سے ہم نے بہت ساری باتیں کی تھیں!"

"ارے جب وہ زندہ تھی تو باتیں کیوں نہ کرتی؟ ارے یار تم لوگ مجھے پاگل لگتے ہو۔"

"نہیں بابا جی ہم پاگل نہیں ہیں' لیکن وقت اور حالات' ہمیں پاگل کئے دے رہے ہیں۔"

"اچھا چلو بتاؤ' ہمیں اپنے بارے میں۔" بوڑھے کے لہجے میں نرمی آ گئی تھی لیکن یہ دونوں شدت حیرت سے دیوانے ہو رہے تھے۔ بوڑھے کا کہنا تھا کہ سدھا کماری صرف ایک تصویر تھی جو زندہ ہو گئی تھی اور وہاں ان کے پاس کام کر رہی تھی۔ بوڑھے نے چند لمحات کے بعد کہا۔

"تم اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہے ہو' چلو دیکھ لو اسے' پھر مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ چل لڑکی کیا نام رکھا تھا دینا پرشاد نے؟"

"سدھا کماری۔" تصویر کی مترنم آواز ابھری۔ یہ آواز سدھا کماری کی ہی تھی۔

"باہر آ......" بوڑھا بولا اور لڑکی لکڑی کے فریم سے باہر نکل آئی۔ ان دونوں کے اوپر غشی کا غلبہ ہونے لگا۔ سدھا کماری آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بوڑھے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"اب کیا کروں؟"

"بس کچھ نہیں۔ جا اس دوسرے فریم میں چلی جا۔" بوڑھے نے کہا اور سامنے

اشارہ کیا۔ ادھر بھی ایک فریم تھا جس پر سفید کاغذ لگا ہوا تھا۔ لڑکی آہستہ قدموں سے اس طرف چل دی۔ دونوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ لڑکی اس طرح فریم پر چڑھی جس طرح سیڑھیاں طے کر رہی ہو اور وہ فریم کے سفید کاغذ میں داخل ہو کر بے جان ہوگئی۔ اب وہ صرف ایک تصویر تھی' ہنستی مسکراتی ایک تصویر۔ شہریار اور عمران خاموشی سے اس تصویر کو دیکھتے رہے پھر شہریار ہمت کر کے آگے بڑھا اور تصویر کے قریب پہنچ گیا۔ تب بوڑھے کی آواز ابھری۔

''ہاں...... ہاں جاؤ...... جاؤ...... چھو کر دیکھ لو۔ میں نے تمہیں خود اجازت دی ہے' شک کر رہے ہو میرے اوپر؟'' لیکن شہریار نے ان باتوں کی پروا نہ کی۔ اس نے تصویر پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ سدھا کماری واقعی اب ایک تصویر بن چکی تھی۔ شہریار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر عمران کی طرف دیکھنے لگا جو خود بھی حیرت زدہ نظر آ رہا تھا۔ بوڑھا آگے بڑھا اور بولا۔

''اور کچھ دیکھو گے...... دکھاؤں تمہیں...... بولو دکھاؤں؟ یہ دیکھو...... یہ دیکھو......'' یہ کہہ کر اس نے ایک اور تصویر پر سے پردہ ہٹا دیا۔ یہ تصویر شہریار کے گھر یعنی اپنی حویلی کی تھی اس کے امی' ابو' دادی حسینہ اور شہریار نظر آ رہے تھے' آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ یہ کسی ایسے وقت کا منظر تھا جب وہ اپنے گھر میں ہی ہوں گے۔ شہریار دُکھی سا ہو گیا...... تو بوڑھے نے کہا۔

''اور بتاؤں...... اور بتاؤں...... آؤ یہ دیکھو...... یہ دیکھو......'' اس نے ایک اور تصویر پر سے پردہ ہٹایا تو پروفیسر ناہید' مونا اور عمران نظر آئے۔

''اور بتاؤں...... اور بتاؤں......'' یہ کہہ کر اس نے کسی تیسرے فریم پر سے کاغذ ہٹا دیا اور یہ وہ منظر تھا جب وہ اس چھوٹے سے سفید گھر میں داخل ہو رہے تھے۔

''میرا گھر ہے یہ سمجھے...... میرا گھر ہے...... میرا نگار خانہ ہے' تمہیں کیا بتاؤں اس کے بارے میں اور کیوں بتاؤں؟ تم ہوتے کون ہو؟ یہ دیکھو...... اور دیکھو......'' یہ کہہ کر اس نے ایک اور تصویر پر سے کاغذ ہٹا دیا۔ یہ تصویر سب سے زیادہ حیرت ناک تھی۔ یہ آشیانہ کی تصویر تھی شہریار کی اپنی پرانی حویلی' جسے دیکھ کر عمران اور شہریار کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

''جاؤ' جاؤ اندر جاؤ۔'' بوڑھے نے کہا اور اچانک ہی انہیں اپنے دماغ گھومتے

ہوئے محسوس ہوئے۔ انہیں یوں لگا جیسے یہ سارا ماحول ناچ رہا ہو' گردش کر رہا ہو' وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے لیکن وہ منظر پھیلتا چلا گیا۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے مصور اور اس کا کمرہ غائب ہو گئے ہوں۔ حویلی کی تصویر بڑی ہوتے ہوتے اتنی بڑی ہو گئی کہ انہیں یوں لگا جیسے حویلی کے دروازے کے سامنے کھڑے ہوں...... اور پھر وہ واقعی حویلی کے دروازے کے سامنے تھے۔ انہوں نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن اس وقت جیسے کوئی جادوئی قوت انہیں اندر دھکیل رہی تھی' اس مکان کا دروازہ کھلا اور دونوں اس طلسمی قوت کے زیر اثر اندر داخل ہو گئے۔ اندر سے مکان بے حد خوبصورت تھا۔ جس شخص نے ان کا استقبال کیا وہ ایک جوان آدمی تھا۔ اس نے گردن خم کی اور بولا۔

''تشریف لائیے خان صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' عمران اور شہریار پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھنے لگے۔ کیا ہی خوبصورت جگہ تھی۔ وہ شخص ان کی رہنمائی کر رہا تھا اور دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ پھر وہ جس بڑے کمرے میں داخل ہوئے وہ قابل دید تھا' انتہائی وسیع۔ اس میں جو فرنیچر وغیرہ سجا ہوا تھا وہ سینکڑوں سال پرانا معلوم ہوتا تھا۔ عجیب وغریب طرز کے صوفے جیسی چیز' چاندی کے چھپرکٹ اسی طرح کا دوسرا سامان اور بیٹھنے کے لئے جو نشست گاہیں تھیں وہ لکڑی اور چمڑے سے بنی ہوئی تھیں۔ ایک شخص اس عظیم الشان کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ وہ ایک انتہائی شاندار اور دبنگ شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے دونوں کی طرف دیکھا اور شہریار کو دیکھ کر اس کے چہرے پر انتہائی محبت کے آثار پھیل گئے۔ وہ اسے دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس نے شہریار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ شہریار کو یوں لگا جیسے اس کا ہاتھ کسی جن کے ہاتھ میں چلا گیا ہو۔ اتنا بڑا اور قوی ہیکل ہاتھ تھا اس کا کہ شہریار کا ہاتھ تو اس کے ہاتھ میں کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس نے شہریار کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کا سینہ بھی بہت چوڑا تھا۔ شہریار کو دیر تک گلے لگائے رکھنے کے بعد وہ عمران کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے عمران کے سر پر بھی ہاتھ پھیرا پھر مدھم لہجے میں بولا۔

''آؤ بچو بیٹھو۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ یہ دونوں انکار نہ کر سکے اور بیٹھ گئے۔ وہ شخص شہریار کو دیکھے جا رہا تھا...... پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''بیٹے! تم میرا خون ہو۔ میں تمہاری پرانی نسل کا ایک فرد ہوں۔ میرا نام مہابت خان ہے۔ ٹھہرو، میں تمہیں تمہاری دادی سے ملاتا ہوں۔'' شہریار کے ساتھ ساتھ ہی عمران کے ذہن میں بھی ایک چھناکا سا ہوا۔ جو کہانی شہریار کی دادی جان نے اپنے پردادا جان کے بارے میں سنائی تھی اس میں انہوں نے پردادا کا نام مہابت خان ہی بتایا تھا۔ مہابت خان شہریار کے خاندانی بزرگوں میں سے ایک تھے۔ بہت ہی پرانی نسل کے ایک فرد۔ لیکن سارے واقعات مہابت خان ہی کے نام سے منسوب تھے۔ بارہ برجی، بستی، جن زادی اور بہت ساری باتیں۔ یہ کہانی دادی اماں نے حسینہ اور شہریار کو سنائی تھی لیکن اس کے بارے میں ساری تفصیل جو اس کمرے سے منسوب تھی، عمران کے علم میں بھی تھی۔ شہریار کو بھی سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مہابت خان کو دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اندرونی کمرے سے ایک عمر رسیدہ خاتون اندر داخل ہوئیں۔ گورا سفید رنگ، بہت ہی دلکش نقوش اور بڑی خوبصورت شخصیت۔ انہوں نے محبت بھری نگاہوں سے شہریار کو دیکھا تو مہابت خان نے کہا۔

''پہچانا مرینہ بیگم؟''

''چہرہ تو اجنبی نہیں لگتا، خون کی پکار بھی اپنوں جیسی ہے، کون ہے مہابت خان کون ہے یہ؟''

''یہ ہماری نسل کا پوتا ہے۔''

''آہ میں سمجھ گئی۔ جس گھر میں یہ لوگ رہتے ہیں اس گھر میں پہلی بار ہم نے قیام کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ جگہ اب ایک بند کمرے کی حیثیت رکھتی ہے لیکن کیا ہماری آنکھیں اتنی کمزور ہیں کہ ہم بند دروازے کے باہر کچھ نہیں دیکھ سکتے؟ میں تو ان لوگوں سے بہت محبت کرتی ہوں۔ سب یاد ہے مجھے اس بچے کا نام شہریار ہے اس گھر میں اور بھی بہت سے لوگ تھے۔''

دفعتاً عمران کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا اسے امید کی شمع روشن نظر آنے لگی۔ وہ بے چین لہجے میں بولا۔

''دادی اماں! دادی حضور! تب تو آپ حسینہ کو بھی جانتی ہوں گی؟''

’’ذرا ٹھہرو...... ٹھہرو......مہابت خان تم نے بچوں سے کچھ کھانے پینے کے بارے میں بھی پوچھا؟‘‘

’’لو‘ دیر کتنی ہوئی ہے انہیں یہاں آئے ہوئے۔‘‘

’’پہلے انہیں کچھ کھلاؤ پلاؤ‘ ان کی کچھ خاطر مدارت کرو۔ صندل اری او صندل۔‘‘

مرینہ بیگم نے آواز دی اور ملازمہ قسم کی ایک عورت اندر آ گئی تھی۔

’دیکھو بچے آئے ہیں ان کے لئے کچھ انتظامات کرو......‘‘

مرینہ بیگم نے کہا۔

’’بیٹے! صدیاں گزر گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بارہ برجی میں کبھی بہار نہیں آئی تم آئے ہو تو لگ رہا ہے جیسے ہر طرف خوشبو ہی خوشبو بکھر گئی ہو۔‘‘

شہریار تو کچھ نہ بول پایا۔ وہ تو سوچ سوچ کر ہی حیران ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے لیکن عمران کے دل کو جو لگی ہوئی تھی، وہ بہت زیادہ تھی اور وہ حیران سے زیادہ پریشان تھا۔

’’محترم خاتون! میرے بارے میں شاید آپ نہ جانتی ہوں؟‘‘

’’نہیں، میں جانتی ہوں۔‘‘

’’کیا جانتی ہیں آپ؟‘‘

’’جو جانتی ہوں اُسے جانے دو۔‘‘

’’ٹھیک ہے ہم آپ سے......؟‘‘

’’میں جانتی ہوں...... میں جانتی ہوں کہ کیا سوال کرو گے تم مجھ سے، میں نے تھوڑی دیر کی مہلت مانگی ہے تم سے مہلت دو گے مجھے......؟‘‘

جواب میں عمران خاموش ہو گیا تھا۔

’’آؤ، میرے ساتھ۔ لڑکے تم جو سوال مجھ سے کرنا چاہتے تھے میں اس کا جواب تمہیں دینے جا رہی ہوں۔‘‘ عمران نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں گردن ہلائی، وہ نہیں جانتا تھا کہ بوڑھی خاتون جو شہریار کی پردادی تھی، کیا جان گئی ہے اس کے بارے میں، بہرکیف وہ خیالی عمارت کے اندرون آخری حصے تک پہنچے اور ایک کمرے کے دروازے پر رُک گئے۔ مرینہ بیگم وہ اندر داخل ہو گئیں۔ وہ بھی اندر داخل ہو گئے لیکن پھر ٹھٹھک گئے۔

تب وہ انہیں لے کر ایک بہت ہی خوبصورت جگہ آ گئیں جس میں شاندار بستر اور زندگی کی ہر آسائش موجود تھی وہاں ایک اور بزرگ خاتون تھیں جس کو دیکھ کر عمران اور شہریار کو کرنٹ سا لگا۔ جو بوڑھی عورت ان کے سامنے تھی اس کے نقوش دیکھ کر دونوں دنگ تھے، عمران کے منہ سے تو بے اختیار نکل گیا۔

''حسینہ......'' بوڑھی عورت چونک کر کھڑی ہوگئی۔اس نے عجیب سی نگاہوں سے عمران اور شہریار دونوں کو دیکھا۔پھر مرینہ بیگم سے پوچھنے لگی۔

''مرینہ......کون ہیں یہ بچے؟'' عمران ایک دم آگے بڑھ آیا۔گلشار خاصی بوڑھی عورت تھی لیکن اس کے سارے نقوش حسینہ سے ملتے تھے۔سو فیصدی وہ حسینہ کی ہمشکل تھی۔ عمران اُسے دیکھنے لگا تو وہ مسکرا کر بولی۔

''مجھے کیا دیکھ رہے ہو میرے بچے اور کس نام سے مخاطب کیا تھا تم نے مجھے؟''

''ح۔ح۔حسی۔حسینہ''

''میرا نام گلشار ہے۔''

''گلشار۔'' شہریار کے منہ سے نکلا۔

''میرا نام شہریار ہے۔''

''شہریار حسینہ کیا قصہ ہے مرینہ بیگم؟''

''گلشار یہ مہابت خان کی نسل کا ایک لڑکا ہے، اور دوسرا مہابت خان کی نسل کی ایک لڑکی سے محبت کرنے والا اُس کا شوہر ہے اور حسینہ تمہاری پڑپوتی جو ہو بہو تمہاری شکل کی ہے اور ہزار جان کی قید میں ہے۔''

''آہ......'' گلشار خاتون دُکھی ہوگئیں۔

''ہزار جان اتنا منتقم مزاج ہوگا کہ وہ نسلوں تک ہمارے خاندان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے گا مجھے پتہ ہوتا......تو میں شاید مہابت سے محبت ہی نہ کرتی......مگر......اب کچھ نہیں ہوسکتا......سوائے ہزار جان کی موت کے۔مگر اس کی جان تو ایک جلتے چراغ میں ہے۔وہ چراغ کیسے بجھا پائیں گے یہ بچے......'' گلشار خاتون پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''دادی جان......'' شہریار نے آگے بڑھ کر گلشار خاتون کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

عمران نے بھی تقلید کی۔

''اللہ نے چاہا تو ہم ہزار جان تک پہنچ کر اس کی موت بنیں گے اور حسینہ کو آزاد کروائیں گے۔''

''اللہ تمہیں کامیاب کرے تاکہ ہماری روحیں بھی چین لے سکیں۔''

''آؤ بچو! میں تمہیں تمہاری دنیا میں چھوڑ آؤں۔''

عمران اور شہریار اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ مرینہ بیگم تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد گھر کے عقبی حصے میں آئیں۔ یہاں ایک دروازہ نظر آ رہا تھا اس نے الوداعی نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا اور پھر دروازہ کھول دیا۔ خود وہ مکان کے احاطے میں ہی کھڑی رہیں۔ شہریار کو جانے کیوں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ یہ دونوں اس کا خون ہیں۔ خاندان کی کسی بھی نسل سے تعلق رکھتے ہوں، لیکن ان کے انداز میں ایسی ہی اپنائیت تھی اور پھر جس طرح مرینہ بیگم ان دنوں کو دیکھ رہی تھی اس سے بے پناہ محبت ٹپک رہی تھی۔

''اچھا دادی حضور! اجازت دیجیئے گا۔'' جواب میں مرینہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ منہ سے وہ کچھ نہیں بولیں۔

''ہمیں باہر تک تو چھوڑنے کو آیئے۔'' عمران نے کہا۔ تب مرینہ بیگم کہنے لگیں۔

''نہیں بیٹے! میں اس مکان کے احاطے سے باہر نہیں آسکتی۔ ہم زندہ انسان تو نہیں روحیں ہیں اور کچھ پابندیاں ہوتی ہیں روحوں پر جو ہم پر بھی ہیں۔'' وہ آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ عمران نے شہریار کی طرف دیکھا۔ شہریار نے مرینہ بیگم کو آخری سلام کیا اور اس کے بعد وہ باہر نکل گئے۔ تین چار قدم آگے چل کر انہوں نے باہر کی دنیا کو دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جس جگہ وہ کھڑے تھے۔ وہ اسی مصور بابا کا کمرہ تھا...... اور مجہول مصور کسی تصویر پر کام کر رہا تھا۔ اس کا برش تیزی سے چل رہا تھا۔ شہریار اور عمران کو حویلی کی تصویر سے نکلتا دیکھ کر ایک ثانیہ کے لیے وہ ٹھٹھکا اس کا برش بھی رکا، پھر ان دونوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''چلو اب پھوٹ لو ادھر سے کھسکنے والی بات کرو۔ دروازہ کھولو اور ناک کی سیدھ میں چلنا شروع کر دو۔'' اور پھر وہ لاپرواہ ہو کر اپنے کام میں مگن ہو گیا۔

دونوں نے اچنبھے سے ایک دوجے کو دیکھا، مسکرائے، شانے اُچکائے اور مکان سے باہر نکل آئے۔

لیکن چند ہی لمحوں کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ ان کے سر چکرا رہے ہیں۔ اور اس کے بعد انہیں ہوش نہیں رہا۔ جب ہوش آیا تو انہوں نے دیکھا۔ وہ کسی کھلی جگہ بیٹھے تھے اور دور دور تک جنگل پھیلا ہوا تھا۔ عمران نے شہریار کو آواز دی تو شہریار چونک بولا۔

''یہ کیا ہوا عمران؟'' جواب میں عمران ہنس کر بولا۔

''جو ہونا چاہیے تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''ابھی ہم طلسمات میں پھنسے ہوئے ہیں۔''

''آہ اس طلسم سے نجات کیسے ملے گی۔'' اسی وقت ایک نہایت پستہ قد آدمی ان کے قریب آ گیا اس نے گردن خم کر کے کہا۔

''بارش ہونے والی ہے جناب! ہمیں بارش سے بچاؤ کے بندوبست کر لینے چاہئیں۔ ان جنگلوں میں بارش بہت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' عمران نے پوچھا۔

''جناب! بارش ہونے والی ہے آپ کو پتہ نہیں ہے کہ ادھر بارش کیا مصیبت پھیلاتی ہے۔'' دونوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا' شہریار نے کہا۔

''مگر بھائی تم کون ہو، تمہارا نام کیا ہے؟''

''کمال ہے' میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ بارش ہونے والی ہے، اپنا بچاؤ کر سکتے ہو تو کر لو۔ اور آپ میرا انٹرویو لینے کے چکر میں ہیں!'' تھوڑی دیر گزری تھی کہ ٹپ ٹپ شروع ہو گئی۔ پہلے چند لمحات تو بارش ہلکی رہی اس کے بعد تیز ہو گئی۔ بارش کی جل ترنگ کے ساتھ مختلف آوازیں سنائی دی تھیں۔ کبھی کبھی شیروں کی دھاڑیں بھی سنائی دے جاتیں۔ دوسرے جانور بھی دھاڑ چنگھاڑ رہے تھے۔ یہ آوازیں ان کے لئے انتہائی خوف کا باعث تھیں۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس جنگل میں انہیں کیا مشکلات پیش آئیں گی۔ بارش سے بچنے کا کوئی خاص بندوبست نہیں تھا۔ وہ چھوٹے قد کا آدمی جوان کے لئے انتہائی حیرت ناک تھا اور جو

ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیتا تھا۔ بس اپنی ہی ہانکتا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر شام ہوگئی اور اس کے بعد تاریک رات۔ بارش تیز سے تیز ہوتی جارہی تھی۔ رات کے دوسرے حصے میں تو بارش کی ایسی جھڑی لگی کہ صبح تک اس کا زور نہ ٹوٹا۔ وہ ایک درختوں کے جھنڈ تلے بیٹھے تھے اور بُری طرح ٹھٹھر رہے تھے۔ پھر صبح روشنی کی پہلی کرن نمودار ہوئی وہ لوگ خاموشی سے وقت کا انتظار کرنے لگے۔ چھوٹے قد کے آدمی نے انہیں بہترین ناشتہ پیش کیا......تو عمران نے کہا۔

''بھائی اس ساون بھادوں میں ناشتہ کہاں سے لائے ہو؟''

''پیڑ نہ گنیں جناب۔'' یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔

''کوڈو بھائی تم بتا دو یہ کونسی جگہ ہے۔ ہم تم سے زیادہ سوالات نہیں کریں گے بس یہ بتا دو کہ ہمیں کہاں تک چلنا ہے؟'' عمران نے کہا۔ اس نے از خود اس کا نام کوڈو رکھ دیا تھا۔

''جناب وقت خود اپنے فیصلے کر دیتا ہے آپ کو جہاں تک چلنا ہے آپ چلیں فکر نہ کریں۔''

یہ وحشت ناک جنگل دن کی روشنی میں اور خاص طور سے بارش کے عالم میں انتہائی خوفناک لگ رہے تھے۔ جنگل جل تھل ہو چکے تھے اور جنگلی جانور بھیگی بلی بنے ہوئے ان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ انہیں کئی خطرناک جانور نظر آئے جو پریشان حال ان کے سامنے سے گزر گئے تھے البتہ چھوٹے قد کا مالک شخص بارش سے کافی دلچسپی لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بارش رُک گئی اور چند لمحات کے بعد سورج بھی نظر آیا لیکن تھوڑی دیر کے لیے' اس کے بعد پھر درختوں کی چوٹیاں سیاہ ہونے لگی تھیں۔

''بارش ابھی مزید ہوگی جناب۔'' پستہ قد شخص بولا۔ اس کے جملے ابھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ بارش کے قطرے نمودار ہوگئے اور ایک بار پھر قطرے موسلا دھار شکل اختیار کر گئے۔ کوڈو نے جھٹ پٹ سے انہیں برساتیاں مہیا کر دیں۔ اس آدمی' کے علاوہ اور کوئی شخص یہاں نظر نہیں آیا تھا' غرضیکہ بارش تیز ہوتی چلی گئی' شہریار نے سوال کیا......؟

''کیا تم جادوگر ہو جو اس جنگل اور طوفانی بارش میں ہر چیز ہمارے لیے جھٹ سے پیدا کر دیتے ہو؟''

عمران نے کوڈو سے سوال کیا مگر جواب میں وہ کچھ نہ بولا۔

''بھائی! ہم جن حالات میں یہاں تک پہنچے ہیں ہوسکتا ہے تمہیں اس کا علم ہو' لیکن ذرا یہ بتاؤ گے' جنگلوں کا یہ سلسلہ کتنا لمبا ہے اور ہمیں کہاں تک جانا ہے؟'' شہریار نے کہا۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا'' بارش رُک جائے گی تو صحیح پتہ چلے گا۔''

وقت آگے بڑھا۔ آسمان سے گویا پرنالے چلنے لگے تھے البتہ ابھی تک جنگل میں پانی نہیں جمع ہوا تھا بلکہ تیز دھاریں درختوں کے درمیان میں بل کھاتی مختلف سمت نکل رہی تھیں۔ دن کا وقت تھا لیکن بجلی کے کوندے صاف دکھائی دے رہے تھے' بادل بھی خوفناک انداز میں گرج رہا تھا۔ درخت اب بھوت لگنے لگے تھے۔ بارش کا شور بدستور تھا لیکن اچانک انکے کانوں نے ایک اور شور سنا اور ایک لمحے کے لئے ان کے قدم ٹھٹھک گئے۔ یہ عجیب سا خوفناک شور تھا جس میں جانوروں کے چیخنے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ ہاتھی کی چنگھاڑ کے ساتھ بھینسوں کے ٹکرانے کی آوازیں' پھر ایک دل ہلا دینے والی کڑک سنائی دی اور پھر فضا میں ایک مسلسل گرج سنائی دینے لگی۔ اس گرج میں درختوں کے ٹوٹنے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ یہ آوازیں کافی دور سے آتی محسوس ہورہی تھیں لیکن رفتہ رفتہ انہی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

''یہ...... یہ...... یہ کیا ہے......؟'' شہریار نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''پانی جناب پانی۔''

''کیا مطلب ہے؟'' عمران وحشت بھرے لہجے میں بولا۔

''کوئی طوفانی ریلا۔'' چھوٹے قد کے آدمی نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک شمالی سمت انہیں اونچے درختوں کی چوٹیاں سرنگوں ہوتی دکھائی دیں۔ ان کے موٹے تنے تڑک تڑک کر ٹوٹ رہے تھے۔ پانی کی ایک طوفانی دیوار برق رفتاری سے اپنی زد میں آنے والی ہر شے کو سمیٹتی لپیٹتی ہوئی ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس وقت کوڈو کی دہشت بھری آواز ابھری۔ وہ پتہ نہیں کون سی زبان میں کیا کیا چیخ رہا تھا پھر اس نے ان دونوں کی برساتیاں پکڑیں اور انہیں کھینچتا ہوا ایک سمت دوڑ پڑا' لیکن ان کی رفتار پانی کی رفتار سے

زیادہ نہیں تھی۔

پانی کی مہیب دیوار ہولناک گرج کے ساتھ قریب سے قریب تر آتی جارہی تھی اوراب کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی وہ خود بھی جانتے تھے کہ موت نے اچانک انہیں تاک لیا ہے اورموت بجلی کی سی تیزی سے ان کی طرف دوڑ رہی ہے اس حالت میں انہیں فطری طور پر پانی کی مخالف سمت دوڑنا تھا لیکن یہ کوئی حل نہیں تھا کیونکہ پانی کا طاقت ور ریلا چند ہی لمحات میں ان تک پہنچنے والا تھا جس نے بڑے بڑے درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ کر اپنے بہاؤ پر لے لیا تھا اس ریلے کے سامنے ان کی کیا حیثیت تھی؟ وہ جان توڑ کر بھاگ رہے تھے۔کوڈو کی رفتار ان سے بھی تیز تھی اور شاید اس کے ذہن میں کچھ اور بھی تھا کیونکہ اچانک ہی اس نے سیدھ میں دوڑتے دوڑتے رخ تبدیل کیا اور ایک طرف اشارہ کرکے بولا۔

''اِدھر اِدھر...... اِدھر آجاؤ...... اِدھر آجاؤ۔'' وہ بے اختیار اس طرف دوڑ پڑے' بلاشبہ اس وقت پراسرار کوڈو نے ان کے ساتھ بہت بڑا احسان کیا تھا۔ وہ درخت ان کی نگاہوں میں نہیں آیا تھا جس کا تنا تقریباً نوفٹ قطر کا تھا اور جس کی لاتعداد شاخیں دُور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ شاخیں عام درختوں کے تنوں سے بھی کہیں زیادہ موٹی تھیں۔ان کا گائیڈ کوڈو دوڑ کر کسی بندر کی مانند درخت پر چڑھ گیا اور ان دونوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ بمشکل تمام وہ درخت کے اوپر والے حصے تک پہنچے تھے۔ پانی کی بلندی کا اندازہ نہیں ہوا تھا اس لئے ضروری تھا کہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر پہنچا جائے۔ درخت پر پہنچنے کے بعد البتہ ان کا ایک دوسرے سے رابطہ نہ رہا اور وہ ایک دوسرے کا خیال نہ کرسکے۔طوفان مہیب چنگھاڑ کے ساتھ ہر شے کو دھکیلتا ہوا اس درخت کی طرف لپکا اور اتنی قوت سے اس سے ٹکرایا کہ پورا درخت بری طرح ہل گیا۔اس کا سارا تنا بھی پانی سے ڈھک گیا اور پھر شاخیں بھی پانی میں ڈوبنے لگیں۔ ریلا آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا تھا۔خوفناک گرج سماعت کی برداشت سے کہیں زیادہ تھی۔ ان کے ذہن سُن ہوگئے اور کچھ دیر کے لئے وہ اپنے سوا ساری کائنات سے بیگانہ ہوگئے۔ البتہ ریلا آگے بڑھ گیا تو صورتِ حال بہتر ہوگئی۔ پانی اب بھی درخت سے ٹکریں مارتا ہوا آگے بڑھ رہا

تھا۔ اس کے ساتھ پتہ نہیں کیا کیا کچھ بہہ رہا تھا۔ درختوں کے ٹوٹے ہوئے تنے' شاخیں' سانپ' ننھے ننھے کمزور جانور جو پانی کی ضرب سے ہی مر گئے تھے۔ دیوہیکل درندے اور جانے کیا کیا۔ پانی شاخوں سے نیچے ہو گیا تھا لیکن آنکھیں کھولنا اب بھی مشکل ہو رہا تھا تاہم شہریار نے عمران کو تلاش کیا جو قریب ہی کی دوسری شاخ پر تھا اور پتوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دفعتاً عمران نے کہا۔

''وہ آدمی کدھر گیا؟''

''میں یہاں ہوں جناب! میری طرف سے آپ بے فکر رہیں۔'' کوڈو کی آواز انہیں اپنے پیچھے سے سنائی دی اور ان کی گردنیں گھوم گئیں۔ وہ ایک چوڑی شاخ پر اُگی ہوئی دو ٹہنیاں پکڑے بیٹھا تھا اور ان لوگوں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پھر وہ پھدکتا ہوا اس شاخ کی طرف بڑھنے لگا جدھر یہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ کھانے کے سامان کے کچھ تھیلے اس کے پاس تھے جنہیں اس نے اپنے دونوں کندھوں سے لٹکایا ہوا تھا۔ پہلے ان لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا تھا لیکن اب انہیں یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ شخص کسی وجہ سے ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ پانی جھاگ اڑاتا درخت سے ٹکراتا گزر رہا تھا اور اس کے ساتھ بہنے والی بہت سی چیزوں کو اس مضبوط درخت کے سہارے رُکنے کا موقع مل گیا تھا۔ چنانچہ تنے کے گرد لکڑیوں کا پھیلاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے بہت قریب بیٹھے ہوئے تھے حالانکہ چھوٹے قد کا آدمی دوسری شاخ پر تھا لیکن ان سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ کچھ ایسے اعصابی دباؤ کا شکار ہو گئے تھے کہ ان کی زبانیں گنگ تھیں۔ ان کی دہشت سے پھٹی آنکھیں پانی کی حشر سامانیاں دیکھ رہی تھیں۔ پانی کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا ایک تیندوا پوری قوت سے درخت کے تنے سے ٹکرایا اور اس کے نوکیلے خونخوار پنجوں نے درخت کے تنے کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن پانی کی ایک طوفانی لہر اسے بہاتی ہوئی آگے لے گئی۔ لمبے لمبے سانپ درخت کے تنے سے ٹکراتے اس کی جانب لپکتے لیکن پانی کی قوت کے آگے بے بس ہو جاتے وہ گہری گہری سانسیں لے کر اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ پانی کا زور ٹوٹنے لگا۔ درخت کا تنا پانی میں کافی ڈوبا ہوا تھا مگر طوفان کا زور ٹوٹنے کی آس بندھ گئی

تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ پانی اب اس سے زیادہ بلند نہیں ہوگا۔ تن آور درخت نے ان کی زندگی بچانے میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ پتہ نہیں کوڈو نے اس درخت کا انتخاب کیسے کرلیا تھا۔ بہرحال ان کی زندگی بچ گئی تھی۔ ریلے کی توڑ پھوڑ کی آوازیں کافی دور سنائی دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ سکون ہوتا جارہا تھا لیکن پانی کے بہاؤ میں ابھی کوئی زیادہ کمی نہیں ہوئی تھی۔ کوڈو نے انکشاف کیا کہ جب تک یہ ریلا اپنے سارے حجم کے ساتھ پھیل نہیں جاتا پانی ساکت نہیں ہوگا۔ جب پانی کے بہنے کی رفتار انتہائی سست ہوگئی تو ان کی صلاحیتیں واپس آنے لگیں۔ گو دماغ میں اب بھی شدید سنسناہٹ ہو رہی تھی لیکن غیرمعمولی اعصاب کے مالک دونوں دوست، ایک دوسرے کے جانثار ایک دوسرے کو سنبھالنے میں مصروف تھے۔ عمران نے شہریار کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''واقعی جو کچھ بھی ہے عجیب تر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم زندگی کے ایسے ایسے لمحات سے نبرد آزما ہو چکے ہیں کہ اگر کبھی اس کے متعلق کہنا چاہیں تو شاید ان لمحات کی ترجمانی نہ کرسکیں گے۔''

''اگر یہ درخت نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟''

''کچھ نہیں ہوتا یار! تمہیں پتہ ہے کہ ہم ایک طلسماتی زندگی سے گزر رہے ہیں۔''

شہریار ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ پانی کا بہاؤ اب بالکل ختم ہوگیا تھا اور بس ہلکی ہلکی آوازیں ابھر رہی تھیں' وہ درختوں کی شاخوں پر خود کو سنبھالے ہوئے بیٹھے تھے کہ اوپری شاخ سے کوڈو کی آواز ابھری۔

''تم لوگوں کو اگر کچھ کھانے کی طلب ہو تو مجھے بتاؤ میں تمہیں دے سکتا ہوں۔''

عمران پٹاک سے بولا۔

''گرم چائے پلا سکتے ہو......؟''

''کیوں نہیں۔'' کوڈو نے کہا اور اس کے بعد حیرت انگیز طور پر گرم گرم چائے کے دو پیالے ان کے ہاتھوں میں تھما دیئے جن کی یہاں ان حالات میں موجودگی سمجھ سے بالاتر تھی۔ عمران نے معنی خیز نگاہوں سے شہریار کو دیکھا اور شہریار نے گردن ہلاتے

ہوئے کہا۔

''اس وقت کچھ نہیں' چائے اور صرف چائے۔'' اگر عام حالات ہوتے تو اس وقت چائے کا تصور حیرت زا ہوتا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ وہ جن حالات سے گزر رہے ہیں ان میں سب کچھ ممکن ہوسکتا ہے' چنانچہ وہ چائے کے گرم گرم گھونٹ معدے میں اتارنے لگے' تھوڑی دیر بعد کوڈو نے ان سے کہا۔

''ایک بار پھر ہمیں پانی سے نمٹنا ہوگا۔''

''کیا مطلب ہے؟'' جواب میں وہ خاموش ہوگیا۔ اس کے الفاظ ان لوگوں کو بہت زیادہ خوف زدہ کردینے والے تھے۔ پانی کا جو خوفناک ریلا انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ ان کے سانس روکنے کے لئے کافی تھا لیکن اس سے ان کے اندر کافی قوت برداشت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ پانی کی حشر سامانیاں اب بھی دیکھ رہے تھے۔ بہنے والی چیزیں اب بھی سست روی سے بہہ رہی تھیں۔ گرما گرم چائے نے انہیں سکون نصیب کیا انہوں نے آرام کے لئے بہتر جگہ تلاش کرنے کے لیے نظریں اِدھر اُدھر گھمائیں۔ ابھی نیچے اترنے کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جس شاخ پر وہ تھے وہی غنیمت تھی کیونکہ سب سے زیادہ چوڑی تھی اور اس میں جگہ جگہ دوشاخے اُگے ہوئے تھے اور ان دوشاخوں کی وجہ سے نیچے گرنے کا خطرہ نہیں تھا۔ ویسے نیچے گرنے کا خیال بھی سوہانِ روح تھا چونکہ پانی میں جھاڑیوں میں لپٹے ہوئے لاتعداد خوفناک قسم کے سانپ اور دوسرے زہریلے جانور نظر آرہے تھے جو بظاہر تو مردہ لگ رہے تھے لیکن کون جانے ان میں سے کون زندہ ہو۔ کئی سانپوں کو انہوں نے درخت پر چڑھتے ہوئے دیکھا تھا اور عین ممکن ہے کوئی سانپ درخت کے اوپر چڑھ بھی آیا ہو۔ اس صورت حال کو وہ مرتے دم تک فراموش نہیں کرسکتے تھے۔ یہ منظر پچھلے تمام مناظر سے زیادہ ہولناک تھا۔ وہ جانوروں کی طرح درختوں کی شاخوں سے لپٹے ہوئے تھے اور نیچے حدنگاہ پانی بہہ رہا تھا۔ درخت کے اوپر وہ جس حد تک چڑھے تھے اس سے اندازہ ہوجاتا تھا کہ پانی کی گہرائی کتنی ہے اور یہ گہرائی خطرناک تھی۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ بارش رُک چکی تھی لیکن آسمان پر بادلوں کا بسیرا تھا اور کبھی کبھی ان کی گڑگڑاہٹ

بھی سنائی دیتی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ بارش دوبارہ ہوگی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ یہ تن آور درخت اپنی جگہ برقرار نہ رہ سکے اور پانی کا ریلا اسے اکھاڑ دے۔ ویسے تو یہ مضبوط عمارت کی طرح زمین میں ایستادہ تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلنے کی ہمت بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ بھوک سے آنتیں قل ھو واللہ پڑھ رہی تھیں اور دونوں بھوک مٹانے کے لئے کوڈو کی جانب اُمید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے بھی جیسے ان دونوں کی بات سمجھ لی تھی وہ بولا۔

''میرے پاس کھانے کی چیزیں موجود ہیں۔'' پھر اس نے اپنے تھیلے سے انہیں کھانے کا سامان مہیا کیا جس سے انہوں نے پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کرلیا۔ رات کی تاریکی پُر ہول جنگل پر مسلط ہوگئی۔ اس وقت اسے جنگل کہنا بھی عجیب لگتا تھا۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے سمندر میں درخت آگ آئے ہوں یا وہ کسی وسیع و عریض جھیل میں لٹکے ہوں۔ ان کے ذہنوں پر تھکن بھی طاری تھی۔ آہستہ آہستہ یہی تھکن غنودگی میں ڈھل گئی اور غنودگی نیند میں تبدیل ہوگئی۔ وہ گہری نیند سوتے رہے اور وقت گزرتا رہا۔ نیند کی دیوی انہیں خوابوں کی دنیا میں اڑاتی پھرتی رہی۔ رات گزر گئی اور دوسری صبح بیدار ہو کر انہوں نے نیچے دیکھا۔ پانی حیرت انگیز طور پر ختم ہوچکا تھا۔ عمران نے شہریار کی طرف دیکھا اور دونوں کوڈو کو دیکھنے لگے جو ابھی تک ان کا ساتھی اور رہنما بنا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ درخت سے نیچے آگئے۔ وہ ہولناک وقت گزر چکا تھا جس نے انہیں زندگی سے دور کر کے موت کے قریب کر دیا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھنے لگے۔ نیچے کیچڑ ہو رہی تھی۔ جنگل میں جو ہولناک مناظر بکھرے ہوئے تھے وہ لرزہ براندام کرنے کے لیے کافی تھے۔ چند قدم کے بعد ہی طوفان کی ہولناک تباہ کاریوں کا اندازہ ہونے لگا۔ جو درخت جڑ سے اکھڑ کر پانی کے ریلوں کے ساتھ بہہ گئے تھے ان کی جگہوں پر گہرے گہرے گڑھے بن گئے تھے جن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ جھاڑ جھنکار اور درختوں کی ٹوٹی ہوئی شاخوں نے بعض مقامات پر راستے بالکل بند کر دیئے تھے۔ ایسی جگہوں پر سے بہت مشکل سے گزرا جاسکتا تھا اور سب سے زیادہ ہولناک شے ان میں پھنسی ہوئی جانوروں کی لاشیں تھیں۔ نیل گائے' بارہ سنگھے' ہرن' تیندوے اور بعض جگہ شیر بھی اس

آفت کا شکار ہوئے پڑے تھے۔

''عمران! کیا محسوس کر رہے ہو؟''

''ہاں میں مطمئن ہوں' اور جانتا ہوں زندگی اللہ کی امانت ہے اور اس امانت کو وہی واپس لے سکتا ہے۔ ہمیں حالات سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہم حسینہ کی زندگی کو خراج پیش کر رہے ہیں اور اگر اس میں ہماری زندگی کام آ جائے تو ہم اسے اپنا اعزاز سمجھیں گے۔'' عمران نے پُرجوش انداز میں کہا۔

''بالکل بالکل۔'' شہریار نے انتہائی پُراعتماد لہجے میں کہا۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی' وہ لوگ بدستور آگے بڑھ رہے تھے۔ بظاہر کوئی منزل نہیں تھی لیکن اس ویرانے میں رُک کر کرتے بھی کیا؟ اچانک عمران کو کچھ خیال آیا......

''شہریار! آخر یہ شخص کون ہے ہم کم از کم اس سے معلوم تو کریں؟''

''تھوڑا وقت اور نکال لیں' اس کے بعد دیکھتے ہیں کہ کیا صورتحال ہوتی ہے۔'' چھوٹے قد کا آدمی ابھی تک تو ان کے لئے کارآمد ثابت ہوا تھا اور انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ کام کی چیز ہے۔ وہ آگے آگے چل رہا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس طرف پانی کی تباہ کاری کے آثار نہیں ہیں۔ خشک زمین شروع ہو گئی تھی اور جنگل بھی بہتر حالت میں تھا۔ اب وہ سوچ رہے تھے کہ کچھ وقت رکیں کہ چھوٹے قد والا آدمی رُک گیا اور اِدھر اُدھر صورتحال کا جائزہ لے کر اس نے کہا۔

''ہمیں ابھی سیدھا ہی چلنا چاہیے شام تک کافی دور نکل جائیں گے۔''

''ایک منٹ...... ایک منٹ بات سنو تم۔'' عمران نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا اور وہ شخص چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

''کیا تم ہمیں بتانا پسند کرو گے کہ تم کون ہو؟'' ابھی انہوں نے یہی سوال کیا تھا کہ کوڈو نے ہاتھ فضا میں بلند کئے اور ایک لمحے کے اندر اندر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگے لیکن تاحد نظر چھوٹے قد والے کا نام و نشان نہیں تھا۔ عمران نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور شہریار کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ شہریار نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

''خدا کی پناہ......آخر ہم کب ان مشکلات سے نکلیں گے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ کچھ نامعلوم اور نادیدہ دوست طاقتیں ہماری راہنمائی کر رہی ہیں۔ کوڈو کا بارش سے پہلے نمودار ہونا اور اب غائب ہو جانا اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔''

''مشکلات بڑی سے بڑی پیش آ رہی ہیں لیکن ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہمارا یہ سفر جاری ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتے کب تک جاری رہے گا۔ کم از کم ہمیں اس بات کا اطمینان ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ حسینہ کی تلاش کے سلسلے میں ہے۔ اور اگر روح کا روح سے کوئی رشتہ ہے تو حسینہ جس حال میں بھی ہے اسے کم از کم یہ اندازہ ضرور ہوگا کہ وہ تنہا نہیں ہے اور کوئی اس کی تلاش میں زندگی کی بازی لگائے ہوئے ہے۔'' شہریار نے مسکرا کر عمران کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

''میرے دوست اگر زندگی نے وفا کی اور ہمیں جینے کے لئے کوئی وقت مل گیا تو ہماری یہ مہم جوئی یادگار رہے گی۔ آؤ آگے بڑھیں۔''

''درختوں کا یہ سلسلہ دو فرلانگ چلنے کے بعد ختم ہو گیا۔ اب سیاہی مائل چٹانیں کھلے میدانوں میں بکھری نظر آ رہی تھیں جن کے درمیان زمین بھربھری سی تھی۔ دھوپ تیز تھی۔ چونکہ وہ نمی میں سفر کرتے رہے تھے اس لئے چمکدار دھوپ انہیں بہت اچھی لگی۔ کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ زندگی معمول کے مطابق تھی البتہ پتھروں میں پائے جانے والے حشرات الارض جگہ جگہ نظر آتے رہے۔ خاص قسم کی زہریلی جھاڑیاں جن میں ناگ پھنی' تھوہر وغیرہ دور دور تک بکھری ہوئی تھیں۔ سورج سر سے گزرتا ہوا اپنا سفر مکمل کر رہا تھا۔ پھر انہوں نے کچھ آبی پرندے دیکھے جو مخصوص پرواز کر رہے تھے۔ وہ آگے بڑھے تو انہیں ایک چھوٹی سی ندی نظر آئی جس کا پانی بے حد شفاف تھا اور اس کے کنارے سرسبز تھے ندی دیکھ کر وہ فرحت بخش احساسات سے سرشار ہونے لگے۔

''کیا خیال ہے اس ندی میں نہایا جائے؟''

''یار ہم ہر وہ کام کر سکتے ہیں جو دل چاہے' ہمیں کسی چیز کا خوف نہیں کرنا چاہیے۔'' عمران نے کہا اور پھر ندی کنارے ایک عمدہ جگہ تلاش کر کے بیٹھ گئے۔ یہاں سے ندی کا نظارہ بے حد خوبصورت تھا۔ آبی پرندوں کی ڈاریں پرواز کر رہی تھیں۔ غول کے غول

کنارے پر جاتے اور ذراسی آہٹ پا کر اُڑ جاتے۔ ان کی آوازیں کانوں کو بہت بھلی لگ رہی تھیں شاید اس لئے کہ وہ زندگی کے بدترین حالات دیکھ چکے تھے۔ وقت کتنی تیز رفتاری سے گزرتا ہے اس کا اندازہ انہیں ہو رہا تھا۔ رات ہوگئی اور وہ آرام کرنے لگے۔ جو کچھ کھانے پینے کو اِدھر اُدھر سے ملا اسے کھا کر پیٹ کی آگ بجھائی۔ اس شخص کے غائب ہو جانے کا انہیں بڑا دکھ تھا۔ اگر اس سے سوال نہ کیا جاتا تو شاید وہ ان کے ساتھ ہی رہتا ایک رہبر کی ضرورت کس قدر ضروری ہوتی ہے اس کا اندازہ انہیں ہو رہا تھا۔ دفعتاً عمران چونک پڑا۔ اس نے شہریار کو اشارہ کیا اور بولا:

''اِدھر دیکھو شہریار یہ کیا چیز ہے؟'' شہریار بھی اُدھر دیکھنے لگا۔ چاندنی کے سائے میں ندی کے شفاف بہاؤ پر کچھ سیاہی نظر آرہی تھی۔ کچھ لمحے دور سے وہ اسے دیکھتے رہے۔ وہ سیاہی جیسے ہی قریب آئی انہیں اندازہ ہوگیا کہ کوئی تابوت بہتا ہوا آرہا ہے۔ شہریار کے منہ سے نکلا۔

''اس میں کیا ہے؟'' لیکن اس سے پہلے کہ شہریار کچھ اور کہتا عمران نے اپنی قمیض اتاری اور دوڑتا ہوا ندی میں کود گیا۔ شہریار چیختا ہی رہ گیا۔ عمران بہت اچھا تیراک تھا۔ جلد ہی وہ اس تابوت کے قریب پہنچ گیا۔ تابوت میں کنڈے لگے ہوئے تھے۔ تابوت لکڑی کا تھا اس لئے تیر رہا تھا۔ عمران نے اس کا ایک کنڈا پکڑا اور ندی کے کنارے کی جانب تیرنے لگا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ ندی کے کنارے تک لے آیا۔ اس دوران شہریار بھی کنارے تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے عمران کا ہاتھ پکڑا اور دونوں نے تابوت کو خشکی پر کھینچ لیا۔ عمران اپنے لباس سے پانی نچوڑنے لگا۔ بال سنوار کر حلیہ درست کیا۔ اس دوران شہریار دلچسپی سے اس تابوت کو دیکھتا رہا جو بڑا خوبصورت تھا اور اس پر سونے کی پتری سے نقش و نگار بنائے گئے تھے لیکن اس میں کوئی تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ دونوں دوستوں نے دھڑکتے دل کے ساتھ تابوت کا ڈھکن ہٹایا اور اس میں موجود لاش کو سنسنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ یہ ایک جوان آدمی کی لاش تھی۔ لاش کا چہرہ بالکل زندہ انسانوں جیسا تھا۔ شہریار نے کہا......

''زندہ ہے؟''

''پتہ نہیں۔''

''اب کیا کریں اسے ندی میں واپس پھینک دیں۔''

''نہیں یار پتہ نہیں کس کی لاش ہے اب جب ہمارے سامنے آ گئی ہے تو کیوں نہ ہم اسے دفن کر دیں۔''

''کیا پتہ یہ مسلمان ہے یا ہندو؟''

''اس کا پتہ تو آسانی سے چل جائے گا۔'' عمران نے معنی خیز انداز میں کہا اور شہریار خاموش ہو گیا۔ پھر دونوں نے مل کر لاش کو تابوت سے باہر نکالا اسے زمین پر لٹا کر وہ تابوت کا جائزہ لینے لگے۔ تابوت میں کچھ نہیں ملا تو وہ لاش کی جانب متوجہ ہو گئے۔ دفعتاً لاش نے آنکھیں کھول دیں اور اس کی آواز نکلی۔

''اے اے بھائی کیا کرتے ہو...... کیا کرتے ہو......؟'' دونوں اچھل کر پیچھے ہٹ گئے۔ ان کی پھٹی پھٹی آنکھیں اس لاش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ یہ ایک نوجوان آدمی تھا اور اچھی شکل و صورت کا مالک تھا۔

''تم زندہ ہو۔'' عمران نے پوچھا؟

''جی ہاں میں زندہ ہوں اور ایک مظلوم انسان ہوں۔''

''وہ کیسے......؟''

''بس گھوڑوں کی تجارت کرتا ہوں اور اپنے گھوڑے لے کر سفر کر رہا تھا کہ راستے میں ڈاکو مل گئے اور انہوں نے مجھے لوٹ لیا۔ میرے گھوڑے تو لے گئے لیکن مجھے اس تابوت میں بند کر کے ندی میں پھینک دیا۔ تم نے اب مجھے ندی سے نکال لیا۔''

''اب تو تم بچ گئے ہو خدا کا شکر ادا کرو۔''

''تمہارا بھی بے حد شکریہ۔''

''یہ کونسی جگہ ہے۔''

''یار کمال کرتے ہو۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں ہے کہ میں کہاں سے بہتا ہوا آیا ہوں یہ بتاؤ کچھ کھانے پینے کو مل جائے گا؟''

''ہم خود بھوکے ہیں تمہیں کیا کھانے کو دے سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے' اللہ مالک ہے۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟'' شہر یار نے سوال کیا۔

''چھوڑو نام وام میں کیا رکھا ہے۔''

''بتانا نہیں چاہتے؟''

''تم سے بھی تمہارا نام نہیں پوچھوں گا۔''

''تو پھر دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

''نہیں بھائی رہوں گا تمہارے ساتھ مجھے ڈر لگ رہا ہے' ڈاکو یقیناً یہیں کہیں اسی علاقے میں ہوں گے۔''

''تم نے ہمیں بھی ڈرا دیا ہے۔''

''ارے چھوڑو دھوکے سے انہوں نے مجھ پر قابو پا لیا ورنہ میں بہت بہادر ہوں۔ کبھی وہ میرا مقابلہ کر کے دیکھیں۔ کھڑاک کر دوں گا ان کمینوں کا۔'' اس شخص نے کہا اس دبلے پتلے کانگڑی پہلوان کی بڑھکیں سن کر دونوں مسکرانے لگے۔ اور جب وہ آگے چلنے لگے تو وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

''تم کہاں آ رہے ہو؟'' شہر یار نے سوال کیا۔

''کہہ چکا ہوں نا کہ تم سے الگ نہیں رہ سکتا۔'' وہ لوگ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئے۔ تھوڑے فاصلے پر انہیں کچھ درخت نظر آئے جن میں سبز رنگ کے پھل لٹکے ہوئے تھے۔ اس وقت انہیں شدید بھوک لگ رہی تھی۔ اس لیے دوڑتے ہوئے آگے بڑھے لیکن درخت کافی اونچا تھا' اسے ہلانے کی کوشش ناکام رہی اور وہ بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے تبھی اس شخص کی ہنسی سنائی دینے لگی۔

''کیوں کہتے ہیں نا کبھی نہ کبھی کھوٹا سکہ بھی کام آ جاتا ہے۔''

''یار کیا تم درخت پر چڑھنا جانتے ہو؟''

''درختوں پر چڑھنا کون نہیں جانتا' لیکن اتنے اونچے درخت پر۔''

''یہی تو ہمارے لئے پریشانی کا باعث ہے ورنہ ہم بھی درخت پر تو چڑھ ہی سکتے تھے۔''

''پھل چاہئیں ناں لاتا ہوں...... ابھی لاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا پھر جس

طرح وہ درخت پر چڑھا وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ یوں لگا جیسے بلی پنجوں کے بل درخت پر چڑھ گئی ہو۔ آن کی آن میں وہ اوپر تھا۔ پھر وہ پھل توڑ کر نیچے پھینکنے لگا۔ پہلے شہریار نے وہ پھل چکھ کر دیکھا۔ یہ سیب نہیں تھا لیکن سیب ہی کی طرح اس کے اندر گودا تھا۔ انتہائی لذیذ اور میٹھا اور پھر انہوں نے پیٹ بھر کر پھل کھائے وہ گمنام شخص بھی اوپر بیٹھ کر پھل کھاتا رہا پھر بہت سے پھل توڑ کر نیچے پھینک کر بولا۔

''آگے کے لئے رکھ لو کام آئیں گے۔'' انہوں نے واقعی پھلوں سے اپنی جھولیاں بھر لی تھیں۔

''اب تو تم مجھے اپنے سے دور نہیں کرو گے؟'

''نہیں دوست تم نے واقعی اس وقت ہماری بڑی مدد کی ہے۔'' وہ ہنسنے لگا پھر بولا۔

''مدد تو میں تمہاری ایسی کروں گا کہ یاد رکھو گے ساری زندگی۔'' اس کے لہجے میں کوئی خاص بات ضرور تھی لیکن یہ دونوں اس خاص بات کو سمجھ نہیں سکے تھے۔ وہ رات بھی گزر گئی۔ دوسرے دن آرام کرنے کے بعد وہ پھر آگے بڑھے۔ دوپہر ہوئی تو دور سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی اور وہ سب چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ چار پانچ گھوڑے وہاں بندھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کی پیٹھ پر کچھ سامان لدھا ہوا تھا' اور باقی خالی پیٹھ تھے' اچانک ہی گمنام شخص چیخ پڑا۔

''میرے گھوڑے...... میرے گھوڑے' اس کا مطلب ہے کہ وہ ڈاکو بھی آس پاس ہی موجود ہیں۔''

''یہ تو خطرناک بات ہوئی۔''

''ارے تم پروا ہی مت کرو پہلے بے خبری میں مار کھا گیا تھا۔ اب نظر آئے تو چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا انہیں۔'' اس شخص نے کہا اور دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ اس کی نظریں آس پاس کا جائزہ لے رہی تھیں لیکن گھوڑوں کے آس پاس دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ عمران اور شہریار بھی مستعد ہو گئے۔ بات ڈاکوؤں کی تھی حالانکہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا لیکن بہرحال ڈاکو تو ڈاکو ہی ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ شخص گھوڑوں کے پاس پہنچ گیا۔ گھوڑے اسے دیکھ کر ہنہنا رہے تھے اور اس سے محبت کا اظہار کر رہے تھے جس سے

اندازہ ہوتا تھا کہ گھوڑوں کا مالک یہی شخص ہے۔ اس نے گھوڑوں کی لگامیں کھولیں اور پھر ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

''کیا تم لوگ گھوڑوں کی سواری کرنا جانتے ہو؟'' عمران اور شہریار دونوں کو ہی گھوڑے کی سواری کرنا آتی تھی۔ عمران نے پوچھا۔

''کیوں......تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''خدا کے لئے جلدی کرو' ان گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار ہو جاؤ' ہم لوگ یہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔'' عمران اور شہریار نے سوچا کہ چلو پیدل چلتے چلتے تھک بھی گئے ہیں اور پھر یہ سفر نجانے کتنا طویل ہو' کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے' چنانچہ گھوڑوں کی سواری کی جائے۔ باہم مشورے کے بعد وہ گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ تیسرے گھوڑے پر وہ شخص سوار تھا۔ باقی ایک گھوڑوں پر کھانے کی اشیاء اور دوسرے پر ترپال لدے ہوئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے گھوڑے سرپٹ دوڑا دیئے۔ ہر طرف ویرانیاں ہی ویرانیاں، دُور دُور تک بندہ نہ بندے کی ذات۔ چلتے چلتے کئی گھنٹے گزر گئے۔ کافی فاصلہ طے ہو گیا تو وہ شخص خوش نظر آنے لگا۔

وہ شخص اپنے گھوڑے پر آگے آگے چل رہا تھا لیکن کبھی کبھی پیچھے بھی ہو جاتا تھا۔ اب سامان والے ایک گھوڑے کی لگام عمران اور دوسرے کی لگام شہریار کے ہاتھ میں تھی۔ یہاں کی زمین عجیب سی پلپلی تھی۔ ایک جگہ انہیں چلتے چلتے دلدل اُبلتی نظر آئی۔ اس سے ہلکا ہلکا دھواں خارج ہو رہا تھا انہوں نے پہلی بار ابلتی ہوئی اس دلدل کو دیکھا تھا ان کے دلوں میں خوف بسیرا کرنے لگا۔

''یہ تو بہت خطرناک جگہ ہے۔'' شہریار نے سکوت توڑا۔

''واقعی یار!'' عمران نے کہا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت ہی خوفناک جگہ ہے احتیاط سے چلنا ہو گا۔''

''دلدل کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کہاں ہے؟ بس اللہ ہی خیر کرے۔'' اس شخص نے کہا۔

سفر جاری رہا۔ اب باقاعدہ دلدلی جنگل شروع ہو چکا تھا۔ جگہ جگہ دلدلی تالاب نظر آ رہے تھے۔ معاً شڑاپ شڑاپ کی آوازیں آنے لگیں۔ اچانک ہی عمران کا گھوڑا زور سے اچھلا' عمران نے اپنے گھوڑے کو سنبھالنے کی کوشش کی تو شہریار کا

گھوڑا بھی اچھل گیا انہوں نے خوف زدہ نگاہوں سے گھوڑوں کو دیکھا اور پھر پیچھے کی طرف دیکھنے لگے اور پھر یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں کیونکہ وہ گم نام شخص ان کے گھوڑوں پر پیچھے سے ہنٹر برسا رہا ہے اور گھوڑے اسی وجہ سے اچھلے تھے۔ وہ دہشت سے اس شخص کو دیکھنے لگے۔ اس نے گھوڑوں کو دو چار ہنٹر اور لگائے گھوڑے بدک کر پہلے کھڑے ہو گئے پھر دگڑ دگڑ دوڑتے دلدل کی طرف بڑھنے لگے۔ شہریار اور عمران نے دوسرے گھوڑوں کی لگامیں چھوڑ دیں اور اپنے اپنے گھوڑوں کی راسیں پوری قوت سے کھینچ لیں......لیکن گھوڑے اپنی ہی قوت میں دلدل میں اُتر گئے۔ اور پھر دلدل نے ان کے پاؤں پکڑ لئے۔ عمران اور شہریار نے جب پلٹ کر دیکھا تو وہ شخص دلدل کے کنارے اپنے گھوڑے پر سوار کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔ کچھ دیر دونوں اسے دیکھتے رہے اور پھر انہوں نے اسے اسی طرح قہقہے بلند کرتے ہوئے واپسی کے راستے پر گھوڑا دوڑاتے ہوئے دیکھا۔ عمران اور شہریار کے منہ سے مارے خوف کے آواز تک نہ نکل سکی۔ وہ دونوں گھوڑے بھی ان کے ساتھ تھے جن پر سامان لدا ہوا تھا۔ اب دلدل میں وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے تھے کنارہ بھی دور رہ گیا تھا' عمران نے شہریار کی طرف دیکھا اور بولا۔

''شہریار! یار میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کیا جائے۔ اگر ہم گھوڑوں سے نیچے اترتے ہیں تو یہ دلدل اس طرح ہمیں نگل لے گی ان گھوڑوں کو دیکھو ان کے پاؤں اندر دھنستے جا رہے ہیں۔'' شہریار نے بے بس نگاہوں سے عمران کو اور پھر سامان سے لدے گھوڑوں کو دلدل کی تہہ میں اترتے دیکھا اور مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''ٹھیک ہے۔ عمران موت تو ہمیں لمحہ بہ لمحہ مل رہی ہے زندگی کس طرح ملنی ہے یہ اللہ ہی جانتا ہے۔''

''میرا ایمان ہے شہریار! ہمیں زندگی ضرور ملے گی' ہم یہاں مرنے کے لئے نہیں آئے......ہم تو خود موت کے تعاقب میں ہیں۔ موت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔'' عمران جذباتی انداز میں بولا۔

کوئی نہ کوئی تدبیر تو کرنا ہی پڑے گی۔"

"دفعتاً شہریار کے ذہن کی بند کھڑکی پٹاک سے کھلی اور سوچ کی لہروں سے ایک زبردست ترکیب نے جنم لیا۔ اس نے گھوڑوں پر لدی ہوئی ان ترپالوں کو دیکھا' جو خیمے کی شکل میں تھیں پھر وہ آگے دیکھنے لگا ان گھوڑوں تک پہنچنے میں کوئی دو گز کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا اس کے ساتھ ہی شہریار اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"شہریار کیا کرنے لگے ہو؟" عمران کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔

"زندگی تلاش کرنے جا رہا ہوں۔"

"پلیز مجھے بتاؤ...... وہ کام میں کرتا ہوں' تمہاری زندگی میری زندگی سے زیادہ قیمتی ہے۔"

"اب میری تیری کی گنجائش نہیں ہے عمران۔"

"بتا تو دو مجھے۔"

"بس دیکھتے جاؤ۔" شہریار نے کہا اور اپنے گھوڑے پر اپنے آپ کو سنبھالنے لگا اس وقت تک یہ گھوڑے دلدل میں گھٹنوں تک دھنس چکے تھے۔ شہریار اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑا ہوا تو گھوڑا بدکا لیکن اپنے پاؤں ہلا بھی نہیں سکا۔ بلکہ تھوڑا اور نیچے ہو گیا۔ دفعتاً شہریار نے اس گھوڑے پر چھلانگ لگا دی جس پر ترپال لدے ہوئے تھے۔ گھوڑا زور اور خوف دونوں سے ہنہنایا۔ لیکن شہریار نے اس کی پیٹھ پر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

ترپال مضبوط ڈوری کی مدد سے گھوڑے کی پیٹھ پر بندھے تھے۔ ڈوری پر سخت گرہ لگی تھی۔ گرہ کھولنے کے لیے بھی شہریار کو اچھی خاصی مشقت کرنا پڑی۔ آخر کار وہ کامیاب ہو گیا۔ اب اس نے ایک ترپال اٹھا کر اپنے ہاتھ میں سنبھال لیا پھر وہ ترپال کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ترپال کو اسی طرح ہاتھوں میں سنبھال لیا تھا جس طرح سمندر میں مچھلیاں پکڑنے والے مچھیرے اپنا جال پھینکتے ہیں۔ شہریار اس ترپال کو گھمانے لگا اور اس کے بعد اس نے ترپال دلدل میں پھینک دی۔ ترپال خشکی کی جانب دلدل میں بچھ گئی۔ عمران اب صورتحال کو سمجھتا جا رہا تھا۔ شہریار نے دوسری ترپال اپنے شانوں پر رکھ لی اور

عمران سے کہنے لگا۔

''عمران ترپال پر کود جاؤ۔''

''لیکن۔''

''کود جاؤ میں کود رہا ہوں۔''

''یار مگر......؟''

''میں کہہ رہا ہوں کود جاؤ اگر مگر کا وقت قطعاً نہیں ہے۔'' شہریار نے کہا اور اس کے بعد وہ ترپال پر کود گیا چونکہ مضبوط ترپال دلدل پر پھیلی ہوئی تھی اور دلدل نے اس کا وزن سنبھال رکھا تھا تھوڑی سی ترپال اندر ضرور دھنسی تھی لیکن اس کے بعد ترپال نے اسے سنبھال لیا۔ شہریار اسی طرح لوٹ لگانے لگا جیسے بچے پکے فرش پر یا گھاس پر چھلانگ لگا کر لگاتے ہیں۔ شہریار جب ترپال کے آخری کنارے پر پہنچا تو وہاں اس نے اپنے آپ کو لیٹے لیٹے تھوڑا سا اٹھایا اور پھر دوسری ترپال کو بھی اسی طرح پھینک دیا یہ ترپال تقریباً کنارے تک پہنچ گئی تھی شہریار نے عمران کی طرف دیکھا اور زوردار قہقہہ لگایا۔

''آجاؤ میرے پیچھے پیچھے، بچپن میں ہم اسی طرح لوٹیں لگاتے تھے۔'' وہ لوگ موت سے زندگی کی طرف لوٹ رہے تھے اس کے ساتھ ہی شہریار نے دوسری ترپال پر چھلانگ لگائی جو ترکیب شہریار کے ذہن میں اس وقت آئی تھی' اس سے عمران بہت متاثر تھا کسی طور اس کے ذہن میں یہ بات نہیں آسکتی تھی۔ اس نے بھی شہریار کی تقلید کی۔ تھوڑی دیر بعد دونوں کنارے پر پہنچ گئے اور جب انہوں نے دلدل سے خشکی پر اپنے جسم کو محسوس کیا تو ان کا دل چاہا بس لیٹ جائیں آنکھیں بند کرلیں۔ دل پر جبر کرکے وہ بمشکل تمام تھوڑے سے مزید خشکی کی جانب کھسکے اور اس کے بعد آنکھیں بند کرلیں۔ اسی وقت گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی اور انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ گردن اٹھا کر دلدل کی طرف دیکھا تو دو گھوڑے دلدل میں غرقاب ہوچکے تھے' تیسرا اپنے چہرے کو اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ اس کا پورا بدن دلدل میں ڈوب چکا تھا۔ دلدل میں گم ہوتے گھوڑوں کی ہنہناہٹیں بڑی دردناک تھیں۔ دلدل میں گھوڑوں کے دھنسنے کا آخری لرزہ خیز منظر

دونوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا جسے وہ زندگی بھر نہیں بھلا سکے تھے۔ خوف سے دونوں کے جسم تھر تھر کانپ رہے تھے۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں انہوں نے آنکھیں بند کر کے سرزمین پر ٹکا دیئے۔

ان کے دیکھتے ہی دیکھتے آخری گھوڑے کی جدوجہد بھی ختم ہوگئی۔ پہلے اس کی گردن پھر منہ دلدل میں گم ہو گیا۔ بڑا عبرتناک اور دہشت انگیز منظر تھا۔ اگر شہریار کی کوشش کامیاب نہ ہوتی تو یقیناً اب تک وہ دونوں بھی دلدل کا حصہ ہوگئے ہوتے۔ گھوڑوں کو گم ہوتے دیکھ کر دونوں خاصے خوفزدہ ہو گئے تھے۔ دیر تک وحشت کا شکار رہنے کے بعد عمران نے کہا۔

''شاید یہ منظر میں زندگی بھر نہ بھول سکوں گا۔ مجھے کسی شاعر کا مصرع یاد آ رہا ہے۔

جانے کس زعم پہ نکلا ہے تُو خنجر لے کر
مارنے والے سے بڑھ کر ہے بچانے والا

شہریار بولا۔'' وہ کسی اور شاعر نے بھی کہا ہے۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

دونوں ہنسنے لگے۔ کہتے ہیں کہ ایک بھرپور قہقہہ ٹینشن رفع کرنے کے لیے بھرپور ٹانک ہوتا ہے۔ اسی لیے شاید کھل کر ہنسنے کے بعد دونوں اپنے آپ کو بہتر حالت میں محسوس کرنے لگے۔ دونوں کچھ وقت تک ایک دوسرے کو بہلاتے رہے اور اس کے بعد وہاں سے آگے کا سفر اختیار کیا۔ دلدل کا بھیانک علاقہ بڑی خوفناک داستان کا مرکز تھا چنانچہ وہ یہاں سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ پہلے کافی دیر تک وہ بھاگتے رہے' تاکہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ طے ہو جائے پھر جب سانس بری طرح پھول گئے تو انہوں نے خاموشی اختیار کر لی اور سست روی سے چلنے لگے۔ مناسب جگہ تلاش کر کے دن چڑھے تک سوتے رہے۔ رات ہوگئی۔ کم بخت پیٹ بڑی ہی ظالم چیز ہے۔ سارے احساسات اپنی جگہ لیکن جب بھوک پیاس لگتی ہے تو کچھ یاد نہیں رہتا' بھوک نے انہیں نڈھال کر دیا تھا جس طرح بھی بن پڑا آگے چلتے رہے یہاں تک کہ انہیں ایک باغ نظر آیا جس میں طرح طرح کے پھلوں سے لدے بے شمار

درخت تھے۔آس پاس کوئی آبادی نظر نہیں آ رہی تھی۔ باغ کو دیکھتے ہی ان کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ اس کی طرف دوڑنے لگے۔

باغ میں داخل ہو کر انہوں نے کچھ نہیں سوچا اور پھلوں پر ٹوٹ پڑے۔ وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ اگر باغ کا مالک یا رکھوالا اس وقت آ جاتا اور انہیں اس عالم میں دیکھ لیتا تو جان نکالنے پر تل جاتا کیونکہ وہ جانوروں کی طرح پھل کھا رہے تھے۔ پھل کھا کھا کر جب وہ نڈھال ہو کر ایک جگہ بیٹھ گئے تو سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ نجانے کتنی دیر اس طرح گزر گئی حواس بحال ہوئے تو شہریار نے کہا۔

''جب ہم اس باغ سے پھل چوری کر ہی چکے ہیں تو کیوں نہ تھوڑے سے پھل توڑ کر ساتھ رکھ لیں۔''

''ہاں یار نجانے آگے کا سفر کیسا ہو۔سفر تو کرنا ہی ہے۔'' عمران نے تائید کی۔

انہوں نے مزید پھل توڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ جیسے ہی ایک درخت کے قریب پہنچے انہیں ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز سنائی دی اور وہ سنبھل گئے۔ ہوسکتا ہے باغ کا رکھوالا یہاں موجود ہو اور ہم پکڑے جائیں پھر ہمیں کوئی بچانے والا بھی نہیں ہوگا کیونکہ جب جرم کیا جاتا ہے تو انسان خود بخود کمزور ہو جاتا ہے۔ انہوں نے ایک لمحے تک کچھ سوچا پھر دبے قدموں آگے بڑھے اور درخت کے پیچھے پہنچ گئے۔ باغ کا رکھوالا گہری نیند سو رہا تھا لیکن ان کی نگاہ جیسے ہی اس کے چہرے پڑی دونوں یوں اُچھل پڑے جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ یہ وہی شیطان صفت گمنام آدمی تھا جس نے ان دونوں کو دلدل میں دھکیل دیا تھا اور دلدل سے جس طرح نجات ملی تھی وہ بس اللہ کی قدرت ہی تھی ورنہ اس نے تو اپنا کام پورا ہی کر دیا تھا۔ ان کے دل و دماغ میں غصہ بھر گیا۔ وہ اس وقت سب کچھ بھول کر اس شخص سے بدلہ لینے پر تل گئے۔ سب سے پہلے عمران نے اس کا گریبان پکڑ کر اُسے جھنجھوڑا۔

''اُٹھ جاؤ ذلیل آدمی!'' وہ شخص گھبرا کر اٹھ گیا اور پھر جو اس نے ان دونوں کی شکلیں دیکھیں تو اس کے چہرے پر ایک دم خوف کے آثار پھیل گئے۔

''تم......تم؟''

''ہاں بے حس انسان! اپنی دانست میں تُو ہمیں ختم ہی کر چکا تھا اب یہ بتا کہ تیری ہم سے کیا دشمنی تھی؟''

''معاف کردو پیارے بھائی! مجھے معاف کردو۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''بھائی!'' عمران غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا اس کا الٹا ہاتھ اس شخص کے منہ پر پڑا ادھر شہریار نے اسے زور سے ٹھوکر ماری' وہ دونوں دفعہ چیخا اور پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''معاف کردو بھائی مجھے معاف کردو۔''

''پہلے ہمیں یہ بتا کہ تیری ہم سے دشمنی کیا تھی؟''

''میں نے کہا نا مجھے معاف کردو۔'' وہ بدستور گڑگڑا رہا تھا لیکن عمران اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا اور شہریار نے پیچھے مڑ کر اس کی کمر پکڑ لی۔ شہریار نے دونوں ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیئے۔ اس شخص نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے اور پھر عجیب سے انداز میں سیدھا ہونے لگا۔ شہریار نے محسوس کیا کہ اس کے دونوں ہاتھ جو اس کی کمر پر لپٹے ہوئے ہیں آہستہ آہستہ پھیلتے جا رہے ہیں۔ وہ شخص موٹا ہو رہا تھا۔ اس کا قد بھی بڑھ رہا تھا اور بدن بھی پھولتا جا رہا تھا۔ پھر یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ وہ شخص تقریباً بارہ فٹ کا ہو گیا۔ اسی مناسبت سے اس کے بدن کی چوڑائی بھی تین چار فٹ ہو گئی۔ وہ کوہ قاف کا دیو بن چکا تھا۔ عمران اور شہریار پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہے تھے اور کئی قدم پیچھے ہٹ گئے تھے۔ سب کچھ ناقابل یقین تھا۔ ہر بار اِک نئی حیرانی کا سامنا ہوتا اور وہ دنگ رہ جاتے۔ اب یہ کیا تھا ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ دونوں ایک طرف کھڑے ہو کر الجھی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا بدن اپنی جگہ واپس آنے لگا وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر پہلے جیسا ہو گیا اس کے بعد کہنے لگا:

''سنو دوستو...... میں ایک جن ہوں۔ میرا نام طوریس ہے۔ میں ایک بدکردار اور طاقتور جن ہزار جان کا غلام ہوں۔ اس کے ایماء پر تمہارا راستہ کھوٹا کرنے آیا تھا۔ لیکن تم بچ نکلے......تمہارے بچنے سے جہاں مجھے ہزار جان کی طرف سے سزا کا خوف ہے وہاں تمہاری ہمت اور مردانگی سے خوشی بھی ہے کیونکہ اگر تم ہزار جان کو مارنے میں

کامیاب ہو جاتے ہو تو میں بھی آزاد ہو جاتا ہوں۔ اس سے آزادی حاصل کئے بغیر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔''

طوریس کی باتیں سن کر دونوں نے اُمید بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد شہریار کہنے لگا۔

''کیا تم ہزار جان کو مارنے کے سلسلے میں ہماری کچھ مدد کر سکتے ہو؟''

''تمہیں اس کی قید سے کیسے آزادی دلائی جائے؟'' عمران نے پوچھا۔

''اپنی آزادی اور تمہاری مدد کا سوچ کر میں اپنے آپ کو خطرے میں ڈال رہا ہوں اگر اسے اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی کہ میں اس سے غداری پر آمادہ ہوں تو وہ مجھے پانی میں جلا دے گا۔''

''پانی میں جلا دے گا؟'' شہریار کی حیرت دیدنی تھی۔

''ہاں۔''

''مگر کیسے؟''

''کیوں بار بار پوچھتے ہو۔ بھئی میں آگ سے بنا ہوا ہوں۔ مجھے سب سے زیادہ نقصان پانی ہی سے پہنچ سکتا ہے۔''

''مگر فرض کرو طوریس کہیں تم پانی میں گر جاتے ہو تو؟''

''اس پانی کی بات نہیں ہے ہزار جان نہ صرف جن ہے بلکہ بہت بڑا جادوگر بھی ہے، وہ شیطان کا شاگرد ہے۔ اس نے میرے لئے خاص پانی تیار کر رکھا ہے جو میرے وجود کی آگ کو بجھا سکتا ہے۔''

''میرے خدا کیسی خوفناک باتیں ہیں۔ ہم نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ہمارے علم میں ایسی کوئی کہانی بھی آسکے گی۔'' شہریار نے پریشان لہجے میں کہا۔

''لیکن تم اگر جن ہو تو ہمیں ویسے بھی اپنی طاقت سے مار سکتے ہو پھر تم نے ہمارے ساتھ سیاست کیوں کھیلی؟''

''نہیں...... یہ انسانوں کی بھول ہوتی ہے کہ کوئی بھی جن جس انسان کو چاہے طاقت سے مار دے اگر ایسے ممکن ہوتا تو آج دنیا میں انسانوں کے بجائے جنات کی

حکومت ہوتی۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ کوئی بھی جن جب کسی انسان پر حاوی ہوتا ہے تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی تکنیکی غلطی انسان کی ضرور ہوتی ہے۔ جنات اپنی جسمانی قوت کا استعمال انتہائی اقدام کے طور پر تو کر سکتے ہیں لیکن جابجا اپنی طاقت کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔''

ایک بار پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ تھوڑی دیر تک طورلیس بھی خاموش رہا پھر بولا۔

''میں اس کا خادم ہوں' میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ البتہ ایک ایسی ترکیب جانتا ہوں جس سے اسے ہلاک کیا جا سکتا ہے۔''

''وہ ترکیب کیا ہے......؟''

طورلیس تھوڑی دیر تک ہچکچاتا رہا پھر بولا۔

''ہزار جان کی روح ایک چراغ میں موجود ہے اور یہ چراغ ایک ایسی خفیہ جگہ جل رہا ہے جہاں تک پہنچنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ تم یقین کر لو کہ اس چراغ تک میں بھی نہیں پہنچ سکتا کیونکہ اس کے راستے میں پانی ہے جس میں ہر وقت بھوکے مگرمچھ تیرتے پھرتے ہیں۔ اس چراغ تک کوئی نہیں جا سکتا، بس اس چراغ کو بجھانے کی دیر ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہنے لگا:

''بس اب میں چلتا ہوں کیونکہ ہزار جان اب کسی بھی وقت میرے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ جیسے ہی وہ میرے بارے میں سوچے گا میری غداری کا اسے پتہ چل جائے گا۔''

''لیکن ابھی تک اسے تمہارے بارے میں پتہ کیوں نہ چلا ہوگا؟'' عمران نے شک کی نظروں سے اسے دیکھا۔

''اس وقت وہ عروس البلاد میں خوبصورت لڑکیوں کے جھرمٹ میں شراب و شباب میں مست ہے۔ اس حالت میں وہ انسانی روپ میں اور نشے میں ہوتا ہے۔''

☆......☆......☆

ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسی وادی تھی جو چاروں طرف سے برف پوش پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی۔ ایسے مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے تھے جو صرف خواب میں ہی دیکھے جا سکتے تھے یا پھر انگریزی جادوئی فلموں میں۔ برف سے لدی اونچی نیچی چٹانیں دور تک پھیلے ہوئے زمینی نظارے ایک طرف شفاف بلوریں پانی کی ندی بہہ رہی تھی جس کا پانی اتنا صاف تھا کہ اس کی نچلی سطح کے پتھر بھی نظر آ رہے تھے۔

حیران کن حد تک خوبصورتی چہار سُو بکھری پڑی تھی۔ برفیلے پہاڑوں کے درمیان جابجا چوکڑیاں بھرتے ہرن، بارہ سنگھے اور اُڑان بھرتے خوبصورت پرندے، چرتے ہوئے چرندے، پھولوں سے ڈھکا جنگل...... برفیلی سطح زمین کے ساتھ ساتھ مختصر قامت کے پودے...... ہلکی ہلکی مدھر و مسحور کن ہوائیں...... برف کی دبیز چادر پر گہرا نیلا آسمان چھتری تانے تھا۔ قوس وقزح کے رنگوں سے مزین اُڑتے پرندے کوئل سے بھی میٹھی تانیں بکھیر رہے تھے...... فردوس بر روئے زمیں است...... ہر طرف خوابیدہ قدرتی حسن بکھرا پڑا تھا۔ اس محیر العقول وادی اور اس کے ثمر خیز حسن کو دیکھ دیکھ کر ان کی عقل دنگ ہو رہی تھی۔ حیرت کی مزید بات یہ تھی کہ موسم معتدل تھا حالانکہ برفانی وادی تھی مگر شدید سردی کا احساس نہ تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے موسمِ بہار ہو۔ نہ سردی نہ گرمی اور یہ بات واقعی حیرت انگیز تھی۔ وہ اس عجیب سے خوشگوار ماحول میں کھو سے گئے اور اس طلسماتی وادی میں ہولے ہولے گھومنے پھرنے لگے۔

''شہریار......! مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ وادی قدرتی نہیں بلکہ مصنوعی طور پر بنائی گئی ہے۔''

''وہ کیسے......؟''

''وہ اس طرح کہ یہ انتہائی صاف ستھری ہے۔ نفاست اور پھر ہر چیز میں ایک

خاص تناسب بھی ہے۔ پرندوں اور جانوروں میں نہ تو کوئی بدہئیت ہے اور نہ خونخوار بلکہ سبھی معصوم اور خوب صورت ہیں۔''

''لیکن اتنے دور دراز مقام پر اس جنت نما وادی کو بسانے کا کیا مقصد ہوسکتا ہے؟''

''ارے شہریار! ہم تو ایک عرصے سے ایسے ہی طلسمی واقعات سے نبرد آزما ہیں۔ ہمارے لیے اب کوئی بھی بات حیرت کا باعث نہیں ہونی چاہیے۔ ہر فکر کو چھوڑو اور آؤ گھومیں پھریں۔''

دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ان پاکیزہ اور معطر فضاؤں میں چلنے پھرنے لگے۔ چلتے چلتے وادی کے کنارے تک پہنچ گئے جس میں ٹھنڈا شفاف میٹھا پانی محوِ رقص تھا۔ اردگرد کے مناظر جنت نظیر تھے۔ ہر طرف...... ہر رنگ کے پھول کھلے تھے۔ دور دور تک ہریالی ہی ہریالی...... انواع واقسام کے پھلوں سے لدے درخت...... آبشاروں کے گرنے کی جھنکاریں...... ماحول میں رچی ہوئی عجیب سی مہک۔ نظروں کے سامنے دور دور تک پھیلے ہوئے دلکش نظارے۔ قدموں کے قریب ہی بہتی ندی میں رنگین چھوٹی بڑی مچھلیوں کے غول بے فکری سے اٹھکیلیاں کرتے صاف نظر آ رہے تھے۔ گھومتے پھرتے انہوں نے دیکھا کہ وادی میں ایک نہیں بلکہ دو ندیاں ہیں۔ ایک ان کی مخالف سمت سے بل کھاتی کہیں پہاڑوں سے اُتر رہی تھی اور دوسری آبشار سے بننے والی۔ دوسری ندی کے کنارے وہ چل رہے تھے۔ جلد ہی وہ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں دونوں ندیوں کا سنگم تھا۔ یہاں بے حد اچھوتا، دل نشیں نظارہ ان کا منتظر تھا۔ ایک دوسرے کی مخالف سمت سے آنے والی دونوں ندیوں کا پانی جس مقام پر ایک دوسرے سے ٹکراتا تو ایک دوسرے کو دھکیلنے کی کوشش میں بھنور کی شکل اختیار کر رہا تھا جس کی وجہ سے یہاں ایک اچھی خاصی جھیل بنی ہوئی تھی جو کہ بالآخر ایک تیسری ندی کو جنم دے رہی تھی اور یہ تیسری ندی تیسری سمت کو سفر کر رہی تھی۔ معاً عمران چونکا۔

''کیا بات ہے......؟'' شہریار اس کے چونکنے سے لاتعلق نہ رہ سکا۔

''وہ...... وہ دیکھو مخالف سمت سے آنے والی ندی سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔'' اس کی بات سن کر شہریار کی نظریں بھی اس سمت اُٹھ گئیں تو اس کی آنکھوں میں بھی حیرت پھیلنے لگی۔ واقعی اس ندی سے سفید سفید دھواں اُٹھ رہا تھا۔

اور پھر دونوں اس طرف لپکے لیکن پھر دونوں رک گئے کیونکہ عقب سے آنے والی

ندی اور سامنے سے آنے والی ندی سے جو تیسری ندی بنی تھی وہ ان کے دائیں سے بائیں
رہی تھی جس کی وجہ سے وہ سامنے والی ندی کے قریب نہیں جا سکتے تھے کیوں کہ وہاں جا۔
کے لیے ان کو کسی ایک ندی کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ مجبوراً دونوں رک گئے۔ لیکن سامنے والی ندی
سے اُٹھنے والے دھوئیں نما بھاپ کو دیکھتے رہے۔ یہ معمہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وادی ب
حد حسین اور پُرکشش تھی اور وہ اس کی خوبصورتی میں کچھ اس طرح محو ہوئے کہ وقت گزر۔
کا انہیں احساس تک نہ ہوا۔ اور سورج نے مغرب کی آغوش میں اُتر کر مغربی اُفق کو لال گور
کر دیا۔ دونوں نے رات وہیں کھلی فضا میں بسر کرنے کی ٹھانی کیونکہ سردی اور نہ گرمی تھی بلکہ
انتہائی موزوں اور سہانا موسم تھا۔ اندھیرا پھیلتے ہی رات کی رانی کی خوشبو پھیل گئی اور ہلکی ہلکی
ہوا کی تھپکیوں سے دونوں کے پپوٹے نیند سے ہلکورے لینے لگے۔ اتنی مزیدار اور گہری نیند
ایک عرصے کے بعد انہیں آئی تھیں۔ مست ندیوں کے ترنم، پرندوں کی چہچہاہٹ اور نقرئی
آوازوں کی جلترنگ سے دونوں اُٹھ بیٹھے...... ندی میں ہلکی پھلکی کشتیاں انہیں دکھائی دیں
جو پانی کی سطح پر ہلکورے لے رہی تھیں۔ ان میں سرخ، سفید اور گلابی ریشمیں ملبوسات میں
چند خوبصورت دوشیزائیں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ ان لڑکیوں پر پریوں کا گمان ہوتا تھا۔ اور
وہ بھی شاید انہیں دیکھ رہی تھیں۔ اسی لیے کشتیاں کنارے سے آ لگیں اور وہ اُتر کر ان کی
طرف خراماں خراماں بڑھنے لگیں۔

دونوں استعجاب و گھبراہٹ سے اپنی جگہ ساکت و جامد ہو کر رہ گئے۔

آنے والیاں سفید گلابی پوشاکوں میں ملبوس تھیں لیکن ان کے جلو میں ایک قیامت خیز حسینہ سرخ باریک لباس میں ملبوس تاروں کے جھرمٹ میں چاند کا ٹکڑا دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے پھولوں کے جلو میں سرخ گلاب، یا جیسے کوئی اپسرا ہو یا پھر آسمان سے اتری کوئی پرستان کی شہزادی یا پھر کوئی ماورائی مخلوق...... سرو قد، شاداب رنگت۔ خوشبو کا چلتا پھرتا جھونکا، اس کے ارد گرد جیسے خوشبوؤں کا حصار قائم ہو۔

باقی لڑکیاں بھی حسن کے چلتے پھرتے مجسمے تھیں...... مگر اس کی تو شان ہی نرالی تھی۔

''کون ہو تم؟''

''پردیسی'' عمران نے ہولے سے جواب دیا۔

''یہاں کیوں اور کیسے آئے ہو؟''

''راستہ بھول گئے ہیں۔''

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ 'عروس البلاد' ہے۔ اس کی حدود میں خواتین بلکہ صرف اور صرف نوجوان اور حسین لڑکیاں ہی داخل ہو سکتی ہیں۔''

''ہمیں علم نہ تھا۔''

''قانون سے لاعلمی جرم ہوتی ہے۔'' اس نے نخریلے انداز سے کہا اور پھر بولی۔

''لے چلو دونوں کو ان کا فیصلہ شامہ کریں گی۔''

آخری جملہ اس نے اپنے اردگرد لڑکیوں سے کہا تھا اور پھر کوئی جواب سنے بغیر پلٹی تو دونوں لڑکیوں نے پھرتی سے اسے راستہ دے دیا۔

اور پھر تین لڑکیاں عمران کے گرد ہو گئیں اور تین نے شہریار کو گھیرے میں لے لیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو عمران نے شانے اُچکا دیئے اور وہ بغیر کسی مزاحمت کے چل دیئے۔ دونوں نے ایک ہی کشتی میں بیٹھنے کی کوشش کی مگر شہریار کی حفاظتی حسیناؤں نے اسے کھینچ کر الگ کشتی میں سوار کرا دیا۔

تمام لڑکیاں خوبصورت اور نازک چپوؤں سے کشتی کھینے لگیں۔

کشتیوں کا رُخ تیسری ندی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے سفر کے بعد ندی دو پاٹوں میں بٹ گئی۔ ایک پاٹ سیدھا جا رہا تھا جبکہ دوسرا مرکزی ندی سے ہٹ کر بغلی طرف خم لے کر وادی کے اس حصے کی جانب نکل رہا تھا جہاں یہ دونوں جانا چاہ رہے تھے۔

شہریار والی کشتی خم دار رستے کی طرف مڑ گئی جبکہ دوسری دونوں کشتیاں سیدھی نکلتی گئیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر شہریار نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن لڑکیاں خاموشی سے اسے یکھتی رہیں۔ دونوں کشتیوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا گیا اور پھر دونوں ایک دوسرے کی ڈاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ شہریار کو عمران بھی مزاحمت کرتا نظر آیا تھا۔ شہریار نے گہرا انس لے کر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

ابھی آفتاب طلوع نہیں ہوا تھا۔ صبح صادق کی مست ہواؤں میں حسیناؤں کے

لرزتے ہوئے سیاہ بال اور سرسراتے لباس اور جھلکتے شباب ماحول کو رومانی بنا رہے تھے۔ اس پر مستزاد ندی کے کناروں پر ناچتے مور اور پانی میں کشتی کے گرداگرد اچھل کود کرتی دھنک رنگ مچھلیاں۔ شہریار کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی ڈریم لینڈ میں پہنچ گیا ہو۔ ان کے سروں پر اور کناروں کے ساتھ ساتھ عجیب النسل لیکن انتہائی حسین و خوبصورت پرندے اُڑانیں بھر رہے تھے۔ شہریار اپنے اردگرد سے بے پروا اپنی ہی سوچوں میں گم تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر وہ جس طویل اور تھکا دینے والے سفر پر نکلے ہوئے ہیں اس کا انجام کب اور کیسا ہوگا۔ کیا وہ کبھی حسینہ کو تلاش کر پائیں گے اور کیا ایک بار پھر وہ اپنی فیملی کے ساتھ اپنی حویلی کے صحن میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے خوش گپیاں کر سکے گا۔ یہ یاد آتے ہی اس کی پلکوں کے گوشے بھیگ گئے۔ یکایک اسے امی، ابو، دادی اماں سب یاد آ گئے۔ سب کے چہرے اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ اسے پتہ بھی نہ چلا اور اس کی آنکھوں کے کٹورے چھلک پڑے اور پانی کناروں سے بہہ نکلا۔ وہ رو رہا تھا۔ اور کسی اور ہی جہان میں پہنچ چکا تھا۔ اسے تو تب پتہ چلا جب ایک حسین دوشیزہ نے لپک کر اس کے آنسوؤں کا ذائقہ اپنی زبان کی نوک پر رکھ لیا۔ شہریار نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ سیاہ زُلفوں کے حصار میں چاند چہرے کی گرم سانسوں کو اپنے گالوں پر محسوس کر کے وہ ہڑبڑا اُٹھا تو نقرئی گھنٹیاں بج اُٹھیں اور شہریار جھینپ گیا۔ اسی اثناء میں کشتی کنارے سے لگ گئی۔ شہریار نے دیکھا کہ یہ جگہ پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ ندی کے کناروں پر اسے بے فکری کے قہقہے لگاتی اور مسکراہٹیں اُچھالتیں لڑکیاں ہی لڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ شہریار کو اترنے کا اشارہ کیا گیا اور وہ لڑکیوں کے غول میں انجانی سمت چلنے لگا۔ سب کی سب چندے آفتاب چندے ماہتاب تھیں۔ ہر ایک نے ہی قیمتی پوشاک زیب تن کر رکھی تھی۔ چہار سُو نکھار ہی نکھار تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد شہریار کو بگھی نظر آئی جس کے آگے چار ہرن اور چار بارہ سنگھے جتے ہوئے تھے۔ یہ سطح زمین سے بمشکل ایک فٹ بلند تھی جس کے نیچے چھوٹے چھوٹے پہیے لگے تھے۔ یہ چھ فٹ چوڑی اور دس فٹ کے قریب لمبی تھی۔ اندر آرام دہ نشستیں تھیں۔ شہریار کو بٹھایا گیا اور کئی دوشیزائیں اس کے ساتھ ہی دائیں بائیں اور دوسری نشستوں پر بیٹھ گئیں۔ بگھی دلکی رفتار سے چل پڑی۔ ہرنوں اور بارہ سنگھوں کے پیروں میں

گھنگرو بندھے تھے جوان کے چلنے سے بجنے لگے۔

گلاب وجودوں کا حرارتی لمس، کھلکھلاتے چہرے، خوشبودار سانسوں کے جلو میں شہریار کو کہیں لے جایا جا رہا تھا۔ شہریار ایک نوعمر نوجوان تھا۔ وہ سب کچھ بھولنے لگا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی کشمکش اور اتھل پتھل ہونے لگی۔ اس سے پیشتر کہ وہ حواس باختہ ہو جاتا بگھی ایک شہر میں داخل ہوگئی۔ شہر کا داخلی محرابی دروزہ بہت ہی بڑا تھا جس کے گرد بے شمار درخت اُگے ہوئے تھے جن کے ڈال پھلوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ محراب سفید اور سرخ پھولوں سے لدا ہوا تھا۔

شہریار لحہ بہ لحہ حیرت واستعجاب میں گھرتا جا رہا تھا۔ دور دور تک اسے کوئی مردانہ چہرہ دکھائی نہ دے رہا تھا ہر طرف صنفِ نازک کا راج تھا۔ صفائی کرنے والی مہترانیاں بھی چمکیلے بھڑکیلے چست لباسوں میں ملبوس تھیں اور ان کے چہرے بھی حلاوت سے معمور تھے۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد اسے احساس ہوا کہ پورا شہر انتہائی منظّم اور ترتیب کے ساتھ ہے۔ جا بجا مکانات اور محلات نظر آنے لگے۔ ہر طرف بے فکریوں کی ترنجن تھی۔ سڑک کے ہر دو اطراف سبزہ زار تھے۔ پھر اس نے بے شمار خواتین ایسی دیکھیں جنھوں نے پیلے رنگوں کی میکسی پہن رکھی تھی۔ جن پر سرخ رنگ کی پٹی باندھی تھیں۔ کسی کے شانوں پر موتیے کے پھول اور کسی کے شانے گلاب یا چنبیلی کے تازہ پھول ٹنگے ہوئے تھے۔ اس نے اندازہ لگایا کیا کہ یہ فوجی اہلکار ہیں۔ وہ سب کی سب دلکشی میں اپنی مثال آپ تھیں۔ اسے کہیں کوئی بدصورت تو کجا سانولا چہرہ بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ بگھی چلتے چلتے ایک عالیشان محل کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ وسیع دالان کے گرد مرکزی دیوار کے ساتھ سرخ اینٹوں سے چھوٹی چھوٹی رہائش گاہوں سے محل کے اندر کی آرائش وخوبصورتی سوا ہوگئی تھی۔ گرد یا گندگی کا کہیں شائبہ تک نہ تھا۔ اسے اب تک کہیں بھی کوئی مرد، بچہ، بوڑھی یا بدصورت خاتون دکھائی نہ دی تھی بالآخر اسے شاہی دربار میں پہنچا دیا گیا۔

بہت بڑا ایوان جس کے ستون سنگ مرمر سے تعمیر کئے گئے تھے۔ صنفِ نازک کی سلطنت کے اس دربار کی شان ہی نرالی تھی۔ سونے سے بنائے گئے چبوترے پر ہیرے جواہرات سے مزین کرسی تھی۔ جس پر چھیل چھبیلی سنِ صغیر قسم کی طرح دار غضب ناک حد تک

خوبصورت شعلہ جوالہ ملکہ جلوہ افروز تھی۔ جیسے کسی ماہر مجسمہ ساز نے رعنائی و دلربائی سے مخمور ایک پیکر تراشا ہو۔ پورا دربار قسم قسم کی خوشبوؤں سے معطر معطر ہو رہا تھا۔

چبوترے کے سامنے مختلف خواتین درجہ بدرجہ خاص نظم و ضبط سے بیٹھی تھیں۔

شہریار جن لڑکیوں کے ساتھ آیا تھا انہوں نے دھکیل کر اسے ملکہ کے رُوبرو کر دیا۔

''کون ہے یہ......؟'' ہونٹوں کے عنابی شگوفے آہستگی سے تھرتھرائے۔ ترنم سے بھرپور نشیلی رسیلی آواز گونجی تو شہریار مچل اُٹھا۔ اس نے زندگی بھر اس سے خوبصورت آواز نہ سنی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئل نے کوک بکھیری ہو۔ جیسے ملکہ ترنم کا کوئی پرانا گیت گونج اُٹھا ہو۔ یا پھر لتا نے تان لگائی ہو۔ یا پھر مصر کی مغنیہ اُمِ کلثوم نغمہ سرا ہوئی ہو۔

''ملکہ عالیہ اس نوجوان اور اس کے ایک اور ساتھی کو عروس البلاد کی حدود سے گرفتار کیا گیا ہے۔''

''اس کا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟'' ملکہ تمکنت سے بولی۔

''اسے شہزادی شمامہ کی کنیزیں لے گئی ہیں۔''

''کون ہو تم نوجوان اور تمہیں عروس البلاد اور ملکہ شمائیلہ کی حدود میں قدم رکھنے کی جرأت کیونکر ہوئی؟'' ملکہ کے الفاظ تحکمانہ مگر لہجہ انتہائی دھیما اور میٹھا تھا۔ جس کی وجہ سے شہریار کو بڑا حوصلہ ہوا۔ اس نے اصل بات بتانے کی بجائے جھوٹ موٹ کی کہانی گھڑ کر سنا دی جسے سن کر ملکہ کہنے لگی۔

''تمہیں شاید معلوم نہیں کہ تم انجانے میں کتنے بڑے خطرے سے دوچار ہو چکے ہو۔''

''یہ خوبصورت شہر عروس البلاد ہزار جان کی ذہنی اختراع ہے۔ وہ خوبصورت لڑکیوں کا دیوانہ ہے۔ اس شہر میں اس نے حسیناؤں کا جمِ غفیر صرف اپنے لیے رکھا ہوا ہے۔ یہاں سوائے ہزار جان کے کوئی مرد داخل نہیں ہو سکتا۔ آج کل ہزار جان یہاں موجود نہیں اس لیے اس کی آمد تک تمہیں یہاں رکھا جائے گا۔ تمہارے بارے میں فیصلہ ہزار جان خود کرے گا لیکن تم قید نہیں ہو۔ شہر میں جہاں چاہو گھوم پھر سکتے ہو۔ جو چاہو حاصل کر سکتے ہو۔''

اس کے بعد شہریار کو محل کے مرکزی محرابی دروازے سے باہر دھکیل دیا گیا۔ باہر نکل کر شہریار سڑک کے کنارے ایک خوب صورت بنچ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کہاں جاؤں

اور عمران کو کہاں تلاش کروں۔ جانے دوسری ملکہ شمامہ نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا؟ کیا اسے بھی میری طرح دھتکار دیا گیا ہے یا پھر ہوسکتا ہے کہ شہزور وہیں موجود ہو اور اس نے فوراً ہی عمران کو مار ڈالا ہو۔ نہیں نہیں...... یہ سوچ اس کی ذہنی پریشانیوں میں اضافہ کرگئی۔

اسی طرح سوچوں میں غرقاب کافی دیر ہوگئی تو اس کو بھوک کا احساس ہوا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کروں...... اچانک اسے قریبی درخت پر پھل لٹکتے نظر آئے...... وہ اُٹھا اور ہاتھ بڑھا کر پھل توڑنے لگا...... مگر یہ کیا...... پھل اس کے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی لیکن اسے یوں احساس ہوا جیسے اس کا ہاتھ انتہائی ہلکا اور ہوا کا بنا ہوا ہے۔ پھل کو چھونے کی کوشش میں اس کا ہاتھ آر پار ہو جاتا۔ اس نے کئی بار کوشش کر کے دیکھ لی مگر پھل جوں کا توں لٹکتا رہا بلکہ ہلا تک نہیں۔ اس نے اس درخت کو چھوڑ کر ایک دوسرے درخت کو آزمایا لیکن وہاں بھی اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اب تو شہریار پریشان ہو کر ٹھٹک گیا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے رہائشی علاقے کا رُخ کر لیا۔

سارے مکانات انتہائی خوبصورت اور کشادہ تھے۔ راستے گلیاں اور بازار چمکدار اور شفاف تھے۔ صفائی والی لڑکیاں اپنے فرائض کی بجاآوری کے لیے موجود تھیں مگر اس خوابناک انداز میں جیسے فیشن پریڈ میں آئی ہوں، ہر صفائی کرنے والی نیلے رنگ کے باریک اور چست لباس میں ملبوس تھی۔ سب کا ایک ہی انداز تھا۔ سر کے بال پونی کے انداز میں نیلے ربن سے بندھے ہوئے اور چہرہ پورے سولہ سنگھار کے ساتھ...... شہریار اور آگے بڑھا اور اس نے ایک بازار کا رُخ کر لیا جہاں انواع و اقسام کے خوشبودار کھانے پک رہے تھے۔ گرما گرم کھانے دیکھ کر شہریار کی بھوک دوچند ہوگئی۔ یہاں بھی نوخیز حسینائیں شیف کے روپ میں موجود تھیں۔ اچنبھے کی بات یہ تھی کہ کوئی بھی خاتون شہریار کی طرف متوجہ نہ ہوئی تھی حالانکہ شہریار کے خیال کے مطابق لڑکیوں کے شہر میں اکیلا ہونے کے ناطے سب دوشیزاؤں کو اس کے گرد جمگھٹے کی صورت اکٹھا ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر یہاں تو کوئی اس کی جانب متوجہ بھی نہ تھی۔ سب کی سب بے نیاز تھیں اور اس کے وجود کی بھی نفی ہو رہی تھی۔ شاید سب کو ملکہ کی جانب سے حکم جاری ہو چکا تھا کہ اس نوجوان کی طرف نہ دیکھا جائے نہ کوئی اہمیت دی جائے۔ انہی سوچوں میں غرقاب و غلطاں شہریار اچانک ایک مہ جبین سے جا ٹکرایا اور گر پڑا

گیا کہ اب کیا ردعمل ہوگا۔ مگر اس سیمیں بدن کے سٹائل میں کچھ فرق نہ آیا اور وہ یونہی چلتی گئی۔ جیسے کچھ بھی تو نہ ہوا ہو۔

اب تو شہریار کو اپنے ہونے پر بھی شک ہونے لگا۔ اس نے ایک دوکاندار خاتون سے کھانے کو کچھ مانگا۔ اس نے شہریار کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا اس نے خود کھانے کی چیزیں اُٹھانا چاہیں تو اس پر خوفناک انکشاف ہوا کہ درخت کے پھل کی طرح یہ چیزیں بھی اُٹھائی نہ گئیں بلکہ اس کا ہاتھ اس قتلمہ کے آر پار ہو گیا جیسے وہ قتلمہ نہ ہو، ہوا ہو۔

اب حقیقت ہویدا ہو چکی تھی کہ اس پر کوئی جادو کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے نہ تو وہ کسی کو نظر آتا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی آواز سن سکتا ہے اور اس کا وجود کسی سے ٹکرانے کے باوجود اس کو محسوس نہیں ہوتا۔ وہ خود کوئی چیز اُٹھا ہی نہیں سکتا۔ لیکن خود اسے اپنی آواز بھی سنائی دیتی تھی اور اپنا وجود بھی محسوس ہوتا تھا۔ بھوک اور پیاس بھی عام انسانوں کی مانند لگتی تھی لیکن اب وہ کیا کرے۔ اس مسئلے کا کیا حل ہے کہ وہ جیتے جاگتے شہر میں خوبصورت خواتین کے ہجوم میں بے بس اور تنہائیوں کا شکار ہو چکا تھا۔ اشتہا انگیز کھانوں کی موجودگی میں بھی انہیں نہ چکھ سکتا تھا نہ کھا سکتا تھا۔ اسی عالم میں شام ہوگئی۔ اندھیرا چھانے لگا۔ عروس البلاد میں چراغ جلنے لگے۔ ہر مکان سے یوں روشنیاں پھوٹ رہی تھیں جیسے چراغاں ہو رہا ہو۔ ادھر شہریار کی بھوک اور پیاس اور بڑھ چکی تھی۔ اب وہ سچ مچ پریشان ہونے لگا۔ پریشانی کے عالم میں وہ ایک عالی شان گھر میں گھس گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ تین حسنِ بلاخیز کی مالک دوشیزائیں کھانے کی میز پر عشائیہ تناول کر رہی ہیں۔ درجنوں کھانوں سے خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔ تراشیدہ ہونٹوں اور بادامی نینوں والی وہ لڑکیاں جن کے ایک ایک عضو سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ مزے سے کھانا کھا رہی تھیں۔ ان کے لباسوں میں موتی ٹانکے ہوئے تھے لیکن شہریار کو ان کے حسن میں کھونے کا یارہ کہاں تھا۔ اس کا تو بھوک اور پیاس کے مارے بُرا حال تھا۔ اس نے بہتیری کوشش کی کہ ان کے سامنے سے کچھ اٹھا کر کھا لے مگر یوں لگتا تھا کہ وہ تقدیر کے گھیرے میں آ چکا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز نہ آئی۔ تنگ آ کر وہ اسی گھر کے ایک کمرے میں جا کر سو گیا۔ اگلے دن صبح آنکھ کھلی تو دنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی۔ زندہ گوشت کا انسان، بھرے پرے شہر میں تنہا تھا۔ ہاتھ پاؤں کھلے آنے جانے کی

پوری آزادی مگر وہ کسی چیز کو نہ کھا سکتا تھا اور نہ ہی پی سکتا تھا۔ آخرکار اس نے ایک بار پھر محل میں جانے کا ارادہ کرلیا کہ ملکہ سے جا کر کوئی درخواست کرتا ہوں۔ یقیناً یہ اسی کی شرارت ہے۔ اس خیال کے اُبھرنے سے شہریار نے محل کا رُخ کرلیا۔ راستے میں اسے ایسی ایسی افسانوی تخیل خیز حسن رکھنے والی دوشیزاؤں سے سابقہ پڑا کہ دل کے مندر کی سندر گھنٹیاں میٹھی میٹھی جلترنگ بجانے لگیں تاہم بھوک پیاس کی شدت جلد ہی پہلے خیالات کو مغلوب و مضروب کردیتی۔

وہ چلتا گیا۔ وہ کسی کو نظر نہ آرہا تھا۔ اسے سب کچھ نظر آرہا تھا۔ اس کا رُخ محل کی طرف تھا۔ کافی دیر گزر گئی۔ مگر اسے محل نظر نہ آیا۔ بلکہ یہ تو کل والے مناظر ہی نہ تھے۔ اب تو وہ جیسے کسی اور ہی خطہ میں آ نکلا تھا چہار سُو صاف ستھری سڑکیں، ایک طرف خوبصورت پہاڑی جس پر برف کی موٹی چادر بچھی تھی۔ پہاڑی کے ایک پہلو سے شفاف پانی کی آبشار نے رنگ جما رکھا تھا۔ سڑکوں پر چھوٹی چھوٹی خوبصورت بگھیاں جن کے آگے بارہ سنگھے اور ہرن جُتے ہوئے تھے۔ بگھیوں میں مہ وشیں، نازنینیں جن کے نقوش قیامت خیز ناز وادا سے شہر کے نظارے کر رہی تھیں۔ سرخ ہونٹوں کی تراش اور سرمگیں آنکھیں، قاتل ادائیں مسحور کن ہوائیں۔ ماحول نہایت رومانوی اور بے پناہ دلکش تھا۔ مگر شہریار کیا کرتا اس کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ معاً شہریار کو عمران دکھائی دیا جو ایک پھلوں سے لدے درخت سے پھل توڑنے کی کوششوں میں ناکامی پر جھنجھلایا ہوا تھا۔ یقیناً اس کی حالت بھی شہریار سے مختلف نہ تھی۔

شہریار نے ڈرتے ڈرتے اس کو آواز دی۔ اس خیال سے کہ کہیں وہ بھی اس کی آواز نہ سن پایا تو کیا ہوگا۔ مگر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب عمران اس کی آواز سن کر نہ صرف چونکا بلکہ فوراً ہی اس کی طرف بھاگا۔ دونوں ایک دوسرے کو نہ صرف چھو سکتے تھے بلکہ محسوس بھی کرسکتے تھے۔ دونوں ہی سخت تھکے ہوئے اور بھوکے پیاسے تھے۔ کافی دیر گلے مل کر آہ و فغاں کرتے رہے۔ پھر عمران پُرعزم لہجے میں شہریار سے مخاطب ہوا۔

''ہمت ہارنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جہاں ہم مشکلوں کے اتنے پل صراط پار کر کے یہاں تک آ گئے ہیں انشا اللہ یہاں بھی اپنے ایمان' عزم اور حوصلے مشکلات کا یہ بھنور بھی

عبور کر لیں گے۔

وہ دونوں پھر محل کی تلاش میں مصروف ہو گئے لیکن محل انہیں نہ ملنا تھا نہ ملا۔ شاید پورا شہر ہی جادو کا تھا۔ رات پھر سر پر آ گئی۔ دونوں نڈھال ہو چکے تھے اور شہر سے باہر کی طرف چل پڑے۔ اس امید پر کہ آس پاس یا شاید شہری حدود سے باہر ان کی حالت میں کوئی تبدیلی آ جائے۔ اب تو ان پر اتنی نقاہت طاری ہو چکی تھی کہ ایک ایک قدم اٹھانا بھی ان کے لیے دوبھر ہو رہا تھا۔ رات کی حکومت قائم ہوئی تو ہر طرف تاریکی نے قبضہ جما لیا۔ صرف آسمان سے تارے جھانک کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ شہر سے باہر ویرانے میں انہیں ایک بوسیدہ عمارت دکھائی دی جس میں چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ دونوں کچھ مشورے کے بعد اسی کی جانب چل دیئے۔ یہ کوئی پرانا مکان تھا۔ دونوں بن سوچے اس میں داخل ہو گئے۔

☆......☆......☆

پاکستانی ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

سال خوردہ لکڑی کے محرابی دروازے کے پٹ دھکیلے تو چرچراہٹ کے ساتھ تقریباً خود بخود ہی وا ہوتے چلے گئے۔ وہ اندر داخل ہو گئے تو انہوں نے اپنے آپ کو ویران، سنسان اور اندھیری راہداری میں پایا۔ ابھی وہ کھڑے راہداری کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ چرچراہٹ کی آوازیں پھر اُبھریں اور پھر دھڑ سے دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر دونوں پلٹے مگر عقب میں دروازے کو مضبوطی سے بند پایا۔ لاشعوری طور پر دونوں لپک کر دروازے کے قریب آئے، اسے کھینچا، تھپ تھپایا۔ لیکن وہ تو امریکی امداد کی طرح بند ہو چکا تھا۔ بالآخر دونوں تھک ہار کر سر نیہوڑے ہانپنے لگے۔ بھوک، پیاس کی شدت نے ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی سلب کرنی شروع کر دی تھیں۔ مایوسی کے عالم میں دونوں کچھ دیر چپ چاپ کھڑے رہے۔ معاً ان کے کانوں نے کسی سسکی کی آواز سنی۔ اور اس کے ساتھ ہی ٹپ ٹپ کی آوازیں وقفے وقفے سے سنائی دینے لگیں۔ دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کی شکل دیکھی لیکن آواز دور سے آئی تھی۔ انہوں نے راہداری میں نظریں جما دیں لیکن وہاں تو گھپ اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ دونوں نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں ایک دوجے کی طرف سرسری انداز میں دیکھا اور پھر آہستگی سے راہداری کی طرف بڑھنے لگے۔ راہداری تنگ اور طویل تھی، سسکی کی آواز پھر اُبھری۔ بلکہ انہیں یوں محسوس ہوا کہ سسکیاں ہیں جو ایک سے زائد آوازوں پر مشتمل ہیں۔ اب ان کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ انہوں نے دائیں بائیں نظریں دوڑائیں تو ماحول انہیں انتہائی ڈراؤنا دکھائی دیا۔ دیواروں پر جگہ جگہ جانوروں کے کٹے ہوئے سر ٹنگے ہوئے تھے جن سے خون ٹپک رہا تھا۔ وہ سہم سہم کر قدم دھرتے ہوئے آگے کو بڑھتے

چلے گئے۔تقریباً سو قدم چلنے کے بعد راہداری دائیں جانب مڑ گئی۔اب اس کی چھت نیچی اور فرش گیلا محسوس ہونے لگا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں کچھ تکنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔اچانک انہیں محسوس ہوا کہ فرش ڈھلوانی ہو گیا ہے اور سسکیوں کی آوازیں بھی تیز ہو گئی ہیں۔ جیسے چند لوگ آہ وزاری میں مصروف ہوں۔تھوڑا مزید آگے بڑھے۔ راہداری تنگ ہوتی ہوئی گولائی کی صورت میں ڈھلوان ہونے لگی یعنی سپرنگ کی شکل میں نہ صرف نیچے کی جانب اترنے لگی بلکہ اس پر نمی اور پھسلن بھی پیدا ہو گئی۔

''میرا خیال ہے ہمیں واپس چلنا چاہیے۔'' عمران نے سرگوشی کی۔شہر یار کو اس کی آواز میں لرزش بھی محسوس ہوئی۔

''ٹھیک کہتے ہو!'' پھر وہ دونوں رک گئے اور واپس پلٹے لیکن پیچھے کا منظر دیکھ کر دونوں کی آنکھیں خوف سے اُبلنے لگیں۔ پانی کا ایک ریلا آبشار کی صورت ان سے ٹکرانے والا تھا۔اور پھر دونوں ڈھلوان کی طرف پانی کے زور سے گرتے چلے گئے۔ڈھلوان زیادہ طویل ثابت نہ ہوئی اور جلد ہی ختم ہو گئی اور پھر دونوں کو اپنے پاؤں ہوا میں محسوس ہوئے اور وہ کسی بے جان شے کی مانند تیزی سے نیچے گرنے لگے۔اور چھپاک سے کسی پلپلی شے پر گرے جھٹکا اتنا زوردار تھا کہ دونوں کے دماغ جھنجھنا اُٹھے۔آنکھوں کے آگے تارے سے ناچنے لگے اور وہ بے ہوش ہو گئے۔

☆......☆......☆

عمران کی آنکھ کھلی تو اس نے شہر یار کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا۔

''اللہ کا شکر ہے عمران تمہیں ہوش تو آیا۔'' شہر یار نے بھرائی ہوئی آواز سے کہتے ہوئے عمران کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''تمہیں پتہ ہے کہ تم کتنا وقت بے ہوش رہے ہو؟'' عمران نے سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دینے لگا۔''پتہ نہیں کتنے پہر گزر گئے ہوں گے۔''

''ہم کہاں ہیں؟'' عمران شاید پوری طرح حواس بحال نہیں کر پایا تھا۔

''ہم ہزار جان کے شکنجے میں آ چکے ہیں عمران۔'' شہر یار کے لہجے میں مایوسی کوٹ

کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''یہ موت کا کنواں ہے عمران جہاں ہمیں دھوکے سے پھینک دیا گیا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں عروس البلاد میں داخل ہونے والے ہر مرد کو پھینک دیا جاتا ہے خواہ وہ ہزار جان کا دشمن ہو یا ہزار جان اس کا دشمن ہو۔''

عمران تیزی سے اُٹھ بیٹھا اور اردگرد دیکھنے لگا۔ اسے اپنے دائیں بائیں مریل مریل سے چند وجود نظر آئے اچانک اسے اپنی ناک بدبو سے جلتی محسوس ہوئی۔ اردگرد دیکھا تو ہر طرف گندگی اور تعفن تھا۔ وہ حالات کا جائزہ لینے کے لیے تیزی سے کھڑا ہوا تو اس کا سر پکی چھت سے بُری طرح ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جیسے بجلیاں کوند گئی ہوں۔ چھت انتہائی نیچی تھی۔

☆......☆......☆

حسینہ اپنے چھپرکٹ پر لیٹی چھت کو تکے جا رہی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں کسی غیر مرئی نکتے پر مرکوز تھیں۔ اسے ہزار جان کے قبضے میں آئے ہوئے کئی دن بیت چکے تھے لیکن ابھی تک اسے کسی پل چین نہ آتا تھا حالانکہ عروس البلاد کے اس مرکزی محل میں اسے ہر طرح کا سامانِ تعیش میسر تھا۔ خوبصورت لباس، پر تکلف کھانے ہمہ وقت فراغت خدمت کے لیے درجنوں خادمائیں جو اس کے اِک ابرو جنبش پر ہر خدمت بجا لاتیں لیکن حسینہ کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ کہ جیسے کسی کبوتر کے پر کاٹ کر اس کے پنجرے کا دروازہ کھول دیا جائے۔ وہ بھی بظاہر آزاد تو تھی لیکن اپنے گھر والوں کے پاس تو نہ جا سکتی تھی۔ ہزار جان نے اس سے شادی کرنے کا اعلان کر رکھا تھا۔ لیکن ابھی تک اس بات پر عمل درآمد نہ ہوا تھا۔ پتہ نہیں ہزار جان کو کسی شبھ گھڑی کا انتظار تھا۔

☆......☆......☆

اور پھر یہ انتظار طویل ہوتا چلا گیا۔ حسینہ کو اس محل میں کسی شہزادی کی مانند رکھا گیا تھا۔ نیند سے بیدار ہوتے ہی اس کی ٹہل سیوا شروع ہو جاتی۔ گرم خوشبودار پانی سے غسل کروایا جاتا۔ قیمتی اور نفیس ترین ملبوسات پہنائے جاتے۔ مشاق مشاطہ کی

زیرِ نگرانی اس کا سولہ سنگھار کیا جاتا۔ بال بال موتی پرونے کے بعد پرتکلف ناشتہ نہایت ادب سے پیش کیا جاتا۔ ناشتہ کے بعد اسے محل کے باغ میں لے جایا جاتا جہاں درختوں کے ڈال ڈال جُھولے جُھلائے جاتے۔ اسی طرح دوپہر ہو جاتی تو اسے محل واپس لاکر کھانا کھلایا جاتا جس کے بعد وہ وہ سو جاتی۔ سہ پہر کو سفید گھوڑوں والی بگھی میں بٹھا کر اسے سیر کے لیے ایک دوسری سمت لے جایا جاتا۔ اس راستے پر پہلے پھولوں کی وادی آتی جہاں ہر طرف خوشبوئیں بکھری ہوتیں ابھی وہ اسی خوبصورتی میں کھبی ہوتی کہ اسے دور تک بل کھاتی اترتی چڑھتی بلند برف پوش چوٹیوں کی قطاریں دکھائی دیتیں اور دائیں بائیں ہلکے ہلکے گرتی ہوئی برف کے پھاہے قوس وقزح کے رنگ سجائے نظر آتے۔ وہ سوچتی یا اللہ یہ کون سی جگہ ہے جہاں مناظر خوبصورتیاں دھنک رنگ سجائے ہوئے سدا بہار ہیں۔ پھر اسے ایک جھیل دکھائی پڑتی۔ سفید براق جھاگ بیچوں بیچ تیرتے ہوئے راج ہنس۔ پروں کو جھاڑتی مرغابیاں اور غوطہ توڑ کر ابھرتی ہوئی سنہری مچھلیاں۔ کچھ دیر کے لیے حسینہ سب کچھ بھول جاتی اور موسم کی دلکشی سے لطف اندوز ہوتی۔ شام ڈھلے اسے ایک ایسے شہر میں لے جایا جاتا جہاں ہر طرف نسوانیت بکھری ہوتی تھی ہر جگہ خواتین ہی دکھائی دیتیں۔ پھر اسی شہر کے ایک خوبصورت محل میں اسے لے جایا جاتا جہاں رقص کی محفل لگی ہوتی۔ یہاں بھی اس کی آؤ بھگت مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے کی جاتی۔

رات گئے وہ سفید گھوڑوں والی بگھی میں واپسی کا سفر شروع کرتی۔ اب کے راستہ مختلف ہوتا۔ گھوڑوں کی رفتار برقی ہوتی۔ بگھی بے آواز ناہموار راستوں پر جیسے اُڑی اُڑی جاتی تھی۔ گھوڑوں کے سموں سے چنگاریاں پھوٹ رہی ہوتیں اور گھوڑوں کی گردنوں کے ریشمی سفید بال پراسرار انداز میں لہرا رہے ہوتے۔ اِک سفید دودھیا روشنی پوری بگھی کو اپنے ہالے کے جلو میں لیے رکھتی۔

پھر کالی رات کے اس سفر کے راستے میں ایک ایسا پہاڑ دکھائی دیتا جس کا دھانہ آگ کے شعلے اگل رہا ہوتا اور اس میں سے دل دوز چیخیں اور چنگھاڑیں سنائی دیتیں۔ اس پہاڑ کے پاس سے گزرتے ہوئے شدید حدّت محسوس ہونے لگتی جیسے اس کا جسم کسی

آگ میں جھونکا جا رہا ہو۔ باندیوں نے اسے بتایا تھا کہ ہزار جان چونکہ شاہ جنات ہے اس لیے شرارتی، غدار اور سرکش جنوں کو جو کہ معتوب ٹھہرتے ہیں انہیں ایک خاص قسم کے اُبلتے لاوہ جیسے پانی کے اس دہکتے پہاڑ کے دھانے سے اندر بطور تادیبی کارروائی پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ چیخیں انہی جنوں کی ہوتی ہیں۔ حسینہ اس پہاڑ کے قریب سے گزرتے وقت جھرجھری لے کر رہ جاتی۔ لیکن چند ہی لمحات کے بعد منظر پھر تبدیل ہو جاتا۔ اور اسے اپنی وہ حویلی دکھائی دیتی جو اس کی قیام گاہ تھی۔ باہر سے یہ اسے اپنی حویلی آشیانہ دکھائی پڑتی لیکن اندر سے قرونِ وسطیٰ کا پرتعیش محل تھی۔

دن بھر کی اس فراغت سے بھرپور مصروفیات کے بعد حسینہ اپنی مسہری پر چاروں شانے چت لیٹ جاتی۔ خادمائیں ضروریات کی چیزیں اس کی قریبی میز پر رکھ کر اطلس و کمخواب کے پردے برابر کر کے چلی جاتیں۔

☆......☆......☆

تھکاوٹ کے باوجود نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور ہوتی۔ مسہری پر لیٹنے کے بعد اس کو اپنا گھر اور گھر والے شدت سے یاد آنے لگتے۔ جانے ان پر کیا گزر رہی ہوگی۔ ابو، امی، دادی، شہریار اور عمران، اس کا مجازی خدا...... اسے شدت سے چاہنے والا شوہر وہ تو پاگل ہو گیا ہوگا۔ اسی دن تو ان کی شادی ہوئی تھی۔ سوچوں کے بھنور میں کبھی حسینہ کی آنکھیں آنسوؤں کی جل دھارا بن جاتیں اور پھر وہ ہچکیاں لینے لگتی اور جانے کب تلک روتی رہتی پھر خود ہی چپ ہو جاتی اور ٹکر ٹکر دیواروں کو تکتی رہتی۔ اس کے نیناں دیواروں یا چھت سے چپک جاتیں اور پھر کبھی کبھار سپاٹ دیوار یا چھت اسے سلور سکرین کا پردہ نظر آنے لگتی۔ جہاں بیتے دنوں کی خوشیاں کسی فلمی منظر کی مانند پردے پر تھرکنے لگتیں۔ معاً سب کچھ غائب ہو جاتا اور پردے پر ہزار جان کی ڈراؤنی جناتی شبیہہ اُبھر آتی اور حسینہ مارے ڈر کے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔ خوف کے بگولے اس کی آنکھوں کے سامنے محورقص ہو جاتے۔ اس کا چہرہ آنے والے وقت اور ہزار جان کی شرط کے خیال سے توری کے پھول کی طرح زرد ہو جاتا اور وہ آنکھیں بھینچ کر تکیے میں سر چھپا لیتی اور پھر خوابیدگی اس کی پلکوں کے راستے اس کے وجود میں اتر آتی اور وہ بتدریج نیند

کے جھولے میں ہلکورے لینے لگتی۔

☆......☆......☆

وسیع و عریض باغ میں چہارسو ہزار ہا اقسام کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اسی باغ کے ایک حصے میں ایک پیڑ کی ڈال پر بنے جھولے پر حسینہ جھول رہی تھی۔ اردگرد بے شمار باندیاں ادب سے سر جھکائے کھڑی تھیں۔ دو باندیاں اُسے جھولا جھلا رہی تھیں۔ جھولے میں رسیوں کی جگہ پھولوں کی بیلیں لگی تھیں۔ باندیاں کھلکھلا رہی تھیں۔ جبکہ حسینہ اپنی ہی سوچوں میں گم صم تھی۔ اس کا لباس اور اس کی سیاہ لانبی ریشمی زلفیں ہوا کے دوش پر لہرا رہی تھیں کہ اچانک سب باندیاں خاموش ہو گئیں۔ اچانک خاموشی چھائی تو حسینہ نے پلکوں کے شامیانے اٹھا کر دیکھا اور پھر نفرت سے ہونٹ سکیڑ لیے۔

کیونکہ کچھ ہی فاصلے پر سفید دھوئیں کا مرغولہ اسے دکھائی دے رہا تھا جو آہستگی سے ہلکورے لیتے ہوئے انسانی شکل میں تبدیل ہو رہا تھا۔ حسینہ اسے اب اچھی طرح جان چکی تھی۔ ہزار جان کی آمد کا یہی طریقہ تھا۔ باندیاں بھی جانتی تھیں اسی لیے سب نے اپنی اپنی جگہ ساکت و جامد ہو کر ہونٹوں پر چُپ کی مہر لگائی تھی۔ تاہم حسینہ بہ دستور جھولے لیتی رہی۔ اسے ہزار جان کا احترام کرنے کا کوئی شوق نہ تھا۔

اور پھر دھواں غائب ہونے لگا۔ اب ہزار جان دونوں ہاتھ کمر پر رکھے کھڑا تھا۔ اس کے مزاج برہم لگ رہے تھے۔ چند لمحے حسینہ کو گھورنے کے بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا حسینہ کے قریب آ پہنچا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی پینگ کو تھام لیا اور پھر اس کے حلق سے غراہٹ نکلی۔

''حسینہ تمہارا بھائی شہر یار اور خاوند عمران تمہیں تلاش کرتے کرتے عروس البلاد کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔''

''اچھا......کہاں ہیں وہ؟'' حسینہ کے دل کی کلی اچانک کِھل اُٹھی۔

''میری قید میں۔'' ہزار جان نخوت سے مسکرایا۔

ہزار جان کی بات سن کر لمحے بھر میں حسینہ کی مُسکان اُڑنچھو ہو گئی۔ غیر ارادی طور

پر وہ پینگ سے اُتر کر کھڑی ہو گئی۔

''کیوں قید کیا ہے تُو نے اُنہیں......کیا بگاڑا ہے اُنہوں نے تیرا؟''

''وہ خاک زادے میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ اور قید اس لیے کیا ہے کہ اب تجھ سے شادی کی بات منوانے میں مجھے آسانی ہوگی۔''

''چھوڑ دو ہزار جان میرے بھائی اور شوہر کو۔ مجھے منظور ہے میں تجھ سے شادی کرنے پر تیار ہوں۔ پر اللہ کا واسطہ ہے ان دونوں کا کچھ نہ کہنا۔''

''حسینہ اب فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں تیرے پیار میں تیری محبت میں تیرے عشق میں ان دونوں میں سے ایک کو زندہ جانے دوں گا اور ایک کو ضرور مار ڈالوں گا۔ لیکن اس کو جانے دوں گا جس کو تو کہے گی۔ بول بھائی اور خاوند دونوں میں سے ایک کے حق میں تجھے فیصلہ کرنا ہے۔''

ہزار جان کی بات سن کر حسینہ سکتے میں آ گئی۔ بے اختیار اس نے دایاں ہاتھ سینے پر رکھ لیا جس سے زیورات جھنجھنا اُٹھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے غزالی پیانے طغیانی کا منظر پیش کرنے لگے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی آبشار پھوٹ پڑی۔

ہزار جان کا موڈ آج درست نظر نہ آتا تھا۔ اس کی قہر آلود نگاہیں حسینہ کو مضروب کرنے لگیں۔

''اتنا ظلم نہ کر ہزار جان......'' حسینہ نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''جب مجھے تو نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے تو ان کو جانے دو ان کا کیا قصور ہے؟''

''کیا ان کا یہ قصور کم ہے کہ وہ ہزار جان کے عروس البلاد میں بغیر اجازت داخل ہوئے ہیں اور اس نیت سے آئے تھے کہ ہزار جان اپنی جان پلیٹ میں رکھ کر ان کو پیش کر دے گا لیکن وہ آدم زادے یہ نہیں جانتے کہ جنات کتنی طاقت ور شے ہیں۔ میں چاہوں تو دونوں کی گردنیں اتار دوں لیکن صرف اور صرف تیری محبت کی وجہ سے ان میں سے ایک کو چھوڑ دوں گا۔ البتہ دوسرے کو مرنا ضرور ہوگا اور یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے۔'' ہزار جان نے دوٹوک لہجے میں بات ختم کر دی۔

حسینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہزار جان کچھ لمحات ٹکٹکی باندھے حسینہ کو دیکھتا رہا۔ طنز اس کے چہرے اور ہونٹوں سے ہویدا تھا۔ پھر کرخت لہجے میں مخاطب ہوا۔ ''حسینہ کل تک مجھے جواب دے دو تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے ورنہ دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھوگی۔''

☆......☆......☆

اور پھر وہ منحوس دن آن پہنچا جب صبح ہی صبح اس کی خادماؤں نے نیند سے جگا کر اسے ہزار جان کا یہ پیغام دیا کہ ہزار جان نے اسے طلب کیا ہے اور پھر اسے ایک سجے سجائے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ہزار جان انسانی شکل میں کسی مغل شہزادے کے روپ میں ایک صوفے پر دھنسا اس کا منتظر تھا۔ حسینہ بھی شہزادی کے روپ میں نظر آ رہی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے ہولے ہولے قدم اٹھاتی اس کے قریب پہنچ گئی۔ ہر قدم پر اس کے بدن پر موجود زیوارت جل ترنگ بجا رہے تھے۔ لیکن حسینہ کا چہرہ سُتا ہوا تھا۔ حسینہ کو دیکھتے ہی ہزار جان مسکرا کر کھڑا ہو گیا اور اپنی باہیں یوں پھیلا لیں جیسے حسینہ کو آغوش میں لینے کے لیے مضطرب ہو لیکن حسینہ اس کے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے سامنے والے صوفے پر جا کر آہستگی سے ٹِک گئی۔

اس کی بے نیازی سے ہزار جان کا موڈ آف ہونے لگا۔ بے زاری اس کے بشرے سے ہویدا ہونے لگی

''حسینہ......'' وہ کھنگار کر گویا ہوا۔ ''میری اس طلسم نگری میں دنیا بھر سے چنیدہ حسن موجود ہے جو میری اِک ابرو جنبش پر تن من وارنے لگتی ہیں اور میں اگر چاہوں تو تجھے زبردستی بھی زیر کر سکتا ہوں لیکن تُو میرا پیار ہے، میری گلشار ہے، میں تیرے ساتھ دھوم دھام سے شادی کر کے تجھے اپنے دل اور سلطنت کی ملکہ بنانا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ ضد بازی چھوڑ دو۔ تمہارا بھائی اور شوہر میری قید میں ہیں۔ آج تجھے فیصلہ کرنا ہوگا ان دونوں میں سے کس کی رہائی اور کس کی موت چاہتی ہے؟ اور اگر تُو نے آج اور ابھی مجھے اس سوال کا جواب نہ دیا تو پھر دونوں کو عبرت ناک موت بھی ماروں گا اور تجھے بھی زبردستی اپنی غلام عورتوں میں شامل کر لوں گا۔''

یہ کہتے ہوئے ہزار جان کا لہجہ سفاکانہ اور چہرہ غرور کی آماجگاہ بن گیا۔

حسینہ نے بے چارگی سے کسی رعایت کی آس میں جب اس کی جانب دیکھا تو ہزار جان کی شعلہ بار نظروں کو اپنے چہرے پر مرتکز پایا۔ جس سے اس کی رہی سہی قوت بھی ڈانوا ڈول ہونے لگی......

''مم...... میں پہلے دونوں سے ملاقات کرنا چاہوں گی!'' حسینہ نے کمزور لہجے میں خواہش کا اظہار کر دیا جسے ہزار جان نے سختی سے مسترد کر دیا۔

''نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا...... ہاں البتہ میں تمہیں ان کی حالت دکھا سکتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ہزار جان نے سامنے کی دیوار کی طرف اپنے بائیں انگوٹھے سے اشارہ کیا تو سینما سکوپ سائز میں دیوار سینما کے پردے کی طرح روشن ہو گئی تو حسینہ نے دیکھا کہ عمران اور شہر یار نیچی چھت کی کسی تہہ خانہ نما جگہ میں ایک دوسرے سے جڑے بے سدھ سوئے ہوئے ہیں۔ میلی کچیلی حالت میں لباس کے چیتھڑے اُڑے ہوئے، لاغر جسم، دگرگوں صحت، بھوک اور پیاس ان کے چہرے سے نمایاں نظر آ رہی تھی۔ جس فرش پر وہ پڑے ہوئے تھے وہ بھی نمی اور کیچڑ سے آلودہ تھا۔ بھائی اور شوہر کو زندگی کی بدترین صورتحال سے دوچار دیکھ کر حسینہ کا دل بھر آیا۔ آنکھیں ساون بھادوں کا منظر پیش کرنے لگیں اور وہ پہلے سسکنے اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی لیکن اس وقت حیرت کا مجسمہ بن کر ساکت ہو گئی جب عمران اور شہر یار کو اس نے دیوار کی سکرین پر پہلے کسمساتے اور پھر اٹھ بیٹھتے دیکھا اور پھر اسے یوں لگا جیسے وہ دونوں اسی کی طرف متوجہ ہوں اور پھر وہ دونوں اسے آہستہ آہستہ اٹھ کر سکرین کے پاس آتے نظر آئے۔ یقیناً اس نے سوچا جیسے وہ انہیں اپنے سامنے سکرین پر دیکھ رہی ہے وہ بھی اسے اپنی کال کوٹھڑی کی سکرین پر دیکھ رہے تھے۔

حسینہ کے وجود میں اِک ہلچل اِک تھرتھراہٹ شروع ہو گئی اور وہ اضطراری طور پر اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر پردہ سکرین کے قریب جا پہنچی جہاں ان دونوں کے اب چہرے نظر آ رہے تھے اور وہ پوری طرح اس کی طرف ہمہ تن گوش تھے۔

''حسینہ......!'' عمران کے تڑخے ہوئے سوکھے ہونٹ تھرتھرائے۔

''میری بہن...... میری گڑیا......'' شہر یار بھی رونے لگا۔

’’بھیا......عمران‘‘ حسینہ دونوں ہتھیلیاں دیوار سے ٹکا کر رونے لگی۔

’’دونوں دیکھ لو یہ ہے ہزار جان جن جو مجھے میری حویلی آشیانہ سے یہاں اُٹھا کر لایا ہے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔تم دونوں اپنی جان کی بازی لگا کر یہاں تک آ پہنچے ہو لیکن اب اس کی قید میں ہو...... یہ تم دونوں کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن منتوں ترلوں کے بعد فقط اتنا رضا مند ہوا ہے کہ تم دونوں میں سے ایک کو چھوڑ دے گا، دونوں کے چھوڑنے پر یہ راضی نہیں۔‘‘

’’عمران کو چھوڑ دو ہزار جان۔‘‘ شہر یار چیخا۔

’’نہیں۔شہر یار کو آزاد کر دو مجھے پھانسی پر لٹکا دو۔‘‘ عمران چلایا۔

’’خاموش ہو جاؤ تم دونوں......‘‘ ہزار جان دھاڑا۔

’’ہاں تم بتاؤ حسینہ ان دونوں میں سے کسے چھوڑا جائے؟ جلدی کرو اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔نہیں تو دونوں کو میں قتل کر ڈالوں گا۔‘‘

اور پھر خاموشی چھا گئی۔عمران اور شہر یار گم صم کھڑے ہو گئے۔حسینہ دونوں کو باری باری دیکھنے لگی اور آہستہ آہستہ دیوار سے الٹے قدموں ہٹنے لگی۔وہ کبھی شہر یار کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتی اور کبھی عمران کو دیوانوں کی طرح دیکھنے لگتی اور پھر آخر کار اس نے عمران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔اس کے چہرے پر تغیر رونما ہونے لگا اور وہ بمشکل کہہ سکی

’’سس......سوری عمران۔‘‘ اور چہرہ ہاتھوں سے چھپا کر پلٹی اور دوڑتی ہوئی صوفے پر جا کر زار و قطار رونے لگی۔

اس کے سکرین کے سامنے ہٹتے ہی ہزار جان، عمران اور شہر یار کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

’’سنو انسان زادو...... آج تم میں سے ایک مگرمچھوں کی خوراک بن جائے گا اور دوسرا انسانوں میں واپس جا کر انہیں یہ بتائے گا کہ شہنشاہ جنات ہزار جان دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے ہاہاہاہا۔‘‘

عمران اور شہر یار نے مایوسی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر غیر ارادی

طور پر سکرین پر حسینہ کو دیکھنے لگے جو صوفے پر اوندھے منہ پڑی زور زور سے سسک رہی تھی۔اس کے قریب ہی ہزار جان کھڑا کینہ توز نظروں سے دونوں کو گھور رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہزار جان دُھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہونے لگا۔صرف حسینہ ان کی نظروں کے سامنے رہ گئی۔ ہزار جان غائب ہو چکا تھا۔اس کے ساتھ ہی روشن سکرین معدوم ہونے لگی حتیٰ کہ تاریک ہوگئی۔دونوں ایک بار پھر اس سیلن زدہ تاریک و تنگ تہہ خانے میں بے یار و مددگار رہ گئے۔دونوں کچھ دیر بے چارگی سے ایک دوجے کو دیکھتے رہے اور پھر وارفتگی سے لپٹ گئے۔شہریار رونے لگا۔

''نہیں عمران میں تجھے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ بلکہ کس منہ سے جاؤں گا۔مونا کو کیا منہ دکھاؤں گا کہ اس کے بھائی کو موت کے چنگل میں اکیلا چھوڑ آیا ہوں۔نہیں نہیں یہ مجھ سے نہیں ہوسکے گا عمران۔''

''نہیں شہریار۔'' عمران مضبوط لہجے میں بولا۔''شاید قدرت کو یہی منظور ہے۔''

''ہوسکتا ہے میری موت اسی طرح لکھی ہو!!!'' ابھی عمران بول ہی رہا تھا کہ تہہ خانے میں گڑگڑاہٹ سی ہونے لگی اور تہہ خانہ لرزنے لگا۔

دونوں ابھی حیران ہونا شروع ہوئے ہی تھی کہ تہہ خانہ روشن ہونے لگا۔ یہ روشنی اس دھوئیں سے پھوٹ رہی تھی جو ایک ہیولے کی شکل میں ایک جگہ لہریں لے رہا تھا اور پھر روشن دھویں سے ایک شبیہ اُبھرنے لگی۔ دونوں چونک پڑے۔ یہ ہزار جان تھا۔اور پھر دونوں نے دیکھا کہ ہزار جان کمر پر ہاتھ رکھے دونوں کو سامنے کھڑا گھور رہا ہے۔

''سنو آدم زادو...... آج تمہاری کہانی ختم ہو جائے گی۔ آج شام تمہیں۔'' وہ عمران کی طرف اشارہ کر کے بولا۔''مگرمچھوں کے درمیان پھینک دیا جائے گا اور یہ منظر تم دونوں بہن بھائیوں کو بھی دکھایا جائے گا۔'' وہ شہریار کی طرف دیکھ کر بولا۔''اس کے بعد کل صبح تم میری طاقت کے ذریعے اپنے گھر پہنچ جاؤ گے۔'' ہزار جان نخوت بھرے لہجے میں ان سے مخاطب تھا۔

''لیکن یاد رکھنا شہریار!'' ہزار جان گرجا۔''اگر آئندہ تم نے حسینہ کی تلاش کا قصد

باندھا تو تم اور تمہارے پورے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار کر آشیانہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔" یہ کہہ کر ہزار جان نے تہہ خانے کی ایک دیوار کی جانب اپنے بائیں ہاتھ کو کیا تو اس کی انگلیوں کی پوروں سے شعلے نکلنے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دیوار میں خلا پیدا ہو گیا۔ اب وہاں ایک رستہ تھا۔

"آؤ میرے پیچھے۔ یہ کہہ کر وہ اعتماد سے آگے بڑھا۔ تو عمران اور شہریار دونوں کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی انجانی طاقت انہیں پیچھے سے دھکیل کر آگے بڑھنے پر مجبور کر رہی ہو۔ مجبوراً دونوں قدم بڑھاتے ہزار جان کی تقلید میں اس راستے میں داخل ہو گئے۔ چند قدم چلنے کے بعد انہیں اپنے عقب میں گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ دونوں پلٹے تو دیکھا کہ پیچھے دیوار برابر ہو چکی تھی۔ اب دونوں نے اپنے آپ کو ایک خوبصورت کمرے میں پایا۔ جس کی دوسری جانب پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا۔ اور پانی کے اس تالاب میں مگرمچھ ہی مگرمچھ تھے۔ درجنوں کی تعداد میں۔ عمران نے پلٹ کر دیکھا۔ ہزار جان جنگلے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"آج شام تک تم یہیں رہو گے۔ ابھی تمہیں بہترین کھانا ملے گا۔ کھانا کھا کر ان مگرمچھوں کو غور سے دیکھتے رہو کیوں کہ شام کو تمہیں ان کی خوراک بننا ہے۔ یہ مگرمچھ کئی دنوں سے بھوکے ہیں اور تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

چلو تمہیں ایک اندر کی بات بھی بتا دوں۔ وہ دیکھو تالاب کے اس پار اسی جیسا ایک اور کمرہ ہے۔" دونوں نے اضطراری طور پر دیکھا تو انہیں اپنے متوازی ایک اور کمرہ نظر آ رہا تھا۔ دروازے کی جگہ سنہری چوکھاٹ لگی تھی۔ کمرے میں ایک چبوترے پر طاق رکھا تھا جس میں ایک چراغ روشن تھا۔ چراغ کی لو بالکل سیدھی تھی۔ کوئی لرزاہٹ یا کپکپاہٹ نہیں تھی۔

"اس چراغ کے شعلے میں میری جان ہے۔ چاہے کتنی بھی تیز ہوا چلے چاہے کوئی بھی جاندار، کوئی بھی جانور اسے بجھانا چاہے یہ نہیں بجھے گا۔ ہاں البتہ اگر کوئی انسان اس تک پہنچ کر اس کی لو کو پھونک مار دے تو یہ بجھ جائے گا اور تم دونوں پہلے انسان ہو جو اس جگہ تک پہنچے ہو لیکن تمہارے اور چراغ کے درمیان تیس فٹ چوڑا تالاب ہے جس میں کئی درجن ہٹے

کئے لیکن ایک ہفتے سے بھوکے مگرمچھ ہیں۔ اِدھر تم نے تالاب میں قدم رکھا اُدھر مگرمچھوں نے تمہاری تکہ بوٹی کر دینی ہے۔ سواب سوچو کہ کیا کرنا ہے۔"

"ہاہاہا...... ہوہوہو......" قہقہے لگاتا ہزار جان ہوا میں تحلیل ہوتے ہوتے غائب ہو گیا۔

☆......☆......☆

وہ پانی کا ایک خوبصورت تالاب تھا جس کے بیچوں بیچ تالاب کے عین اوپر پانی سے صرف چند فٹ بلند دو معلق کمرے تھے جو کہ لوہے کے جنگلوں سے بنے تھے۔ ایک جس میں وہ خود کھڑے تھے دوسرا اس کے متوازی تیس فٹ کی دوری پر جس میں ایک چراغ جلتا نظر آ رہا تھا۔ درمیان میں درجنوں بھوکے مگرمچھ جو بار بار اپنا منہ پانی سے باہر نکال رہے تھے۔ دائیں سے آ کر بائیں طرف جاتا پانی سے بھرا یہ تالاب لمبائی کے معاملے میں ناقابلِ فہم تھا۔ کیونکہ دائیں بائیں کے اطراف تا حد نظر پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا۔ اور ایک خاص حد کے بعد دھندسی چھائی نظر آ رہی تھی اور دور دور تک مگرمچھ ہی مگرمچھ تھے۔

عمران اور شہریار پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس تالاب کو دیکھنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ ہزار جان نے جو چیلنج انہیں کیا ہے وہ معمولی نہیں ہے۔ وہ اس چراغ کو بجھانا چاہتے تھے جو ان سے تیس فٹ کے فاصلے پر ایک جگہ روشن تھا مگر یہ ناممکن تھا۔ چراغ کی لو بالکل سیدھی تھی۔ اس میں ذرا بھی کپکپاہٹ نہیں تھی۔ کیسی عجیب بات ہے اس دور میں بھی ایک ایسی کہانی سامنے آ رہی تھی جو دادی اماں کی سنائی ہوئی کہانیوں سے مختلف نہیں تھی۔ جن یا جادوگر کی جان کسی طوطے' مینا یا کبوتر میں ہوتی تھی۔ اس وقت بھی یہی منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ دادی اماں نے بھی کہیں نہ کہیں سے وہ کہانیاں سنی ہی ہوں گی۔ اگر وہ کہانی حقیقت نہ ہوتی تو کبھی دادی اماں کے کانوں تک نہ پہنچتی۔ چنانچہ دونوں ایک جگہ بیٹھ گئے۔ وہ مگرمچھوں کو دیکھتے رہے مگرمچھوں کو خوراک بے شک ملتی تھی لیکن شاید پیٹ بھر کر نہیں۔ وہ عموماً منہ کھولے نظر آئے تھے۔ جس جگہ یہ لوگ موجود تھے وہ ایسی تھی کہ مگرمچھ چڑھ کر نہیں آ سکتے تھے۔ ان کے سامنے ریلنگ تھی...... اور ریلنگ پانی کی سطح سے تین چار فٹ بلند تھی۔ دونوں کمرے لوہے کے چار چار پائپ نما ستونوں پر

کھڑے تھے۔

شہریار تو یہ دیکھ کر مایوس ہو گیا تھا کہ خوفناک مگرمچھوں کے اس تالاب میں داخل ہو کر دوسری طرف پہنچنا ناممکن ہے کوئی بھی ترکیب ایسی نہیں ہو سکتی تھی جس سے یہ عمل ہو سکے لیکن عمران شاید کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ کئی گھنٹے تک وہ لوگ اسی طرح بیٹھے ہوئے مگرمچھوں کا نظارہ کرتے رہے مگرمچھ کبھی کبھی پانی کی سطح پر ابھر آتے۔ معاً عمران کے دل میں کیا خیال آیا کہ اس نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور اسے گیند جیسا بنا کر تالاب میں پھینک دیا۔ اس نے دیکھا سارے مگرمچھ اوپر آ گئے ہیں اور اس کپڑے کے گیند کی جانب دوڑ رہے ہیں۔ عمران کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہو گئی۔ اس نے تھوڑی دیر کے بعد اسی طرح کوئی اور چیز نکالی اور اسے بھی تالاب میں پھینک دیا مگرمچھ پھر اوپر آ گئے۔ عمران ان کی نقل و حرکت کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور اس کے بعد اس نے شہریار سے کہا۔

''میرے دوست! مجھے تو ویسے ہی سزائے موت سنائی جا چکی ہے۔ چنانچہ میں ایک ایسا عمل کرنے جا رہا ہوں جس میں زندگی جانے کے امکانات زیادہ ہیں بچنے کے کم۔ اور اگر بچ گیا تو پھر سارے کام سیدھے ہو جائیں گے۔''

''یار تم کیا کر رہے ہو مجھے بتاؤ تو سہی؟''

''دیکھو اگر میں ان مگرمچھوں کے کام آ جاؤں تو تم گھر والوں کو بتا دینا سب کو میرا سلام دے دینا۔ چند گھنٹے بعد جو مگرمچھوں کی خوراک بننا ہے میں ابھی سے کیوں نہ ایک لڑائی کر کے رسک لے کر دیکھوں شاید بات بن جائے۔''

''عمران تم مجھے کیوں خوفزدہ کر رہے ہو؟''

''میں صحیح کہہ رہا ہوں۔'' عمران نے کہا اور وہ اپنی قمیض اتارنے لگا۔ اس نے قمیض کی آستینیں الگ کیں، دامن الگ کیے اور پھر اس کے چھوٹے چھوٹے گولے بنانے لگا۔ شہریار کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی عمران نے ان کپڑوں کے بہت سارے گولے بنائے۔ اور پھر شہریار کی شرٹ بھی اتروائی اور آہستہ آہستہ اسے کوئی بات بتانے لگا جسے سن کر شہریار کی نا اُمید آنکھوں میں موہوم سی چمک آئی اور وہ عمران

کے ساتھ مل کر شرٹ اور پھر بنیان کے چھوٹے چھوٹے گولے بنانے لگا۔ پھر عمران نے بڑی مہارت کے ساتھ ان گولوں کو ایک سیدھ میں پھینکنا شروع کر دیا۔ گولے پانی میں گرتے ہی مگرمچھوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ بارہ تیرہ مگرمچھ پانی کی سطح پر ابھر آئے اور ان گولوں کو پکڑنے لگے لیکن اس کے بعد عمران نے جو کیا وہ انتہائی جان لیوا تھا۔ وہ ریلنگ پر چڑھ گیا۔ کئی گولے اس کے ایک ہاتھ میں بھی پکڑے تھے۔ اچانک ہی اس نے ابھرتے ہوئے ایک مگرمچھ کے اوپر چھلانگ لگا دی۔ یہ مگرمچھ کنارے کے پاس ہی تھا اس کی پیٹھ پر قدم جما کر اس نے فوراً ہی دوسرے مگرمچھ پر پھر تیسرے اور پھر چوتھے پر چھلانگیں لگانا شروع کر دیں۔ اس طرح وہ مگرمچھوں کی پیٹھ پر پاؤں رکھتا ہوا پھرتی سے آگے بڑھ رہا تھا جبکہ شہریار کپڑے کے بقیہ گولے پوری قوت سے ایک ہی سیدھ میں پھینک رہا تھا۔ کپڑے کا ہر گولہ پہلے گولے سے آگے جا کر گرتا اور اس کے قریب کے مگرمچھ اسے کھانے کی کوئی شے سمجھ کر اس پر لپکتے اور پانی سے اُبھر آتے یوں پانی پر مگرمچھوں کا فرش سا بنتا جا رہا تھا اور عمران نے اس سے فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ برق رفتاری سے مگرمچھوں کی پیٹھ پر چھلانگیں لگا تا رہا ہاتھ میں پکڑے گولے اپنے سے آگے پانی میں پھینکنے شروع کر دیئے یوں اس سے آگے آگے مگرمچھ پانی پر اُبھرنے لگے اور عمران زِگ زیگ کے انداز میں کبھی ایک مگرمچھ کی پیٹھ پر پہنچ جاتا کبھی دوسرے کی پیٹھ پر۔ وہ مگرمچھوں کی خونخواریت سے آگاہ تھا اسی لیے وہ کسی بھی مگرمچھ کی پیٹھ پر لمحہ بھر سے زیادہ نہ رکتا۔ آخر کار وہ چراغ والے کمرے کے پاس پہنچ گیا اور ہاتھ میں پکڑا کپڑے کا آخری گولا پانی میں پھینکا جس سے کوئی ایک وقت میں دو تین مگرمچھ سطح آب پر اُبھرے تو عمران اس مگرمچھ کی پیٹھ پر چھلانگ لگا کر پہنچ گیا جو ریلنگ کے عین نیچے تھا۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر عمران نے ریلنگ کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور اُلٹی قلابازی لگا کر ریلنگ کے اندر جا گرا۔ اسی لمحے دو مگرمچھ سرعت سے لپکے اور ان کے منہ عین اس جگہ پہنچے جہاں ایک سیکنڈ قبل عمران کھڑا تھا اگر اس کے جسم کا کوئی حصہ کسی ایک مگرمچھ کی گرفت میں بھی آ جاتا تو کہانی ختم ہو جاتی۔ مگر عمران کامیاب ہو چکا تھا اور ایک نئی تاریخ مرتب کرنے جا رہا تھا۔ ادھر جب عمران نے آخری کنارے پر چھلانگ لگائی تو

شہریار کے حلق سے خوشی سے لبریز چیخ نکل گئی۔

عمران نے ایک لمحہ ضائع نہ کیا اور دوڑتا ہوا چراغ تک پہنچ گیا۔شہریار کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔اسے خوف تھا کہ کہیں کوئی آنہ جائے لیکن عمران کامیاب ہوگیا اس نے جلدی سے چراغ ہاتھ میں اٹھالیا۔

☆......☆......☆

ہزار جان کے جانے کے بعد حسینہ اپنے صوفے پر بیٹھی سسکتی روتی رہی اور اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہی تھی۔

''اے مسبب الاسباب عمران کو بچالے اور ہمیں اس ظالم کے چنگل سے نجات عطا فرما دے۔'' اچانک اسے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔سر اٹھایا تو یہ اس کی خادمہ تھی۔نگاہ دوڑائی تو اردگرد درجنوں خادماؤں کو سر جھکائے پایا۔وہ اس کو اٹھنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔مجبوراً وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور خراماں خراماں چل پڑی۔اور اپنی خواب گاہ میں پہنچ گئی۔جہاں ہزار جان پہلے سے موجود تھا۔اور آرام کرسی پر بیٹھا ہولے ہولے ہل رہا تھا۔

حسینہ کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔اور حسینہ کی طرف بڑھ کر اس کے شانے تھام کر کہنے لگا۔بند کرو اب یہ رونا دھونا اور چلو خادمائیں تجھے دلہن بنانے والی ہیں۔شام کو عمران کو مگرمچھوں کے حوالے کر کے سزائے موت دینے،شہریار کو آزاد کرنے اور ہماری شادی کی تقریبات ایک ساتھ ہوں گی۔

ہزار جان کی بات سن کر حسینہ متوحش نگاہوں سے اسے تکنے لگی۔چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ان میں مایوسی کی جگہ انتقام لہرانے لگا اور پھر......اس نے ایکدم ہزار جان کے چہرے پر تھوک دیا......اخ تھو......

''نہیں بننا مجھے دلہن وولہن نہیں کرنی میں نے تیرے ساتھ شادی وادی۔تم عمران کے قاتل ہو۔میری خوشیوں کے قاتل ہو۔'' حسینہ ہزار جان کو دوہتڑ مارنے لگی۔تو ہزار جان ہتھے سے اکھڑ گیا۔اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا انسانی وجود ایک جن کے روپ میں ڈھلنے لگا۔غصہ سے اس کا چہرہ بگڑنے لگا۔پھر اچانک اس کا بالوں بھرا

بھدا ہاتھ گھوما اور زوردار تھپڑ حسینہ کو پڑا تو وہ پٹخنیاں کھانے لگی۔ ہزار جان نے اسی پر بس نہ کیا اور حسینہ کے لمبے بالوں کو اپنی مٹھی پر لپیٹ لیا ایک ہی جھٹکے سے حسینہ کے پاؤں زمین سے اُٹھ گئے۔ اور پھر ہزار جان جن اسے بالوں سے پکڑے پکڑے اپنے سر کے گرد چکر دینے لگا۔ حسینہ کی دلخراش چیخیں نکلنے لگیں۔ اچانک ہزار جان رک گیا۔ اس کے ہاتھ کی انگلیاں کھلنے لگیں۔ حسینہ دھڑام سے فرش پر آ گری اور بے ہوش ہوگئی لیکن ہزار جان کو اب حسینہ کہاں یاد تھی کیوں کہ عین اسی لمحے عمران کا ہاتھ چراغ پر پڑ چکا تھا۔ ہزار جان کو عمران کے ریلنگ پر چڑھتے ہی اس کی خبر ہوگئی لیکن ہزار جان اس قدر غصے میں تھا کہ لاشعور سے ابھرنے والی اس خبر کے شعور میں سماتے سماتے اسے ایک دو سیکنڈ لگ گئے۔ اسی اثناء میں عمران چراغ کو پھونک مار کر بجھا چکا تھا۔ ہزار جان نے دونوں ہاتھ اپنے گلے پر رکھ لیے کیوں کہ اس کی سانسیں رک چکی تھیں۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور وہ دھڑام سے کٹے ہوئے شہتیر کی مانند گر پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے محل کے دیوار و در سے کالے رنگ کا دھواں پھوٹ پڑا۔ فرش دیواروں اور چھت سے دھواں پانی کی پھواروں کی طرح نکلنے لگا۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ کان پھاڑ قسم کا شور شرابہ شروع ہوگیا۔ رونے اور سینہ کوبی کی آوازیں آنے لگیں جیسے سینکڑوں بھوت اور بھوتنیاں بین کررہی ہوں۔

☆......☆......☆

خاصی دیر یہی عالم یہی موسم رہا اور پھر آہستہ آہستہ منظر بدلنے لگا۔ اندھیرا چھٹنے لگا۔ روشنی کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ اور پھر پھک سے جیسے سب کچھ اڑ گیا ہو۔ اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ وہ سنہری محل، نہ خادمائیں، نہ سامان تعیش، ہر طرف نرم نرم برف کے اونی پھاہے گررہے تھے۔ ہلکی ہلکی برف باری ہورہی تھی۔ عمران، شہریار اور حسینہ بے سدھ برفیلی زمین پر بے ہوش پڑے تھے۔ موسم غیر معتدل ہونے اور شدید سردی سے شہریار کسمسایا اور پھر ہولے ہولے اُٹھ بیٹھا۔ چند لمحے استغراق کے عالم میں بیٹھا رہا۔ اس کا سر بھاری ہورہا تھا۔ پھر یکا یک اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ ہزار جان، پانی، مگرمچھ، چراغ، عمران اور پھر وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہوگیا۔ چاروں طرف گھوم کر دیکھا تو اپنے آپ کو ایک

برفانی علاقے میں پایا۔ اچانک ہی قریب اسے حسینہ اور عمران بھی چاروں شانے چت بے ہوش پڑے دکھائی دیئے۔ وہ جلدی سے حسینہ کی طرف بڑھا۔ لیکن پھر ٹھٹک کر رک گیا اور اسے نظرانداز کر کے عمران کے پاس پہنچا۔ اس کا سر اٹھا کر گود میں رکھا اور اس کے گال تھپتھپانے لگا۔ عمران بے سدھ رہا۔ تو اس نے اس کے گالوں پر زور زور سے تھپڑ مارے جس سے عمران نے آہستگی سے آنکھیں کھول دیں۔ قلیل لمحات تک خالی الذہن اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر سرعت سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسے سب کچھ یاد آ چکا تھا۔ وہ بغلگیر ہونے کے لیے شہریار کی طرف لپکا لیکن شہریار کو اب حسینہ کی فکر کھا رہی تھی۔ حسینہ کو دیکھ کر عمران بھی سب کچھ بھول کر شہریار کے ساتھ مل کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ جلد ہی حسینہ کو بھی ہوش آ گیا۔

تینوں اِک دوجے کو صحیح سلامت دیکھ کر لپٹ گئے۔

''حسینہ عمران نے ہزار جان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا ہے۔'' شہریار پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

''ہزار جان مر گیا......؟'' حسینہ بے یقینی سے چیخی۔

''ہاں......ظالم اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔'' ایک عجیب سی بھاری بھرکم آواز سن کر تینوں پلٹے تو بابر خان بزرگ کھڑے تھے۔ جنہیں صرف عمران ہی پہچان پایا۔ اور لپک کر ان کے پاس پہنچ گیا۔

''باباجی...... ہماری مدد کریں۔ ہم ہزار جان سے تو نجات پا چکے ہیں کہیں اس برفستان میں ٹھٹھر کر نہ مر جائیں۔''

عمران کی اس بات کے ساتھ ہی تینوں کا احساس ہوا کہ یہاں تو سخت سردی ہے۔ تاہم برف باری مسلسل ہونے کی وجہ سے ابھی انہیں شدید ٹھنڈک کا احساس نہ ہوا تھا۔ وہ سب اب بابر خان بزرگوار کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ وہ چاندی جیسی سفید ریش اور سفید بالوں کے ساتھ کمبل اوڑھے ایک لاٹھی کے سہارے کھڑے تھے۔

''میرے بچو۔'' بابر خان مخاطب ہوئے۔

''تم نے انسان ہو کر ایک جن کے مقابلے میں جبر و ستم جھیلنے، صبر کرنے اور

بہادری کی جو تاریخ رقم کی ہے اس کو مؤرخ سنہرے حروف میں تحریر کرے گا۔ میں بھی تمہارا احسان مند ہوں عمران کہ تمہارے وسیلہ سے میں بھی آج نئی زندگی پا چکا ہوں۔ وہ دیکھو اس طرف۔'' بابر خان نے شہادت کی انگلی سے ان کے عقبی سمت اشارہ کیا تو تینوں پلٹے اور انگشتِ بدنداں رہ گئے۔

سنہری حویلی کا عکس ابھرا ہوا تھا۔ وہی ان کی اپنی حویلی آشیانہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پوری حویلی دھوئیں سے بنی ہو۔ یا شاید پھر دھند سے لیکن یہ دُھواں یہ دھند سنہری تھے۔ دیکھو دیکھو عمران شہریار کا لہجہ پُر جوش ہو گیا......

''یہ...... یہ بالکل وہی منظر ہے جو ہم نے خواب میں دیکھا تھا...... چاروں طرف اونچے اونچے برفانی پہاڑ، یخ بستہ رواں چشمہ اور سنہری محل......''

''ہاں!'' عمران عرصے بعد مسکرایا۔ ''بالکل وہی منظر...... ہمارے خوابوں جیسا۔''

''لیکن......'' بابا بابر خان کی آواز آئی۔ ''یہ خواب نہیں بلکہ اس کی تعبیر ہے میرے بچو۔ اب تم تینوں اللہ کا نام لے کر اس حویلی کے دروازے سے اندر داخل ہو جاؤ۔''

''لیکن بابا سائیں...... یہ تو دھوئیں کے مرغولوں جیسی ہے۔ اس میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں؟''

''نہیں...... یہ مرغولے جیسی نہیں...... بس تم اس کے صدر دروازے سے اندر گھس جاؤ...... جلدی کرو اگر دیر کر دی تو پھر تمہیں ایک بہت لمبا تھکا دینے والا سفر کرنا پڑے گا۔''

بابر خان بابا کی سن کر تینوں بابا کو اللہ حافظ کہہ کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر آشیانہ حویلی کی شبیہ کی جانب چل پڑے۔ حویلی کا صدر دروازہ اب ان کے بالکل سامنے تھا۔ وہ اللہ کا نام لے کر دھند نما دروازے میں داخل ہو گئے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بادلوں کے حصار میں آ گئے ہوں۔ عمران نے پلٹ کر دیکھا تو اسے عقب میں سوائے دھند کے کچھ نظر نہ آیا۔ آگے بھی سوائے گہری دھند کے کچھ نہ تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان کے حواس معطل ہو رہے ہوں۔ تاہم وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے نپے تلے انداز سے قدم قدم بڑھتے رہے۔

اسی عالم میں کچھ وقت گزر گیا اور پھر دھند چھٹنے لگی۔ منظر صاف ہونے لگا۔ اب وہ ایک دوسرے کو صاف دیکھنے لگے۔ دھند تیزی سے چھٹ رہی تھی۔ اور پھر اچانک حسینہ خوشی سے چیخ پڑی۔

''ہم اپنے گھر آ گئے عمران...... اپنی حویلی میں......''

اب جو عمران اور شہریار نے غور سے دیکھا تو وہ اپنے آشیانہ میں اسی منحوس کمرے کے پاس کھڑے تھے...... جس سے اس ساری کہانی نے جنم لیا تھا۔ یہ دیکھ کر عمران اور شہریار وارفتگی سے بغلگیر ہو گئے اور خوشی سے ناچنے لگے اور پھر جیسے ہی انہیں ہوش آیا بچوں کی طرح شور مچاتے دوڑ پڑے۔

☆......☆......☆

نواب سراج الدین آرام کرسی پر نیم دراز اخبار کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ دادی اماں مصلیٰ بچھائے سر بہ سجود تھیں۔ جہاں آراء اور پروفیسر ناہید دھیمی آواز میں گفتگو کر رہی تھیں۔ مونا کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ ماحول پر مستقل سوگواری چھائی ہوئی تھی کہ اچانک شور شرابے اور چیخنے چلانے کے ساتھ بہت سارے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

سب ہڑبڑا اُٹھے۔ اس سے قبل کہ وہ لوگ سنبھلتے عمران، شہریار اور حسینہ ہنستے مسکراتے بھاگتے دوڑتے سب کے سامنے آ گئے۔ عین اسی لمحے مونا چائے کی ٹرے لے کر آ رہی تھی۔ تینوں کو اچانک سامنے پا کر سب کے سب حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے۔ حسینہ ماں کے سینے لگ گئی۔ شہریار نواب سراج الدین کے گھٹنوں سے لپٹ گیا۔ پروفیسر ناہید نے خوشی سے چیخ کر عمران کو گلے لگایا۔

اتنی دیر میں دادی اماں سلام پھیر کر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا کہ سب پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ خوشیاں یکا یک ہی چھم چھم برس پڑیں۔ ہر سمت قہقہے بکھرنے لگے۔

آن کی آن میں حویلی ہمسایوں اور بستی والوں سے بھر گئی۔ تینوں سب کو خاص خاص خبروں کا خلاصہ سنا رہے تھے۔ ایسے میں اچانک نواب سراج الدین نے ایک اعلان

کر دیا کہ بچوں نے شادی کی خوشیاں انجوائے نہیں کی تھیں لہٰذا اب رسمی طور پر مہندی، بارات اور ولیمہ کی تقریبات دوبارہ ہوں گی اور اس میں تمام رشتہ داروں اور بوہڑنگر کے تمام لوگ شریک ہوں گے۔ ان کے اس اعلان کے ساتھ ہی آشیانہ میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔

☆......☆......☆

حسینہ سیج پر دلہن کے روپ میں بیٹھی تھی کہ آہٹ اُبھری، دروازہ کھلا اور عمران دولہا کے روپ میں اندر آ گیا۔ سلام کے بعد وہ مسہری پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ جذبات کا ایک طوفان تھا جو امنڈا آتا تھا۔ دل میں ہزاروں ارمان مچل رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی دلہن کے جذبات و احساسات بھی اس سے مختلف نہیں ہوں گے۔ جذبات سے لرزتی آواز میں وہ اس سے رسمی باتیں کرنے لگا۔ مگر پھر باتیں کرتے کرتے وہ چونک پڑا کیونکہ حسینہ کی طرف سے کوئی ردعمل تھا اور نہ جواب۔

''حسینہ......!'' عمران نے اپنی دلہن کو آہستگی سے شانوں سے پکڑا ''تم بھی تو کچھ کہو جاناں!'' وہ دھیرے سے بولا۔ لیکن جواب ندارد...... عمران کے دل میں ہزاروں وسوسے سر اُٹھانے لگے۔

''حسینہ......'' اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں شہادت کی انگلی سے حسینہ کا چہرہ اُوپر کیا۔ دفعتاً اس کی اوپر کی سانسیں اوپر اور نیچے کی نیچی رہ گئیں۔ حسینہ کی خوبصورت آنکھیں عجیب خوف آگیں انداز میں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ نیچے والا ہونٹ ایک طرف لٹکا ہوا تھا۔

''حسینہ......میری جان! ہوش میں آؤ......'' وہ ہذیانی انداز میں چیخا۔

حسینہ کے ہونٹ ہلے اور آنکھیں اس نے عمران کے چہرے پر گاڑ دیں۔

''تُو کیا سمجھتا تھا کہ ہزار جان کو مار دیا۔ سن اے خاک زادے...... حسینہ کو چھوڑ دو ورنہ ہزار جان تیرا وہ حشر کرے گا کہ تیری روح بھی ہزاروں سال تک بلبلاتی رہے گی......''

عمران حسینہ کا روپ دیکھ کر گنگ ہو گیا۔ وہ تو سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ہزار جان جس کی کہانی ختم ہو چکی تھی ایک بار پھر نئے انداز میں سامنے آ جائے گا۔ وہ تراہ کر پیچھے ہٹا تو چھوٹی ٹیبل سے ٹکرا گیا۔ اور گرتے گرتے بچا۔ لمحہ بھر کو اس کا دھیان حسینہ سے ہٹ گیا۔ عین اسی لمحے اسے حسینہ کی نقرئی ہنسی سنائی دی۔

''ڈر گئے نا ڈارلنگ...... ہزار جان کا نام ہی کافی ہے......!''

حسینہ کی کھنکتی آواز سن کر عمران کو قدرے حوصلہ ہوا۔ اس نے حسینہ کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی شرارتی، مسکراتی ہوئی آنکھیں عمران پر ہی مرکوز تھیں۔ عمران اس کی شرارت سمجھ گیا۔

''ٹھہر جا تو......حسینہ کی بچی!'' وہ اس کی طرف لپکا۔

☆......☆......☆

Pakistanipoint Waqar Azeem